

چونکہ یہ دکان خفاک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

ڈ

April 2018

قیمت - 70 روپے



چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ
ڈائجسٹ
کراچی

جلد نمبر 19 شمارہ نمبر 7 اپریل 2018ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

منیجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت - 70/- روپے

سالانہ قیمت - 1200/- روپے



ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقی ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیکی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

دہشت سے بھرپور پراسرار کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ
خوفناک کہانیاں
کراچی

قیمت - 70/- روپے

نیا شمارہ شائع ہو گیا ہے۔

جس میں شامل ہے۔

ملک کے مشہور و معروف رائٹراں ایم۔ الیاس کی قسط وار کہانی ”پراسرار ہمزاد“ اور ایم اے راحت کی قسط وار کہانی ”کنارہ“ اس کے علاوہ سچ پر مبنی خوفناک، دہشت ناک، لمحہ دل کی دھڑکنیں تیز کرتی کہانیاں۔ آپ کے مسائل اور ان کا حل۔ رنگ و دھنک۔ پراسرار دنیا۔ کھٹی میٹھی باتیں۔ اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

ابھی اپنے کسی بھی قریبی بک اسٹال یا باکرسے نام لے کر طلب فرمائیں۔

اپنی قیمتی رائے ہمیں ضرور ارسال کریں۔

ماہنامہ خوفناک کہانیاں

نورانی آرکیڈ۔ رتن تلاء نمبر 3، کراچی

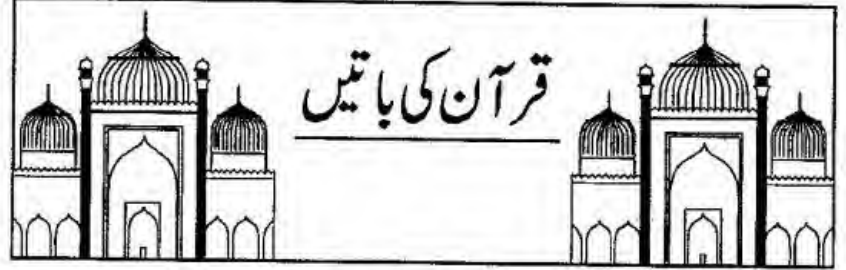
Email: Khofnakkahaniya@gmail.com

PH: 32744391-32711915

136	مہر پر دیز احمد	حقیقت کے پالنا میں جھوٹی ہوئی اپنی نویت کی لرزا دینے والی دل گرفتہ کہانی
145	نسرین رانا	ہاتھ کو ہاتھ بٹھائی نہ دینے والے رات کے گنا لوپ اندھیرے کے خیمے لپنے والی وحشت ناک کہانی
155	گلاب خان سولگی	خوف کے آفت پر دوں دواں عجیب و غریب دل گرفتہ دل شکستہ اور دل فریفتہ کہانی
160	محمد خالد شاہان	مردوں پر محیط سوچ کے آفت پر چمکاؤتی گنا لوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی
181	ملک فرخ ندیم	خوف کے قہقہے میں بکڑی ہوئی عجیب و غریب اپنی نویت کی دلچسپ کہانی
184	شانزہ اعوان	ایک ایسی کہانی..... جو کہ پڑھنے والوں کو کسی کوٹ بھی یکن سے تر رہنے دے گی
189	مریم فاطمہ	ہلے اور انتقام کی..... لرزہ بر اندام کرتی لوپ اندھیرے کے کباہے میں لپٹی کہانی
197	ادارہ	قارئین کے پیچھے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....
202	شہزاد خان	دل دہلائی ہوش اڑاتی رنگوں میں لہو نمک کرتی تیرا گنیز اور حیرت ناک کہانی
سفاک کون		
شہر خوشاں		
گناہ اسٹیشن		
اسرار		
خونخوار بلی		
بے چین روح		
طوفانی رات		
قوس قزح		
ویران مندر		

18	احسان الحق	انگشت بدعنوان کر دینے والی..... کہنے مثنی رائے کے قلم کی..... شاہکار حقیقت
29	فاطمہ خان	جسم و جاں میں خوف کی لہر دوڑاتی اور آنکھوں کو پتھر دینے والی وحشت ناک دو دو
33	ایس امتیاز احمد	ایک حقیقی کہانی جس میں پڑھنے والوں کے لئے خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ شوق بھی ہے
40	محمد قاسم رحمان	کیا یہ حقیقت ہے کہ عشق و محبت میں پڑ کر انسان کہیں کا نہیں رہتا، عشق آموذ کہانی
54	راشد نذیر طاہر	ایک نادرہ اور پر اسرار ہستی کی ہولناک دو دو دوں کی دھڑکنیں تیز کرنے والا سلسلہ
83	محمد رضوان قیوم	دل دہلائی اور جسم و جان پر لرزا طاری کرتی خوف ناک وحشت ناک لرزہ لرزہ کہانی
95	نینا خان	کیا عقیدہ لوگوں کا کہنا ٹھیک ہے کہ بیا کر ویکہ بہال کر لیں حقیقت کہانی میں پڑیں ہے
102	ملک فہیم ارشاد	حقیقت سے روشناس کتنی اپنی نویت کی عجیب و غریب دماغ سے نکلنے والی دو دو
131	طارق محمود	کبھی کبھی نا اہل لوگ اپنی نا اہلی دوسروں پر تحسب دیتے ہیں، کہانی پڑھ کر یہ کہیں
المیہ		
خونی نمبر		
پراسرار مخلوق		
محبتیں شمار کرنا		
جان لیوا		
خبیث روح		
نیا گھر		
اندھیرے سے اجالا		
اندھیرے کے مسافر		

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس ٹالیو روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔



مسند سندس اقبال راولپنڈی سے، مارچ ۲۰۱۸ء کا ڈراما انجسٹ سامنے ہے اور مکمل پڑھنے کے بعد کچھ الفاظ لکھ دی ہوں۔ زندگی کی مصروفیات ہیں کہ بدقسمتی جاتی ہیں، بچوں کا خیال رکھنا اور شوہر کے ساتھ ساتھ زندگی کے دیگر امور، پھر فرصت کے چند لمحات کے بعد ایک واحد ڈراما انجسٹ کا ساتھ۔ یہ سب میری زندگی کا حصہ ہیں۔ سرورق کماہانت خوبصورت اور ڈرامے کے معیار کے عین مطابق تھا لیکن ہر کہانیاں ڈرامے کے لئے کوئی یا قیہ کلی ڈراما انجسٹ بنانے میں معاون ہو سکتی ہیں وہ جان لیوا، ڈاک بنگلہ، شمشک، بہادر کون، دیوتا نگری تھیں۔ ان رائٹرز نے الفاظ کا جادو بکھرے ہوئے کہانی میں بھول نہیں دیا۔ بہت زبردست لکھا ہے۔ ایک مختلف طرز کی کہانی دولو صاحب نے پیش کی اور ہر کہانی میں ان کا انداز بالکل جدا گانہ ہوتا ہے۔ حقیقت پر مبنی اپنی تحریر لکھتے ہیں۔ گوان کا منظر اور زبردست انداز ہے اور دیکھا جائے تو کہانی میں ڈرامے اور ڈرامے والی تمام باتیں یکثرت لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ایسب حبیب خان صاحب کی یہ خطوط اور کہانیوں کی فہرست میں محسوس کرتی رہی وہ خطوط میں وہ نہ ہوں تو بزم کی رونق مانعہ لگتی ہے۔ اب اجازت دیجئے والسلام۔

☆ سندس صاحب: بقیہ لگاؤ سے لکھا ہوا نوازش نامہ پڑھ کر اچھا لگا، بہر حال سبکی زندگی ہے کہ کام اور کام میں مصروف رہنا اور احکام خداوندی کو بچا لانا، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے، اور آپ سمیت تمام اہل خانہ کو اور خوشیوں سے نوازے۔ کہانیوں کی پینڈی کی اور آئندہ بھی خط لکھنے کے لئے ڈیجروں شکر ہے۔

فلک زاہد لاہور سے، السلام علیکم، بہت دیر بعد حاضری دے رہی ہوں، امید ہے سب خیریت سے ہوں گے، سب سے پہلے تو میں اپنی غیر حاضری کی وجہ بتاتی ہوں کہ اپنے پیارے ڈرامے میری غیر حاضری کی وجہ کوئی مصروفیت نہیں تھی بلکہ اس کی وجہ میرا آپریشن تھا جو 22 نومبر کو ہوا۔ میرے سینے میں دو گولیاں تھیں جن کا اللہ کے فضل سے کامیاب آپریشن ہو چکا ہے اور اب اللہ کے کرم سے میں بہتر ہوں۔ آپریشن کے نام سے تو بڑے بڑے لوگ گھبرا جاتے ہیں، میری عمر تو پچاس سال ہے۔ آپ سب بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں میری کیا حالت ہوگئی ہوگی۔ سچ کہوں کی خود پر گزری تو صبح معتلوں میں پیدہ پلا کہ ”خوف“ کسے کہتے ہیں۔ اور نہ اب تک تو میں دوسروں کو ہی ڈراتی تھی۔ وقت کی سبکی عادت بہت اچھی ہے اچھا ہوا یا برا گزر رہی جاتا ہے۔ مجھ پر بھی آئی یا نہیں بچکی ہے اور اب انشاء اللہ ڈرامے باقاعدگی سے حاضری دیتی رہوں گی۔ آپریشن کے دنوں میں سارا سارا دن میں بستر پر لیٹی رہتی تھی کیونکہ چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ ایسے میں ڈرامے بہترین ساتھی تھا۔ جس کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتی رہی ہوں اور اپنے پیارے بہن بھائیوں کے محبت نامے بہت حوصلے دیتے تھے۔ ارسال کردہ کہانی میں نے شدید بیماری کی حالت میں بستر پر ہی لکھی ہے۔ لہذا کوئی کمی رہ گئی ہو تو درگزر کر دیجئے گا آئندہ اس سے بھی بہترین کہانی لانے کی کوشش کروں گی۔ آخر میں سب بہن بھائیوں کا شکریہ کہنا چاہوں گی جنہوں نے مجھے برابر براہ راست لکھنے میں یاد رکھا۔

☆ فلک صاحب: ارسال کردہ کہانی لکھی ہے اس کے لئے شکریہ، آپ کا آپریشن ہوا اس کے لئے عاری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا کرے اور ہمیشہ کے لئے آپ کی زندگی سے دکھ بیماریاں ختم کر دے، کہانی آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی۔

-Thanku

رابعہ آفرین لاہور سے، ڈرامے کے تمام اصناف بشمول قارئین السلام علیکم اسب سے پہلے تو میں ڈراما انجسٹ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ہر ماہ میری شاعری شائع کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا کہنا تھا کہ صرف پڑانے لوگوں کو لکھ دیتا ہے مگر مجھے یہ پیدہ چل گیا ہے کہ یہ راسے غلط ہے۔ آپ سب لوگ جنہیں لگتا ہے کہ صرف چاہنے والوں کو لکھ دیتا ہے، ان سے میری گزارش ہے کہ Look at me میرے خیال میں ڈرامیک وسیع پلیٹ فارم ہے جو معیار کو ترجیح دیتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ڈرامے والے تمام قارئین خود پر نظر ڈالیں تو ڈراما کو بہترین فریٹ لگے گا جو کہ سب کا خیال رکھتا ہے، کیوں کہ میں ایک ذمہ دہاں ہوں۔ جن لوگوں نے میری شاعری کو پسند کیا، میں ایک بار پھر ان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ کہتی ہوں۔ ڈراما انجسٹ ہر ماہ لکھتی ہوں مگر فی الحال ہمارے کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ امتحانات قریب ہیں۔ اس لئے ابھی پڑھا نہیں، بعد میں پڑھ کر تیرہ ضرور کروں گی، پکارا پاس الٹا خیال رکھئے گا۔ اللہ حافظ۔

☆ اور ہاں تم جو خرچ کر دے تو ان حاجت مندوں کے لئے جو اللہ کی راہ میں رکے بیٹھے ہیں۔ اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے اور مانگنے سے عار رکھتے ہیں، یہاں تک کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو فنی خیال کرتا ہے اور تم قیافے سے ان کو صاف پہچان لو کہ حاجت مند ہیں اور شرم کے سبب لوگوں سے منہ پھوڑ کر اور پلیٹ کر نہیں مانگ سکتے اور تم جو مال خرچ کر دے کچھ شک نہیں کہ اللہ اس کو جانتا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 273)

☆ اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔ (سورۃ ممتحنہ 93 آیت 10)

☆ اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر اور قائم رہنے والا ہے یعنی ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 36 سے 37)

☆ کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی گواہ کافی ہے وہی اپنے بندوں سے خبردار اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 96)

☆ پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو کے میں ہے بابرکت اور جہان کے لئے موجب ہدایت۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 96)

☆ اور جو لوگ اللہ سے عہد واثق کر کے اس کو توڑ ڈالتے اور جن رشتوں کے جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ان کو قطع کر دیتے اور ملک میں فساد کرتے ہیں ایسوں پر لعنت ہے اور ان کے لئے گھر بھی برا ہے۔ (سورۃ رعد 13 آیت 25)

☆ اور جو کچھ انہوں نے کیا ان کے اعمال ناموں میں مندرج ہے یعنی ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے۔ (سورۃ قمر 54 آیت 52 سے 53)

☆ جو لوگ تم میں سے اپنی عورتوں کو مال کہہ دیتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہو جاتیں ان کی مائیں تو وہی ہیں جن کے بطن سے وہ پیدا ہوئے بے شک وہ نامستول اور جھوٹی بات کہتے ہیں اور اللہ بڑا اسعاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ (سورۃ مجادلہ 58 آیت 2)

(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“، بنگلہ پبلشرز، بک انجینی کراچی)

☆ رابع صاحب: چلے حقیقت کا پتا تو آپ کو چل گیا کہ کچھ لوگ خواہ مخواہ ڈور کے متعلق باتیں بناتے ہیں خیر اب آئندہ ماہ ضرور تبصرہ ارسال کیجئے گا شکر ہے۔

مسز زینت خان روات سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب، امید ہے کہ تبصرہ ہوں گے۔ اللہ پاک ہم سب کی حفاظت فرمائے اور وطن عزیز پر برکتی ہاتھیں جو سب سے دشمن لگائے بیٹھے ہیں، انہیں منہ کی کھانی پڑے۔ خیر، مارچ کے ڈور نے کو تاتا نہیں دیا کہ زیادہ کہانیوں پر تبصرے کی کوبت آتی۔ لیکن سرورق نے بہت خوش کیا کہ یہ ادارے کی ٹیک نیچی سے کی گئی کوشش ہوتی ہے اور محنت بھی۔ سرورق بہت خوبصورت رنگوں کے ساتھ ڈور کی حقیقی عکاسی کر رہا ہے۔ بہت خوب۔ اب آتے ہیں کچھ ایسے لکھنے والوں کی جانب جو روز بروز اپنی محنت کے بل پر اپنی تحریر کے گراف میں بہتری پیدا کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ایس اے امتیاز احمد صاحب ہیں اور پھر اس مرتبہ ناصر محمود صاحب ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ دونوں تو راسخ و پختہ ہیں اور دونوں ہی اپنے وسیع مطالعہ کے سبب کہانی لکھنے ہوئے محنت سے کام لیتے ہیں۔ گھیل نیازی صاحبہ امیرے خیال میں Marvel Studios سے وابستہ Stan Lee کی فلموں سے لی گئی کہانی دیوتا نگری ایک دلچسپ اور اچھی کوشش ہے، ایسی کہانیوں کو لکھنا بھی ایک فن ہے جو آپ کے پاس ہے۔ شہزاد خان صاحب کی کہانی بھی شروع میں بہتر تھی لیکن آگے چلتی ہوئی نامعلوم کہاں لکل گئی۔ بیٹا خان صاحب محنت کر رہی ہیں لیکن "کالواکسی پلٹی جلتی کہانی ڈور میں ناگ بیٹا کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔" شیدے کی کرامت! ایک ایسی کہانی ہے جسے ایک طبعہ نوعیت کی کہانی قرار دیا جاسکتا ہے اور الفاظ کی خاصیت کے اعتبار سے یہ کہانی پورے وطن کو پرستی چاہئے۔ ڈائجسٹ کی پہلی کہانی بھی بہتر طرز کی تھی۔ میری نظر میں سب سے زیادہ اچھی کہانی لیوا ہے جو پڑھنے والے کی جان لینے پر تیار رہتی ہے، خیر امید ہے کہ احسان الحق صاحب کی صحت بہتر ہوگی ہوگی۔ آمین، ٹیک تمنا میں۔

☆ زینت صاحبہ: میرے خیال سے اب بہت سے راسخ و پختہ آپ کی باتوں پر عمل شروع کر رہا ہے، اور وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دوسروں کو سنتے ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام اہل خانہ کو خوشیوں سے نوازے، اور آپ اپنے چاہنے والوں میں خوشیاں بانٹیں۔ شکر ہے۔

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ڈور کی ہم اس کے راسخ و پختہ اور تمام پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے۔ مارچ کا شمار میرے ہاتھ میں ہے۔ قرآن کی باتیں سے ابتداء کی غلطی کی بزم میں کافی دوستوں کو کس کیا اور جو حاضر تھے ان میں میری مسز زینت خان اس کے بعد مسز فرحین حاد، احسان الحق، عبدالباری رومی، ڈاکٹر عامر شہزاد کے تبصرے جامع اور مفصل تھے جنہوں نے تمام لکھنے والوں کی بھرپور اعزاز میں تحریف و اصلاح دونوں کی، میں ڈور کے ایڈیٹر مسز زینت خان، بیٹا خان، احسان الحق، شاہد عظیم، میاں یاور حسین اور تمام اہل لوگوں کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میری مہم کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین) میں مسز زینت کی اس بات سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں کہ "والدین کی خدمت سعادت ہے بلکہ نصیب کی بات ہے۔" میرے نزدیک ماں جو جیساں کی مایہ ناز تخلیق ہے بلاشبہ میری متاع حیات ہے۔ اور میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ مجھے اپنی مائے خدمت کی سعادت نصیب ہے اور میں اس کو سعادت سے بڑھ کر مبارکباد کا درجہ دیتی ہوں۔ میری دعا ہے کہ میری مائے ردا سے شفقت ہمیشہ میرے سر پر رہے۔ (آمین) اب آتے ہیں مارچ کی تحریروں کی جانب جو جناب ڈور کی ابتداء اور اعتماد دونوں ہی بہترین طریقے سے ہوئی۔ اور ہاں راسخ و پختہ کی قلم کی خوبصورتی اس کی تحریر سے صاف ظاہر ہے۔ فلک زہد اور احسان الحق صاحب کی تحریروں کی کی محسوس ہو رہی ہے۔ احسان الحق صاحب کا شمار ان راسخ و پختہ میں ہوتا ہے جن کے بغیر ڈور اور ماہ ضرور محسوس ہوتا ہے۔ ان کی تحاریر خاص ترین کے ذمے سے آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے تاکہ آپ کے قلم سے لکھیں لازوال تحریروں آپ کے قلم کی تحسینی دور کریں۔ ڈور ترقی کے لئے دعا گو۔

☆ ایس حبیب صاحب: نئی ارسال کردہ کہانی اس ماہ شائع نہ ہو سکی اس کے لئے معذرت، آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ والدین سے بڑھ کر دنیا میں اور کچھ نہیں۔ وہ لوگ بد قسمت ہیں جو والدین کی خدمت نہیں کرتے اور والدین کی باتوں کو..... ہم آپ کی مہم کی صحت و تندرستی کے لئے دعا گو ہیں۔

خدیجہ فاطمہ اسلام آباد سے، السلام علیکم! اگلے ماہ ضرور تبصرہ ارسال کیجئے گا شکر ہے۔

شاہد اگلی مرتبہ ڈور میں حاضری نہ دے سکوں کیونکہ رسالہ پیچڑ کے بعد پڑھوں گی۔ اس لئے اگلے شمارے میں غیر حاضری پر ابھی سے معذرت خواہ ہوں۔ اس مرتبہ مارچ کے شمارے کا سرورق بہت زبردست تھا اور ادارے کی محنت واضح طور سے جھلک رہی تھی۔ غلطو میں ایس حبیب خان باقی نہیں، چونکہ انہوں نے اپنی اُمی جان کے متعلق پچھلے خط میں لکھا تھا تو دل سے دعا کی ہے کہ سب خیریت ہو، آمین۔ اس مرتبہ پڑھائی پر دھیان زیادہ رہا تو دو کہانیاں ہی پڑھ سکی ہوں ایک ڈاک بنگلہ اور دوسری جان لیوا۔ بہت زبردست لکھا ہے اور جان لیوا تو ایسی کہانی ہے کہ پھوڑے کو بھی ہی نہیں کرتا۔ باقی آئندہ سمجھیں، بہت شکر ہے، دعاؤں کی منتاج ہوں، والسلام۔

☆ خدیجہ صاحبہ: چلے آپ کی معذرت قبول کرتے ہیں کہ آپ مئی کے شمارے میں نظر نہیں آئیں گی، لیکن ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی دے اور امتحانات میں اچھے نمبروں سے کامیاب و کامران کرے۔ (آمین)

مسز فرحین حاد رحیم یار خان سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب، مارچ 2018 کا شمارہ زبردست ہے۔ سرورق دیکھ کر اعزاز اہو گیا کہ ادارہ اس جانب خاص توجہ کے ساتھ محنت کر رہا ہے، سرورق کمال کا نمونہ ہے۔ کہانیوں میں جان لیوا کا نمبر سب سے پہلے ہے کیونکہ یہ سلسلہ وار کہانی روح میں لینے والی اور قاری کو اپنے ساتھ چلانے والی کہانی ہے۔ اور ویسے ہر اچھی کہانی خود کہتی ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ اب ان شاء اللہ تیری قسط کا شدت سے انتظار ہے گا۔ دیگر کہانیوں میں ایس امتیاز احمد، ناصر محمود فراہ، گھیل نیازی، گلپ خان سولگی نے بھی انتہائی محنت سے لکھا ہے، البتہ گھیل نیازی صاحب کی کہانی کسی قلم کا خلاصہ تھی، شاید۔ Thor تانپ کی کسی کہانی کا۔ باقی بھی محنت کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ایک دن راسخ و پختہ میں متاثر نظر آئیں گے۔ اس مرتبہ غلطو میں اپنی فوری رائے میں ایس حبیب خان صاحب کی کی کو محسوس کرتی رہی۔ امید ہے کہ اپنی خیریت سے نوازیں گی، ان کی والدہ کے لئے دعا گو ہوں۔ اس مرتبہ کے لئے اتنا ہی۔ والسلام۔

☆ فرحین صاحبہ: آپ کی اور اپنے تمام چاہنے والوں کی خوشی کے لئے ایس حبیب صاحب نے اپنی کہانی بھیج دی ہے، جو کہ مئی کے شمارے میں ضرور ملے گا۔ اور ہاں آئندہ ماہ بھی خط لکھنا مت بھولے گا۔ Thanks۔

مریم فاطمہ کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈور کا پورا اظہار خیریت سے ہوگا۔ مارچ 2018 کا نمونہ اس بار بہت اچھا تھا۔ غلطو کی محنت میں مسز زینت خان نے میرا بہت حوصلہ بڑھایا بہت بہت شکر ہے، ڈور میں لکھنے والے راسخ و پختہ کی ادنیٰ فائزیشن سے ملنے والے اعزازات پر ڈھیر ساری مبارکباد۔ فروری میں مجھے بھی ایسی ادنیٰ فائزیشن کی طرف سے بہترین ادب تخلیق کرنے پر سند اعزاز شکیلیٹ بڈریج ڈاک گھر پر مل گیا تھا۔ بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ میں تقریب میں شریک تو نہ ہو سکی لیکن پھر بھی سائل ایڈو صاحب سے فون پر بات ضرور ہوئی تھی۔ جناب نے بڑی خوش اخلاقی سے بات کی، اچھا لگا، محسن عزیز صاحب کے لئے دل سے دعا گو ہوں۔ خدا آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ آمین! آمین!

☆ مریم صاحبہ: سائل ایڈو واقعی زندہ دل اور ادب سے لگاؤ رکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش و خرم رکھے، کہانی شامل اشاعت سے خوش ہو جائے، اور ہاں آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ضرور بھیجے گا۔

رشک نور نیل آباد سے، امید ہے کہ ڈور کا تمام اظہار، راسخ و پختہ اور قاریوں کی کرام اللہ پاک کے فضل و کرم سے ٹھیک ہوں گے۔ سب سے پہلے تو Thank you جب میں کالج سے واپس پر اپنے کمرے کی طرف گئی تو عا کی کانڈ میں پہلے کسی چیز کو اپنی اسٹری ٹیبل پر پلایا جو اٹھا تو میرا فحوت ڈرڈا بجھتا تھا، خوشی کے مارے میرے من سے بے اختیار نکلا، اتنی خوشی مجھے میرے فٹ ایئر کے رزلٹ آنے پر بھی نہ ہوئی تھی۔ متنا خوش ڈرڈا بجھت کو دیکھ کر ہوئی، Again Thank you، ڈور مجھے اس قدر پسند ہے کہ کیا بتاؤں۔ اس وقت میں بخار میں چمک رہی ہوں اور خط لکھ رہی ہوں ڈور کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو رہتی ہوں۔

☆ رشک نور صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے شکر ہے، ایک مشورہ ہے کہ کہانی کھ کر دوبار پڑھا کریں اور اس طرح صحیح بھی ہو جائیگا کہ کسی کہانی پر نظر کرنے کا کہہ کر قدر محنت کرنی پڑی۔ شکر ہے۔

فاطمہ خان علی پور مظفر گڑھ سے، السلام علیکم! مارچ کا شمارہ 22 فروری کو مل گیا۔ ٹائل بہت خوبصورت لگا۔ رنگوں سے بھرپور اور جاذب نظر اور کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اس شمارے میں اپنی کہانی کو نہ پا کر دکھ ہوا لیکن کوئی بات نہیں جناب میر کا چل چلنا ہوتا ہے، اگلی دفعہ ہی کسی کیجئے جناب ایک اور خوبصورت صورت تحریر لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ تحریر

میں کی میٹھی دور کر کے ڈر کی زینت بنا دیتے گا۔ بہت بہت شکریہ! ☆☆ مرحوم صاحب: چلنے اب کہانی شامل اشاعت ہے اور قوی امید ہے کہ دیر کے بغیر ایک اور کہانی لکھ کر ارسال کر دیں گی۔ Thanks

قاسم رحمان ہری پور سے، السلام علیکم امید ہے کہ ڈر کا سارا اٹاف خبریت سے ہوگا۔ مارچ کا شمار میں نے 3 مارچ کو خریدا۔ نئی قسط وار کہانیوں نے منتر بھی بہت کیا، اور خوش بھی کیا ویلڈن۔ ایڈیٹر صاحب میں کافی عرصے سے اپنی کہانیوں کے چھپنے کا انتظار کر رہا ہوں، میری کئی تحاریر آپ کے پاس ہیں، ہلنڈا نظر جانی کریں۔ مارچ کے شمارے میں اپنی کہانی نہ پا کر اتنا فاسوس ہوا کہ الفاظ میں بیان کرنے کی سکت نہیں۔ دو تین ماہ دور سے غیر حاضر کیا ہر آپ نے مجھے دودھ سے کھمی کی طرح نکال کر ہر چھینک دیا اور ہاں یہ بتا دیں کہ ”خوفناک کہانیاں“ کہاں سے ملے گا، ہری پور میں دستیاب نہیں ہے۔ اگلے ماہ ایک مفصل تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ میں خالد شاہان بھائی کو اور امین اے کاوش کو ایڈیٹر ملے پر مبارکباد دیتا ہوں، اللہ آپ کو ایسی ہزاروں کامیابی اور دکھائے۔ جب تک کے لئے اللہ حافظ۔

☆☆ قاسم صاحب: اب تو خوش ہیں ناں کہ ”محبتیں شمار کرنا“ شامل اشاعت ہے ہم کسی کو کھمی کی طرح دودھ سے نکالنے نہیں بلکہ دل سے لگا کر رکھتے ہیں۔ تبصرہ ارسال کرنا بھولے گا نہیں۔

احسان الحق، السلام علیکم محترم ایڈیٹر عزیز صاحبان، رانٹرز اور قارئین کرام! اللہ پاک آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ مارچ 2018ء کا ڈر ڈائجسٹ دیکھ کر دل انتہائی خوش ہے کہ مردورق بے حد متحرک ہے اور لکھنے والے تمام رانٹرز نے اس میں خوب اپنا حصہ ڈالا ہے۔ کہانیوں میں ایسے امتیاز احمد صاحب، ناصر محمود صاحب، ملک جمیر احمد، رشک نور، نیا خان، گلاب خان سولنگی صاحب، ظکیل نیازی صاحب نے خوب خوب لکھا۔ ایڈیٹر صاحب نے نیا خان صاحب سے عاجزانہ درخواست ہے کہ واقعہ نگاری کی جگہ آپ کے قلم میں ایک کہانی کی کار کی خاصیت زیادہ پائی جاتی ہے، چاہے چھوٹی کہانیاں لکھیں لیکن واقعہ نگاری سے اپنے آپ کو علیحدہ کرتے ہوئے لکھیں اور کہانی کے انداز میں لکھیں۔ یہاں خاص طور پر میری درخواست کا ذاتی طور پر احسان مند ہوں اور کسی طور پر، عاجزی کے ساتھ شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنی کہانی لکھ کر ناچیز کے دل کو ایک ایسی راحت بخشی جس نے خیم البدل میں کوئی دوا دار نہیں ہو سکتی۔ آپ اپنی کہانی میں ہر ہر سطر پر بچ بولتے ہیں۔ آپ کی کہانی میں سب دن عزیز کا ایلیہ ہے اور بہت قابل توجہ ایلیہ ہے اور میں عاجزی سے کہتا ہوں کہ جب جب ڈر مجھ گاہ گاہ کے ہاتھ میں آیا تو مختصر کہانیوں میں سب سے پہلے میں نے فہرست میں آپ کے نام کی تلاش کی اور سب سے پہلی کہانی آپ کی ہی پڑی ہے اور جب جب (آپ کی کسی ذاتی مجبوری کی بنا پر) آپ کہانی نہ لکھ سکے ہوں تو میں آداس ضرور ہوتا ہوں۔ امید ہے کہ ڈر میں ہر ماہ ایک مختصر کہانی سہی، لیکن لکھیں گے لازماً، کیونکہ رانٹرز کے ذہن میں کم از کم ایک پلاٹ تو مینے بھر میں ضرور ہوتا ہے۔ اور ہاں ڈر ڈائجسٹ میں کی ہے تو دو بہترین رانٹرز کی کسی ہے۔ ایک ایس صاحب خان صاحب کی اور دوسرے فلک زاہد صاحب کی۔ یقیناً ڈر کے تمام احباب ان دونوں کو Miss کر رہے ہوں گے۔ اللہ کرے کہ ان کی جانب سے جلد کوئی دھماکہ خیز کہانیاں شامل اشاعت ہو جائیں۔ دونوں ڈر ڈائجسٹ کی تجھی ہوئی رانٹرز ہیں بلکہ میں تو قائل ہوں کہ خوف ڈر کے میدان میں ناپ کی رانٹرز ہیں۔ آپ سب کا شکریہ۔ اب اجازت دیجئے، والسلام و خیر اعلیٰ۔

☆☆ احسان صاحب: یہ حقیقت ہے کہ دو صاحب قلمی لگاؤ سے کہانی نہیں بلکہ معاشرتی حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں، لیجئے ایس صاحب اور فلک صاحب کی کہانی اگلے ماہ ضرور شامل اشاعت ہوں گی۔ میں خود بھی ان دونوں رانٹرز کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے کہانی ارسال کر کے خوشی فراہم کی۔ Thanks

شاہد عظیم راولپنڈی سے، السلام علیکم محترم ایڈیٹر ڈر ڈائجسٹ ایڈیٹر۔ مارچ کے مہینے کا ڈر چھ ماہ سب سے پہلے مردورق کے متعلق عرض ہے کہ بہت خوب، محنت اور جان فشانی کے ساتھ بنایا گیا ہے، دل خوش ہو گیا۔ امید بندگی کہ کہانیاں بھی ڈر کے سین مطابق ہوں گی۔ جان لیوانے دل خوش کیا۔ ڈاک بنگلہ بھی معیاری کہانی تھی۔ گلاب خان سولنگی صاحب نے بھی اس مرحلے پر خوب کہانی لکھی۔ پر دین احمد دلو صاحب نے دراصل ملک کے حالات کا تذکرہ کیا ہے اور تمام باتیں ڈر دینے والی ہیں۔ بے شک ایسے ملک ہر وقت بہت سے خطرات میں ڈوبے ہوئے ہیں جہاں ایسی باتیں ہورہی ہوں جیسا کہ دو صاحب نے سادہ الفاظ میں پیش کی ہیں۔

اللہ بچائے سب کو! ایس امتیاز احمد نے بھی ہمیشہ کی مانند بہترین لکھا۔ بہر حال عمومی طور پر ڈر میں اس مرحلے کہانیاں بھی پسند آتی ہیں۔ امید ہے کہ باقی صفحات و جوائن بھی محنت کرتے رہیں گے۔ فلک زاہد صاحب کافی عرصے سے ڈر ڈائجسٹ میں نہیں لکھ رہے ہیں، برائے مہربانی ان تک عاجز کا پیغام پہنچا دیں کہ کوئی ایک آدھا لکھی ہی کہانی لکھ دیں، شکریہ۔ باقی آئندہ دعا گو۔ ☆☆ شاہد صاحب: فلک صاحب کی کہانی اگلے ماہ ضرور شامل ہوگی، ان کی نئی کہانی آگئی ہے۔ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔ Thanks

میان یاور حسین اسلام آباد سے، السلام علیکم انگل امیرے پیچھے زسر پر ہیں لیکن مارچ میں شامل ہونے والی صرف ایک کہانی پر کچھ لکھوں گا جو جان لیوا کے عنوان سے انگل راشنڈیز برطانیہ کی بہترین پیشکش ہے، دوسری قسط بھی خوب رہی، اب دیکھتے ہیں کہ تیسری قسط میں کیا ہوگا۔ ڈر ڈائجسٹ کا مردورق بہت زیادہ زبردست بنایا گیا ہے اور ڈر ڈائجسٹ کی قلم کو داد دیتا ہوں کہ محنت سے مردورق کو ترتیب دیتے ہیں۔ اللہ ڈر ڈائجسٹ سے وابستہ ہر ایک کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اس مرحلے پر ایس صاحب خان کا تبصرہ نہیں تھا جو کہ ڈر کی جان ہوتا ہے، آئی زینت خان کی باتیں بہت غور طلب ہوتی ہیں، میں ان کی باتوں سے رہنمائی لے رہا ہوں، شاید کسی ایک دن کوئی ایک کہانی لکھ سکوں، والسلام۔

☆☆ یاور صاحب: جو لوگ دوسروں کی باتوں پر غور کرتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں، آپ آئی زینت کی باتوں پر غور کیا کریں، ایک دن یقیناً کہانی لکھ سکیں گے، لیکن تبصرہ اگلے ماہ بھی بھیجے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، خلوص تہنیت، خدا کرے آپ سب خبریت سے ہوں۔ ماہ رواں کا خوب صورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ دلچسپ ناٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ کہانی اور غزلوں کا انتخاب لا جواب رہا! Dar کے پلیٹ فارم پر کافی خوب صورت لکھنے والے جمع ہو رہے ہیں اور Dar کے خوفناک سفر پر ساتھ چلنے کو تیار ہیں! ”ڈر ایکسپریس“ اپنی تمام تر خوفناکیوں کے ساتھ پلس کی پرخطر راستوں پر رواں دواں ہے اور ہم اور آپ سب اس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جس کی کوئی منزل نہیں۔ کوئی انشیں نہیں۔؟؟؟ دعا ہے کہ ”ڈر ایکسپریس“ کا سفر بھی جاری رہے۔

☆☆ امتیاز صاحب: کم لکھا مگر کچھ تو بہت کچھ لکھا، اللہ تعالیٰ آپ کو اور بھی زور قلم عطا کرے، تاکہ اپنے چاہنے والوں کے لئے اچھی کہانیاں لکھ سکیں اور عمل تبصرہ بھی، کیوں تک ہے ناں۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے، مبارک آغاز بسم اللہ انجام خدا جانے، قوس قزح سمیت 18 کہانیوں کا گلدستہ ڈر کی صورت میں حاضر نظر ہے۔ ظلیل جبار کو ڈر میں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے، شہزادہ عابد عزیب عباسی اور ظلیل جبار کی کہانیوں میں معطر کشی بہت کم ہوتی ہے۔ شہباز احمد کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ محسن عزیز حکیم کی صحت یابی کے لئے دعا گو ہوں، گلاب خان سولنگی، اللہ آپ کی پریشانی دور فرمائے۔ ڈر میں کسی ساتھی کو پریشان دیکھنا ہوں تو دل دہی ہو جاتا ہے، کیوں کہ میں بھی خوشی کو ترستا ہوں۔ والسلام۔

☆☆ شرف الدین صاحب: آپ کی تحریر کردہ باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں آپ کا دل دہی ہو جاتا ہوگا۔ کسی ساتھی کی پریشانی دیکھ کر، بس جی ہم تو کسی کے لئے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی صحت و تندرستی دے اور خوشیوں سے نوازے۔ آمین۔

طارق محمود کامرواٹنگ سے، السلام علیکم! 25 فروری کی گرم دوپہر میں اپنا پیارہ ڈر ڈاک کی طرف سے ملا، صبح میں بہت ہی خوش ہوئی، ناٹل کی جین کو دیکھ کر گلش اسٹائل سے کبرارے نینوں سے جانے کے دیکر بھی تھی۔ اس کے سامنے ہی شاید موت کا کنواں تھا جس میں سے تین انوکھی حقوق ایک مردہ کو نکال کر لارہی تھیں لیکن اس کرل کا وہ بیان جانے کدھر تھا۔ ”قرآن کی باتیں“ سب کے لئے مفصل راہ ہیں۔ خلوط کی مغل ایک بہترین سلسلہ ہوتا ہے۔ جس میں کسی کے لئے تعریف کے جانے کون کون سے کلاپے ملاتے رہتے ہیں اور کسی کو کیکر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چلیں پسند اپنی اپنی، اس دفعہ کچھ ماہ بعد ضرور ہم دود صاحب ڈر ڈائجسٹ میں کہانی کے ساتھ نظر آئے، اسے ماہ بعد ایک بہترین کہانی لے کر آئے، بڑھ کر کچھ میں محفوظ ہوئے۔ ”پراسرار ہوٹل“ چھوٹی سی اچھی کہانی تھی۔ ہوٹل کی پراسراریت کے تینوں دوست شکار ہو گئے۔ ”کرناک انجام“ سب سے آواز کہانی تھی۔ ”جان لیوا“ راشنڈیز برطانیہ صاحب بہت ہی اچھے دیکھے اعزاز سے کہانی کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اسٹوری بہت ہی اچھی ہے۔ مکمل قسط بڑھے بغیر رہا نہیں جاتا۔ ”موت سے

چھکارہ، انہی تحریریں کی کہانی کا لکھنے کا اسٹائل اور پلاٹ بہت ہی اچھا تھا۔ باقی کہانیاں بھی ڈر کے لحاظ سے بہترین تھیں۔ ڈر ہر رات نثر کی کہانی کو مہرے پر پٹے سے پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے شکر ہے۔

☆ طارق صاحب: دراصل ادارہ ڈرڈائجسٹ اپنے تمام راسخوں اور قاریوں کو کوئی طور پر چاہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نئے راسخوں کی کہانیاں بھی مستند اور کوشش کرتا ہے اور اس طرح بہت کم ہر میں سے ایک لکھنے والا راسخ بن جاتا ہے۔ کیوں نہیں لکھتا ہے۔

عبد العزیز بلوچ کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کا پورا اسٹاف سارے لکھاری و قارئین حضرات خیریت سے ہوں گے۔ ماہ مارچ کا شمارہ 22 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق پسند آیا۔ خطوط میں تمام دوستوں کے خطوط خوب ہیں۔ کہانیوں کی فہرست میں تمام کہانیاں پسند آئیں۔ خاص طور پر کالی ماکا بچاری، کربناک انجام، پراسرار ہوٹل، اس باری کی بہترین کہانیاں تھیں، اس بار میں ایک کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے اصلاح کر کے بعد شائع کر کے شکر یہ کاموق دیں گے۔ شکر یہ اللہ حافظ۔

☆ عبدالعزیز صاحب: مگر نہ کریں اصلاح کر کے کہانی شائع کر دی جائے گی۔ کہانیوں کی تعریف اور اگلے ماہ بھی تبصرہ ارسال کرنے کے لئے شکر یہ قبول کریں۔

ڈاکٹر عامر شہزاد رانا ننگا نہ صاحب سے، محترم ایڈیٹر صاحب، معزز راسخ اور قارئین السلام علیکم! مارچ کا شمارہ 22 تاریخ کا ارسال کرنے پر بہت بہت شکر ہے، ورنہ بازار سے تو بہت یث ملتا ہے۔ سرورق انتہائی خوب صورت اور ڈرڈائجسٹ کی پیش کی طرح قرآنی صفحہ پر پڑھ کر روح کو سکون ملا۔ ”خطوط“ میں مسز فرمین، مامہ، مسز زینت خان، مسز سندس اقبال، خدیجہ فاطمہ، فاطمہ علی خان، گریٹ نینا خان، مریم فاطمہ، مریم مرتضیٰ، ملک امین اے کاوش، محترم احسان الحق، خالد عباس، ہر طرز پر محمد حنیف شاہ کرا اور عبدالجبار رومی نے بہترین تبصرے لکھے۔ کہانیوں میں گریٹ نینا خان کی ”کالو“ نے تو دل خوش کر دیا۔ اسد اللہ بھٹی کی پراسرار ہوٹل ملک امین اے کاوش کی ”کربناک انجام“ شہزاد خان کی ”موت سے چھکارا“ ناصر محمودی ”یشک“ رشک نور کی ”سزائے موت“ محمد شعیب کی ”وہ ایک پلی“ محسن عزیز کی ”تکلیف ناک“ اور کلپل نیازی کی ”دیوتا مگر“ عمدہ اسٹوریز ثابت ہوئیں۔ محمد حنیف شاہ کربناک صاحب کا شامی میں بھی چھانگے۔ مہر ویز صاحب آپ بھی ننگا نہ صاحب تعریف لائیں میں آپ کو یہاں تک مذہب کے بانی گرونا تک صاحب کے جنم استھان اور مختلف گورو داروں کی سیر کرواؤں گا اور کچھ شیدوں سے بھی ملاؤں گا دینیے ”شیدے کی کرامت“ لا جواب کہانی ہے۔ غزل میں پروفیسر ڈاکٹر واجد، محمد اسلم جاوید، گریٹ نینا صاحبہ، فروغیہ، محمد حنیف شاہ، کائنات رشک، خالد عباس، رابعہ آفرین اور ایس اقبال احمد نے قابل تعریف فرمائیں لکھیں۔ خیر میری دعا ہے کہ پاکستان کا نمبر ون ڈائجسٹ ”ڈر“ مزید کامیابی سے بھلے، دعائے خیر ہے کہ ”ڈر“ ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔

☆ عامر شہزاد صاحب: دراصل میری بھی خواہش ہوتی ہے کہ میں ہر کسی کا خط پورے کا پورا شائع کر دوں مگر ہائے رے مجبوری، محدود صفحات کے برابر خواہش غمت کر رہ جاتی ہے۔ اشاء اللہ! پابھدار ہیں، سمجھ گئے ہوں۔ Thanks۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، بھٹی ہار آپ کو خط تحریر نہ کر سکا، معذرت خواہ ہوں، کام کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے شہر جانا نصیب نہ ہوا۔ سوچے ہوئے کا بی دن گزر گئے، پرچہ پریس میں جانے کی تیاری کے قریب تھا۔ چند دن رہ گئے۔ اس وجہ سے خط آپ کو نہ لکھ سکا کام زوروں پر ہے۔ وقت نہیں ملتا۔ شہر کا اسٹائل پر جانے کو آپ نے سابقہ روایات کے تحت دوئی کا حق ادا کر دیا ہے ابھی ابھی کام سے آیا ہوں اور یہ شخصی تحریر آپ کی نظر کر رہا ہوں ویسے میں پرچہ کا بہت پرانا قاری ہوں۔ اس کا اپنا ہی معیار ہے۔ اس کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں۔ نئے نئے قلم کاروں کو تحفہ کارنا آپ ہی کا کام ہے۔ مقررہ تاریخ پر ڈرڈائجسٹ کا بیڑی بے تابانی سے انتظار ہوتا ہے۔ موسم بھی آہستہ آہستہ تبدیل ہوا دکھائی دیتا ہے۔ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ خدا آپ کو اپنے نیک مقصد میں کامیابی سے ہمکنار کرے۔ ہر بار کہانیاں اور غزلیں خوب سے خوب تر ہوتی ہیں۔ قوس قزح کے اشعار بھی اچھے ہوتے ہیں۔ قرآن کی باتیں بھی اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے ہر مسلمان کو استفادہ کرنا چاہئے۔

☆ اسلم صاحب: دراصل زندگی مسلسل تک و دو کا نام ہے۔ اگر انسان احکام خداوندی پر عمل پیرا ہو جائے تو ساری مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ سارے عمل کا دار و مدار نیکیوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ (آمین)

خضر حیات روڈہ قتل سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کا سارا اسٹاف خیر خیریت سے ہوگا۔ مارچ کا شمارہ ایک خوبصورت اور دلکش ہائل کے ساتھ 25 فروری کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت ہی خوب صورت اور دلکش تھا۔ ٹائٹل ایک طرف اور شمارہ ایک طرف۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ بہت بہت زیورست تھا۔ سب کہانیاں بہت بہت زیورست، اچھی اور عمدہ تھیں۔ ویسے قوسب کہانیاں زیورست اور اچھی تھیں لیکن کچھ کہانیاں بہت بہت ہی زیورست تھیں۔ ان میں ”کربناک انجام“ ”جان لیو“ ”موت سے چھکارا“ شامل ہیں۔ باقی کہانیاں بھی سب سے عمدہ اور اچھی تھیں۔ قوس قزح میں گیا تو پورے شمارے کا مزہ ہی دو ہوا ہو گیا۔ پورے کا پورا قوس قزح زیورست تھا۔ اپنی غزل اور شعر و کلام کو خوشی 4 گنا پڑھ گئی۔

☆ خضر صاحب: خطا لکھنے اور کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجئے کے لئے شکر ہے بلکہ بہت بہت شکر یہ قبول کریں۔ **محب گل اداسی** ٹنڈوالہار سے، السلام علیکم! ڈر کے تمام اسٹاف اور تمام قارئین کے لئے پر خلوص دعا میں، مارچ کے شمارے کا ٹائٹل اپنی مثال آپ تھا، کئی ماہ سے ٹائٹل بہت زیورست آ رہے ہیں، تمام کی تمام کہانیاں قابل تعریف ہیں، لیکن پھر بھی چند کہانیاں جودل کو بھانگیں وہ ہیں، موت سے چھکارا، کربناک انجام، یشک، کاوشی شامی، شیدے کی کرامت اور دیوتا مگر، تمام راسخوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید ہے کہ تمام راسخ آئندہ بھی اچھی اچھی کہانیاں لکھ کر پڑھنے والوں کو خوش کریں گے۔ ڈر کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆ محب گل صاحب: بہت بہت شکر یہ کہ آپ نے کہانیوں کی تعریف کے لئے خط لکھا، تو پلیز آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کاشت سے انتظار رہے گا۔

محمد دانیال روڈہ قتل سے، السلام علیکم! میں ڈرڈائجسٹ کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری تحریروں کو شمارے میں جگہ دی، مجھے ویلکے کا اور حوصلہ افزائی کی۔ پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔ اب آتا ہوں شمارے کی طرف، مارچ کا شمارہ ایک حسین، خوب صورت سرورق کے ساتھ 23 فروری کو مل گیا۔ سرورق بہت بہت ہی خوب صورت تھا اور اس نے پورے شمارے کو آٹھ پانچ گنا کر دیا۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ بہت بہت زیورست تھا۔ شمارے میں شامل سب کہانیاں بہت زیورست، اچھی اور عمدہ تھیں۔ جب قوس قزح اپنی غزل اور شعر و کلام کو پائل ہو گیا خوشی سے مجھے تو اپنی آنکھوں پر بھی یقین نہ آیا۔ اب تک کے لئے انتہائی۔

☆ دانیال صاحب: ہم بھی آپ کی خوشی میں شامل ہیں اور یہ خوشی اس وقت تک رہے گی جب تک آپ ابھی ابھی تحریریں لکھتے رہیں گے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ سینئر ڈرڈائجسٹ پر ہیں اور تحریریں لکھتے رہیں کامیابی قدم چومے کی۔

محمد خالد عباس ننگا نہ صاحب سے، محترم ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! مارچ کے شمارے میں غزل اور خط شائع ہونے پر خوشی ہوئی، اس بار رسالہ بہت خوب صورت لگا، تمام راسخوں نے خوب اچھا لکھا، کہانیوں میں ”پراسرار ہوٹل“ ”کربناک انجام“ ”ڈاک بنگلہ“ ”سزائے موت“ نینا خان کی ”کالو“ ”بھادر کون“ ”شیدے کی کرامت“ ”دیوتا مگر“ رانا عامر شہزاد نے ”خونخاک رات“ نہایت اچھی کہانی لکھی، جسے پڑھ کر دل خوش ہو گیا، یہ واقعی بہت خونخاک، پراسرار اور ہیبت ناک کہانی ہے۔ ”کاوشی شامی“ میں محمد حنیف شاہ نے بھی خوب رنگ بھایا، واقعی شاہ کربناک صاحب بہترین ہار راسخ ہیں۔ امید ہے جلد ایک اور خونخاک کہانی کے ساتھ پیش ہوں گے۔ غزل میں ڈاکٹر واجد صاحب، محترم نینا خان صاحبہ، محمد حنیف شاہ صاحب، فروغیہ، کائنات صاحبہ، رابعہ آفرین اور رانا عامر شہزاد صاحب نے نہایت عمدہ غزلیں لکھیں، دعائے خیر ہے کہ ڈرڈائجسٹ ہمیشہ ترقی کی راہوں پر گامزن رہے۔ آمین۔

☆ خالد صاحب: خطا بھیجئے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ڈیروں شکر یہ قبول کریں اور ہاں اگلے ماہ بھی نوازش نامہ بھیجتا ہوں بھولنے کا۔

شہباز احمد ایبٹ آباد سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کے تمام لکھاری و قاری اور ادارے والے خیر خیریت سے ہوں گے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو پریشانیوں اور مصیبتوں سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ مارچ کے شمارے میں تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ کہانیوں میں احسان الحق صاحب کی کہانی کاشت سے انتظار ہے۔ کہانیوں کے علاوہ قوس قزح میں بھی ہر شاعر نے اچھا کلام پیش کیا۔ شاعری لکھنا نثر لکھنے سے مشکل ہوتا ہے۔ آخر میں سب کو پیار بھرا اسلام اور ایک بات کہنا ہوں گا ہر ماہ ڈر کا ٹائٹل مزید ہار بھولنے کا۔

☆☆☆ شہباز صاحب: آپ کی خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے ہماری کوشش ہوگی کہ نیشنل مزیدار ہو اور آپ خوش ہو جائیں۔

☆ ☆ مہر پروردہ صاحب: آپ کی کہانی بھی بڑھ کر دلی خوشی ہوئی، معاشرے کی حقیقت کو بیان کر کے آپ دل خوش کر دیتے ہیں اور کاش کہ ہم لوگ ان واقعات سے سبق حاصل کریں۔

☆☆☆ حنیف صاحب: بڑی کہانی لائن میں لگ گئی ہے پلیز! چھوٹی کہانی ارسال کریں، چھوٹی کہانیاں ہی بار بار شائع ہوتی ہیں۔ امید ہے بہت جواب ضرور دیں گے۔ Thanks۔

Dar Digest **16** April 2018

☆☆ شیر صاحب: خط لکھنے اور کہانوں کی تعریف کے لئے ویری ویری ٹھیکس، آئندہ وہ بھی خلوص نامہ بھیجتا ہوں لے کامت شکریہ۔

☆☆

Dar Digest 17 April 2018

کیا یہ خوفناک باتیں نہیں کہ ملک کی اصل انسانی دولت ضائع ہو رہی ہے اور یہ خوفناک بات ہی نہیں بلکہ انتہائی خطرناک بات بھی ہے، ہر ملک میں مثبت سوچ رکھنے والی قوم ہی نظام کو بدلتی ہے ناکہ اختلافی سوچ رکھنے والی قوم.....

انگشت بدعواں کر دینے والی..... کہنہ مشق رائٹر کے قلم کی..... شاہکار حقیقت

لئے بھی اور ہمارے لئے بھی وہ جملہ اُن کی وصیت سمجھتے ہوئے ہم نے اپنے پلے سے باندھ لیا تھا۔

اور وہ جملہ یہ تھا! ”محترم دوستو! آج سے آپ لوگ ڈاکٹر نہیں بنے بلکہ ڈاکٹر بننے کے لئے تیار ہونے ہیں۔“

بیزا غرق استیاس!۔۔۔ یہ پانچ سال! تو پھر یہ کس کھاتے میں گئے۔ نہ دن کا پتہ نہ رات کو چین۔ کیا ہم جھک مارتے رہے تھے؟

اُس وقت ہم سب کو یہی محسوس ہوا تھا۔ لیکن! ہمارے اُستاد نے بالکل تجربے کی بات کہی تھی۔ وہ ٹھیک تھے اور ہم غلط۔ انسان اپنی ابتدائی زندگی کے چالیس سال تک غلط ہی ہوتا ہے۔ یہ ہمیں بعد میں پتہ چلا۔

پھر امتحانات ہوئے۔ میری تیاری پوری تھی کیونکہ منزل کا تعین کر چکا تھا یعنی اگر مجھے بننا ہے تو ڈاکٹر ہی بننا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں بننا۔

پھر ایک دن ہمیں گھر آیا اور نہادھو کر جب کپڑے تبدیل کئے تو اباجان نے آواز لگا دی۔ ”بھیل الدین آیا کی نہیں؟“

”بھئی کپڑے تبدیل کر کے آتا ہے آپ کے پاس!“ یہ امی جانی میں۔

میں ایک ڈاکٹر ہوں اور میری عمر پچاس سال ہے۔ میں نے ”باقاعدہ“ M.B.B.S. کر رکھا ہے۔ باقاعدہ کا لفظ تو میں نے دانستہ استعمال کیا ہے ورنہ آپ بھی مقروض ہو سکتے ہیں کہ کیا ہر ڈاکٹر M.B.B.S. نہیں ہوتا؟

تو بچے جواب بھی حاضر ہے۔ کی نہیں! آج کل ہر ڈاکٹر کے پاس ایک عدد سوندھوتی ہے لیکن وہ M.B.B.S. نہیں ہوتا۔ اب آپ کہیں گے کہ کیوں جی؟ تو جواب یہ ہے کہ کتابیں پڑھ لینے سے انسان انجینئر، ڈاکٹر، اکاؤنٹنٹ اور مکینک نہیں بن جاتا۔ اس کے لئے لازم ہے کہ اس کا تجربہ دستِ پہنچ ہو۔ محبت کامل بھی تو کسی شے کا نام ہے کہ نہیں! اور یہ بھی تو یاد رکھیے کہ آج ہر استاد، منیجر یا پروفیسر ”کامل“ تو نہیں ہوتا نا۔۔۔ ورنہ ہم سب معاشرے میں ”گوہر نایاب“ کو کیوں تلاش کرتے؟

مجھے یاد ہے کہ M.B.B.S. کے آخری کلاس سیشن میں پروفیسر ڈاکٹر عبدکریم صاحب مرحوم نے ہماری کلاس سے مخاطب ہوتے ہوئے ایک جملہ کہا تھا۔ شاید وہ M.B.B.S. کے ہر آخری کلاس سیشن میں اُسے دہراتے آئے تھے۔ ہم سے پہلے والوں کے

”اس لڑکے کو تین دن قبل دیکھا تھا میں نے،
عالیہ! اور اب بھی کوئی خاص امید نہیں رکھتا۔“ ابا کے
انداز میں شکوہ تھا۔

”ابائیں! آ رہا ہوں، آپ ہی کے پاس؟“ میں
نے قدرے اونچی آواز سے کہا تھا کیونکہ وہ اس وقت
ڈرائنگ روم میں تھے۔ میں فوری ابا کے پاس چلا
گیا۔ سلام کے بعد ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔
”ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر کی کہاں تک پہنچی
آپ کی؟“

”پچھڑو دے دیئے ہیں، ابا۔ اب بس رزلٹ
کا انتظار ہے۔“

”کیا آپ سے انسید بہاراں رکھی جاسکتی ہے
یا.....؟“ ابا نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا تھا۔ ان کی
یہ بات سن کر دل تو چاہا کہ زوردار قہقہہ لگا دوں لیکن
ہمارا دور بزرگوں اور بڑوں کے احترام کا دور تھا۔ میں
نے سر جھکا کر جواب دیا تھا۔ ”ابا، آپ اور امی جان کی
دعاؤں کی بدولت میں نے پورے M.B.B.S.
میں نہیں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور یقیناً آپ کامیابی کی
نوید سنیں گے۔“

”اس کے بعد کیا کرنا ہے، میرا مطلب
ہاؤس چاہ کہاں کرو گے؟“ ابا نے فی البدیہہ سوال
پوچھ لیا۔

”ابا، میرا ارادہ تو۔۔۔“ اور میں نے ایک
بڑے اسپتال کا نام لے لیا کہ میں وہاں پریکٹس کرنا
چاہتا ہوں۔

”ہونہ، وہ ذات ایسا کرے! جیسا تم کہتے
ہو دیا ہی ہو!“ ابا نے اخبار ایک جانب سائڈ میز پر
رکھتے ہوئے پہلی مرتبہ سوچ میں ڈوبنے ڈوبے انداز
میں کہا تھا۔ اُن کا رویہ مجھے کچھ نہیں نہ آیا لیکن اُس
وقت میں نے یہ سوچا ضرور کہ انہیں کیا معلوم کہ
سرکاری اور نجی ہسپتالوں میں ڈاکٹر کی طلب کتنی ہوا
کرتی ہے اور یہ ہسپتال ہاتھوں ہاتھ ڈاکٹر کو لے لیا
کرتے ہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ابابھیرے ایک

سرکاری ملازم جو آغاز میں ایک نچلے درجے کے کلرک
تھے اور اب بیس سال بعد کہیں سولہویں درجے تک پہنچے
ہیں۔ اپنے زمانہ کے ایم اے (اردو)۔

اردو میں ماسٹرز! اردو۔۔۔ اور وہ بھی اس
مضمون میں دو سال کچا ڈالے میرے ابا نے۔ بھلا
اردو بھی کوئی مضمون ہے؟ یہ سب میں اُس وقت سوچ
رہا تھا۔ دن دو گندمی مجھورا

اردو تو ہمارے امی ابا ہمیں بچپن میں سکھا
دیتے ہیں۔ بھلا اس میں 730 دن ضائع کرنے کی کیا
ضرورت پڑی تھی اور اوپر سے نتیجے کا انتظار کیجیے، وہ
علیحدہ Fatigue! یعنی خوارگی۔ (یاد رہے کہ
یونیورسٹیوں کے ہاں پہلے سالہا سال اگر امتحانات کے
نتائج نہ بھی آتے تو بھی اُن کے سر پر جوں نہ رنگی تھی،
یہ تو اب تھوڑا بہت نظام سیدھا ہوا ہے اور وہ بھی عدلیہ
اور فوج کی دراندازی کی بدولت، معاف کیجئے گا!)

تو ایسی سوچیں اُس نوجوانی کے دور میں
اپنا ذہن سوچا کرتا۔ لیکن جب میں ہاؤس چاہ کے
لئے ایک کے بعد دوسرے ہسپتال در بدر ہوا تو مجھے اپنی
قدر و قیمت کا احساس ہو گیا۔

”یہ تم نے اپنے منہ پر جو کیوں بجا رکھے
ہیں۔“ خالده نے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں مجھے
”بوتل“ دیتے ہوئے کہا تھا۔

آپ لوگ غلط مت سمجھئے، اُس زمانے میں
مشروب لطف کو بوتل ہی کہا جاتا تھا۔ یا اسے مزید
واضح کر دوں۔۔۔ کہ جو مشروب، شیشے کی بوتل میں
قلمباز، بازار سے منگوا کر سرعام یا مخفی میں، ہر رشتہ دار
کے سامنے یا ان کے ساتھ بیٹھ کر پیا جاتا، اُسے عام
بول چال میں ”بوتل“ کہا جاتا۔ اور جو مشروب حرام
چھپ کر یا دوستوں کے ساتھ پیا جاتا اُسے
”بوتلی“ کہا جاتا۔ بہر حال! خالده نے مہمان نوازی
کے بطور ایک بوتل میرے سامنے میز پر رکھ دی تھی۔

خالده میری بہت اچھی دوست بھی رہی تھی۔ وہ
مجھ سے دو سال پیچھے کے Batch میں تھی۔ ایک

پوش علاقے میں رہتی کیونکہ اس کے والد ایک اچھے
خاصے کاروباری آدمی تھے۔ ان کی دو ٹیکشیاں
تھیں۔ تین مرثیوں کے فارم ہاؤس تھے۔ اُس دور کے
حساب سے اُس کے والدین آزاد خیال تھے اور حدود
کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی

اکلوتی بیٹی کو انہوں نے اجازت دے رکھی تھی
کہ مجھ جیسے شریف اور خاندانی لڑکے سے بات چیت
کی حد تک ملاقات کی جاسکتی ہے۔ دیگر یہ کہ گھر کے
وفا دار ملازمین اور دھڑا دھڑا سوسوں کی مانند بھٹکتے دکھائی
دیتے تھے جو کہ یقیناً خالده کے والد اور والدہ کی خاص
تاکید پر ہی ایسا کر رہے تھے۔ اب اُس دور میں
C.C.TV کیمرے تو نہیں تھے، یہی لوگ تھے۔

مجھے بھی کسی عشق یا ہوس کے ٹٹونے لات نہیں
ماری تھی، میں تو خود حالات اور نظام کا مارا
تھا۔ M.B.B.S. مکمل کرنے کے بعد ہاتھ کچھ نہیں
آ رہا تھا۔

”خالده! میں اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا
ہوں۔“

”مسئلہ کیا ہے؟“ اُس نے دونوں ہاتھوں
کی لمبیاں بنا کر اپنے رخساروں کے گرد جماتے
ہوئے کہا۔

میں نے ساری بات اُس کے گوش گزار کر
دی۔ ”اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے سال بڑھنے کے
بعد بھی میری وقعت ایک عام سے طالب علم جتنی ہی
ہے۔ کر دوں تو کیا کروں؟“

”.....! اگر تم کو تو میں ڈیڈی سے بات
کر دوں؟“ اُس نے منہ خفی انداز میں کہا۔ میں نے
اُس کی جانب ایک بار دیکھا ضرور لیکن مجھے اپنی ذات
میں ندامت سی محسوس ہوئی۔ ابا تو میرے بھی تھے۔
بھلا وہ اپنے ڈیڈی سے میرے متعلق کیوں بات کرتی،
میں اپنے ابا سے بھی مدد مانگ سکتا تھا۔

”اب کیا سوچ رہے ہو، جی؟“ اُس نے جیل
الدین سے مجھے جی بتادیا۔

”مجھے جی مت کہو، ایسا لگتا ہے جیسے اپنے پالتو
کتے کو پکار رہی ہو۔“ وہ میری بات پر زیر لب مگر انکی
اور دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، جمیل
الدین صاحب۔“ اس مرتبہ میرے مکمل نام کے ساتھ
اُس نے ”صاحب“ پر کچھ زیادہ ہی زور دیتے ہوئے
کہا تھا اور میں نے اُس کی جانب پر شکوہ انداز میں
دیکھا۔

”خالده، تم میرا مذاق اڑا رہی ہونا، کیونکہ میں
حالات کا مارا ہوا ہوں، ہے ناں؟“

”خیر، پھوڑو، بوتل پیا اور ٹھنڈے مزان سے
سوچ کر میرے سوال کا جواب ضرور دینا۔ ویسے ڈیڈی
تمہیں پسند کرتے ہیں۔ وہ میری بات کبھی رو نہیں
کریں گے۔“ اُس نے اپنے سامنے رکھی مشروب کی
بوتل کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے ڈیڈی کا احسان نہیں لینا
چاہتا۔“ میں نے اپنے دل کی بات اُس پر عیاں کر دی۔
”اس میں احسان والی کون سی بات ہے؟“

”احسان تو ہے!“ میں نے اپنی بات پر قائم
رہتے ہوئے کہا۔ لیکن اُس نے نفی میں سر ہلاتے
ہوئے کہا:

”احسان و حسان کچھ نہیں ہے، یہ تمہارا حق
ہے۔ اب سیدی انگلی سے تو کھی نہیں نکھاتا، تو انگلی
ٹیرھی کرنا پڑے گی۔“ اُس نے مجھے سمجھانے کے سے
انداز میں کہا شروع کیا۔ ”تم قمر مت کرو۔ میں موقع
دیکھ کر اپنے ڈیڈی سے بات کر لیتی ہوں۔“ اور پھر
مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”اب مسکراؤ
ناں۔“

میں نے زبردستی اپنے چہرے پر غیور تاثرانہ
مسکراہٹ دی۔

”مسکراؤ بھی یار، ایسا لگتا ہے کسی نامور اخبار
کے فرٹ پیج پر چھوٹ گئے ایڈر پر نظر آ رہے ہو۔“ اُس کی
اس بات پر میں نے اپنی کسی نہ روک رکھا۔

خالدہ نے اپنا کام کر دیا تھا۔ جو ”میڈرنگ“ میرے ابا کے پاس نہ تھی، وہ خالہ کے ڈیڑی کے پاس تھی بلکہ کچھ دافر مقدار میں دستیاب تھی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر میرا کام ہو گیا تھا۔

اپنی جلدی تو جنت منتز اور کالا جادو کے ماہر افریقی یا بنگالی بابے بھی مسئلہ حل کرنے پر قادر نہ تھے۔ پہلے تو مجھے مگر برفون آیا۔ شہر کے سب سے بڑے سرکاری ہسپتال سے۔ دوسری کال شہر کے سب سے بڑے نجی ہسپتال سے تھی۔ اور تیسری کال خالہ کے ڈیڑی کی جانب سے تھی۔ ٹیلی فون چونکہ ابابھی اٹھایا کرتے تھے یا ای جان تو اس مرتبہ ابابھی اٹھائی۔

”جی کون صاحب؟“ ابانے ریسیور کان سے لگاتے ہی پوچھا۔ دوسری جانب سے کچھ بتایا گیا۔ ”اچھا! لیکن میرا بیٹا تو ڈاکٹر بننا چاہتا ہے، بھلا کسی ٹیکسٹری سے اُس کا کیا لینا دینا؟“ دوسری جانب سے کچھ کہا گیا تو ابانے بھی ریسیور میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”جیل الدین، یہ کوئی خاقانی صاحب ہیں، ملک کے نامور صنعت کار ہیں، جنہیں مبارک باد دینا چاہتے ہیں۔“ اور ابنا منہ میڑھا سا بنا کر جھکتے ہوئے خیالات میں گم وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ خالہ کے ڈیڑی ہیں، میں نے کھکارا بھرتے ہوئے سلام کے بعد اُن کا دھیسے سے شکر یہ ادا کیا۔

”کوئی بات نہیں بیٹے، یہ تو میرا فرض تھا، اباب خالہ سے بات کرو۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے خالہ کو فون دے دیا۔ لیکن میں سوچ میں گم ہو گیا کہ یہ سفارش کرنا اُن کے فرائض نہیں کیونکہ شام ہو سکتا تھا۔ ”مبارک ہو“ خالہ نے فون پر آتے ہی پر جوش انداز میں مجھے مبارک باد دی۔

”میں تمہارا احسان مند ہوں، خالہ! میں نے اُس وقت اپنا آپ منوں بھاری محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔“ تمہارا بہت بہت شکریہ۔“

”بے کاری پاگے جا رہے ہو۔ فون تو ڈیڑی نے اس لئے کیا تھا کہ تمہیں یاد کروادیں کہ اب مشائی کھانا مت بھونا اور میں نے اس لئے کیا تاکہ معلوم ہو کہ ابھی بھی منہ پر چرہی بجے ہیں یا سونیاں چھ سے آگے بھی بڑھی ہیں؟“

اُس کی بات سن کر میں فس دیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ، کب آؤں؟“

”پہلے یہ تو فیصلہ کر لو کہ سرکاری ہسپتال میں پریکٹس کرنی ہے یا نجی ہسپتال میں۔ جو اننگ دے دو، پھر تھوڑا سا جب ڈاکٹری کی ریل گاڑی آگے بڑھنے لگے تو مشائی بھی کھلا دینا۔“

”اوکے، ڈن!“

”چم چم مت ڈلوانا مشائی میں کیونکہ ڈیڑی کو شکر کا عارضہ ہے۔“ اُس نے مجھے تنبیہ کی۔ ”نہیں ڈلواؤں گا۔“ پھر کچھ سوچتے ہوئے میں نے اُس سے سوال کیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تم میری جگہ پر ہو تو سرکاری ہسپتال میں کام کرنے کو ترجیح دیتیں یا نجی ہسپتال میں؟“

دوسری جانب سے کچھ وقفے کے بعد خالہ گویا ہوئی، غالباً وہ سوچ رہی تھی۔

”میں نجی ہسپتال میں کام کرتی۔“

”اور اس فیصلے کی وجہ کیا ہوئی؟“

”ایک تو بھیڑ کم، چل خوراک کم، مشائی والا ماحول، بیرون ممالک سے پڑھے لکھے ڈاکٹروں کے زیر سایہ مجھے زیادہ سے زیادہ جدید برائے پرکھنے کا موقع ملتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ سرکاری ہسپتالوں سے ڈعائی تین گنا زیادہ تنخواہ اور اہمیت ملتی۔“

(یہ باتیں اچھے وقتوں کی ہیں ورنہ نجی ہسپتالوں میں اب بلیک میلنگ کی جاتی ہے اور کم از کم تنخواہ دی جاتی ہے جبکہ سرکاری محکموں میں اب بہتر حالات ہیں۔)

”تو تم چاہتی ہو کہ میں اپنا کیریئر نجی ہسپتال سے شروع کروں!“ میں نے دانستہ بات اُس کے

کورٹ میں پھینکتے ہوئے کہا۔

”میری مرضی تھوڑی سی ہے، تم نے پوچھا سوئیں نے کہ کیا۔“

”اچھا! کیا واقعی؟“ اس مرتبہ میں نے اُسے کریدتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں کہا تھا جسے وہ بخوبی سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ شرم جائے گی لیکن اس کے برعکس وہ چڑکری ہوئی۔

”ہاں تو اور کیا؟ جس میں تمہاری خوشی، جی“

”مجھے جی مت کہو، میں چڑکریو لا۔“ تمہیں معلوم ہے کہ ایسا سن کر اپنا آپ پر بھونکنے کو دل کرتا ہے۔ میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ورنہ مجھے اُس کے منہ سے اپنے لئے جی کا لفظ اتنا بھی برا نہیں لگتا تھا، بس، ہمارے بچہ میں ایسے خطاب رائج نہیں تھے۔ یہ کہتے ہوئے وہ مجھے نہہری تھی۔

”اوہ سوری، میرا مطلب تھا۔۔۔ جیل الدین صاحب۔“

”یہ صاحب بھی ہٹاؤ!“ میں نے احتجاجاً کیا۔

”جیل الدین!“ وہ تنک کر ہوئی۔

”بائی دی وے، جیل سے کام نہیں چلا سکتیں، کیا؟“

”میں چاہتی ہوں، جیل کہ تم ایک کامیاب انسان بن کر مجھے دکھاؤ۔ بس!“

”بہت بھوس ڈائلاگ ہے۔ اکثر فلموں میں ماں کا کردار ادا کرنے والی اداکارائیں ہوتی ہیں۔ تم میری ماں تو نہیں ہو۔“ میری بات پر وہ کھٹکھٹا کر فس دی۔ پھر ہوئی:

”اب کام پر فوس کرو، باتیں بعد میں۔ اور ہاں مشائی میں چم چم نہ ہوں کیونکہ۔۔۔“

”۔۔۔ تمہارے ڈیڑی کو شکر کا عارضہ ہے، یاد رکھو گا۔“ میں نے اُس کی بات اچک کر مکمل کر دی۔

☆.....☆.....☆

وقت گزرتا چلا گیا۔ میں نے خالہ کے مشورے اور اُس کی بات میں وزن ہونے کی بنا پر نجی

ہسپتال سے ہی آغاز کیا۔ اور اس دوران اپنی تعلیم آگے جاری رکھی۔ چار سال جرمنی میں چیتائے۔ وہاں سے گروہ و مشانہ کی مہارت حاصل کی اور واپس اُسی نجی ہسپتال میں بحیثیت ماہر گروہ و مشانہ کے اپنی پریکٹس کا از سر نو آغاز کیا۔

لیکن فرق یہ تھا کہ پہلے میں ایک عام ڈاکٹر تھا اور اب مخصوص شعبے کا انچارج بھی تھا اور بہت سے ڈاکٹروں کا اُستاد بھی۔ گویا اب میں اپنے شعبے کا ایک طبی ماہر تھا اور دیگر ڈاکٹر میری رائے کے طلکار اور محتاج تھے۔ وہ میرے آگے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے اور کان کھڑے کر کے میری بات کو دھیان سے سنتے اور یہی نہیں بلکہ مجھے بھی اپنی حیثیت کا حقیقی معنوں میں اب ارادہ ہو چلا تھا۔

گروہ و مشانہ کے شعبے میں تحقیق کرنے کی وجہ یہ بنی تھی کہ ابابا کو شکر کے عارضے نے آلیا تھا جس وجہ سے اُن کے گردوں میں خطرناک سوزش پیدا ہو گئی۔ ریٹارمنٹ کے بعد وہ کافی عرصہ علیل رہے اور پھر ایک دن وہ ان کو بچے کیوں کو چھوڑ کر تھکیوں بھرے، ابدی نیند والے سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے واپس کوئی نہیں آتا۔

کانی عرصہ تک ابابا کی یادوں نے مجھے اپنے کام سے روکے رکھا تھا۔ نہ کپڑوں کا ہوش تھا اور نہ ہی اپنی بڑی شیو کا۔ عجیب مجنون سا سا ہو گیا تھا، میں۔ میری حالت ایسی تھی جیسی ناصر کاظمی نے کہہ ڈالی تھی۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بتاؤں کس کے لئے

وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا، میں باہر جاؤں کس کے لئے

سرکاری ملازمت سے انیسویں درجے پر ابابا ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ امی جان کو پیشین مل رہی تھی۔ آفیسر گریڈ میں پیشین ہمیشہ سے اعلیٰ رہی ہے، ورنہ ٹپلے درجے کے لوگ تو فقط چار دن کا خرچ بنام پیشین وصول کرتے ہیں۔

خیر، اس سے قطع نظر خالدہ سے فون پر بات چیت رہتی تھی۔ اس کے والدین کا اصرار تھا کہ میں اب خالدہ سے تمام عمر کے لئے منقطع ہو جاؤں۔ بات تو ہم میں کب کی ایک خاموش سمجھوتے کے طور پر طے ہو چکی تھی، بس! ٹھیک اور مناسب وقت کا انتظار تھا، سو وہ وقت اب آن پہنچا تھا۔

ہماری شادی ہو گئی۔ خالدہ بھی ڈاکٹر کی لیکن اُس نے ناک، کان اور گلا کے امراض میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ ہم دونوں شادی کے بعد بھی ایک دوسرے سے زیادہ عرصہ دور ہی رہتے تھے۔ دراصل ساری بات فریضہ منجی ادا کرنے کے اوقات کے تفاوت کی وجہ سے تھی۔

اُس کی نائٹ ڈیوٹی تو میری دن کو، اُس کی دن کو تو میری رات بھر میں۔ ایک اینڈر میں کہیں اتفاقاً ایسا ہوتا کہ ہم دونوں کو آپس میں فراغت کے لمحات مل پاتے، اُن لمحات کو بھی اسی جان کے ساتھ تینوں گھونٹے پھر نہ نکل جاتے اور خوب اچھا سا کھانا کاسی فائو اشار ہوٹل یا کلب میں کھاتے۔ زندگی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور پھر ایک دن ہمارے ہسپتال کے ڈین کا تبادلہ ہوا اور دوسرا ڈین ہسپتال کا ایڈمنسٹریٹر بن کر یہاں تعینات کیا گیا۔ اُس کا نام ظہیر الدین تھا۔ ڈاکٹر ذکی فہرست میں اُسے نہیں کچھ زیادہ ہی بھا گیا تھا۔ جس کا اُس نے پہلی ملاقات میں مجھ سے ذکر بھی کیا۔

”ڈاکٹر جمیل الدین، آپ کا نام تو میرے نام سے مماثلت رکھتا ہے لیکن اب آپ کا کام بھی مماثلت رکھنے لگا ہے۔“

”جی شکر یہ سہ۔ لیکن میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا میرے کام میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟“

اُس نے میری بات سن کر اپنی آرام دہ کرسی پر ٹیک لگا کر کہا۔ ”کام تو سہرا ہے۔ لیکن یوں کام کرتے کرتے تو کام کا وقت

کل جائے گا۔“ اُس نے دونوں آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

”میں ابھی ابھی آپ کی بات نہیں سمجھا، سر! اب میرے ماتھے پر پریشانی کی سلوٹیں نمایاں ہو چکی تھیں۔“

”بھئی، زندگی ایک بار ملتی ہے، بار بار نہیں ملتی اور یہ بات ایک ڈاکٹر تو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔“

”جی بالکل سچ کہا آپ نے سہ۔“

”تو پھر کچھ پہنچ لایے، اپنے اندر کے انسان میں، اپنی سوچ میں، اپنےائف اشکال میں۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ میں ابھی بھی اس کی باتوں میں چھپی بات تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ ”جی ضرور، سر!“ میں نے ایک گول مول جواب دیا۔

”دیکھیے اکیسویں صدی کا آغاز ہو چکا۔ چند روز ہی گزرے ہیں، لیکن ہماری سوچ وہیں پر اُچی ہوئی ہے۔ فرض کیا، ڈیوٹی پر گئے، واپس لوٹے، کئی ہنگامی پر شکر کر لیا، یہ سوچ رکھتے ہوئے کہ اوپر والا بڑا مہربان ہے، آج نہیں تو کل خواہشات ضرور پوری ہو جائیں گی اور ویسے بھی کتابی محاورہ ہے کہ روم ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا تھا تو یوں اس کہادت کو سچا تسلیم کرتے ہوئے ہم جیسے بدھ بھی اپنی تمام تر زندگی روم کی تعمیر پر بیٹا دیتے ہیں، لیکن ذرا غور فرمائیے جمیل الدین صاحب! کہ انسان نے ایک آلہ بنایا، جسے کمپیوٹر کہتے ہیں، یہ آلہ انسان ہی استعمال کر رہے ہیں اور اس آلے کا مقصد تو یہ تھا کہ ہر کام ایک معمول کے مطابق، منظم طریق سے بروقت کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جائے اور نہ صرف مکمل ہو بلکہ شمار میں بھی آجائے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ یہاں ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہمارے یہاں پر یہ آلہ اب انسان کو استعمال کر رہا ہے۔“ پھر اس نے اپنی آرام کرسی سے کھڑے ہو کر میری جان پیچھ کرتے ہوئے، بڑے سے روزن کے سامنے باہر کھلے میدان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا شروع کیا۔ ”ہم نے اپنے نیچے والوں کو ابھی تک غلامی میں رکھا ہوا ہے۔ جو ہم کریں گے، یہ لوگ وہی کریں گے۔“

”سر، نظام ہی ایسا ہے! اور پھر انہیں اسی کام کی تنخواہ بھی دینی جاتی ہے۔“ میں ابھی ابھی اُس کی سوچ تک رسائی نہیں کر سکا تھا۔

”اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ قدیم و قیادوسی انداز کو اپنانے ہوئے ہیں، اب تھوڑی جدیدیت پیدا کیجئے۔“ اُس نے مڑتے ہوئے میری جانب مسکرا کر کہا۔ ”اور یہ جدیدیت کیسے پیدا کی جاسکتی ہے، سر؟“ میں نے براہ راست سوال کر دیا۔

”لیجئے، پھر میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر ہم میں اگلے دو گھنٹے تک طویل بات چیت ہوئی۔

☆.....☆.....☆

خاقانی صاحب میرے محسن ہی نہ تھے بلکہ اب میرے سر بھی تھے۔ اُن کی صحت اس وقت بھی قابل رشک تھی حالانکہ وہ شکر کے حارثہ کے دائمی مریض تھے اور وہ بھی ”قسم دوم“ کی شکر کے لیکن پھر بھی انہوں نے اور میری ساس صاحبہ نے اس عمر کی بڑی وقتی رفتار کے ساتھ ساتھ اپنے مرض پر خوب قابو رکھا ہوا تھا۔

آج اُن کی دعوت تھی۔ ہمارے گھر پر بحیثیت مہمانان خصوصی وہ مدعو تھے۔ لیکن میں نہ جانے کیوں سارا وقت یو جمل یو جمل سا بیخار ہا تھا، شاید اکیسویں صدی کا لیکچر جو سننے ڈین نے مجھے دو گھنٹے کی طویل ملاقات میں دیا تھا میری روح کو مکمل طور سے ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ میرے بچے بچے روئے کو خاقانی صاحب نے بھی محسوس کیا تھا اور باتوں ہی کے دوران مجھ سے شکوہ بھی کیا تھا لیکن میں نے دانستہ بات آئی گئی کر دی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے گھر میں دفتری معاملات کو زبردستی لاؤں بلکہ کوئی بھی ایسا نہیں چاہتا۔ اسی لئے جب سب مہمان رخصت ہوئے اور امی جان بھی آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں سونے چلی گئیں تو بستر پر دراز ہو کر میں چھت کی جانب خاموشی سے گھورتے ہوئے لیٹا رہا۔ ویک اینڈ تھا اور خالدہ کا ساتھ میرا تھا۔ ورنہ عام دنوں میں وہ نائٹ ڈیوٹی کیا

کرتی تھی۔

”آپ کچھ نارمل والے جیل نہیں تھے، آج!“ آخر کار اُس نے بھی مجھ سے شکوہ کر ہی ڈالا تھا اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بات کا آغاز کرے۔

”خالدہ!۔۔۔“ میں نے ایک طویل آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں نوکری چھوڑ دوں تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ وہ میرے ساتھ لیٹتے ہوئے یکدم چونک کر میری جانب دیکھی تھی۔ شاید اُسے میری بات عجیب سی لگی ہو۔

”آخر براہم کیا ہے اس نوکری میں؟“ اُس نے میرے بڑے کبل میں لکھتے ہوئے اور اپنے اوپر اوڑھتے ہوئے پوچھا۔

”خالدہ!۔۔۔ ہسپتال میں نیا ڈین آ گیا ہے۔“ ”تو آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟۔۔۔ وہ آیا ہے، اپنے لئے اور آپ کو اس سے کیا، آپ وہاں سے جانے کی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔“

”تم سچ کہتی ہو، وہ اپنے لئے ہی آیا ہے۔“ میں نے چھت کی جانب سوچتے ہوئے، گھورتے ہوئے کہا۔

”چلیں ایزی ہو کر میرے ساتھ مکمل کر بات کریں، اس طرح تو آپ کی بات مجھے سمجھ میں نہیں آسکتی۔“

”تم نے آج مجھے یہ نہیں کہا کہ منہ پر چھ کیوں بجا رکھے ہیں میں نے؟“ میں نے اُس کی جانب کروٹ لے کر اُسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے پوچھا۔

”اُس کی ضرورت نہیں، یہ ٹائم آپ کے منہ پر اکثر نظر آتا رہتا ہے، اب مجھے عادت سی ہو گئی ہے۔“ اُس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ لیا تھا۔ ”چلیں ذرا جلدی سے اُس نئے آلے والے ڈین کی سائیے کہ اُس کا آنا آپ کو کیونکر گراں گزر رہا ہے۔“

”وہ چاہتا ہے کہ میں اُس کی ٹیم کا حصہ بن جاؤں۔“

”لیجئے، یہ تو احقانہ بات ہے، ہر ڈاکٹر اسی کی ٹیم کا حصہ ہے۔ اس میں چاہئے یا نہ چاہئے والی کنونسی بات ہے؟“

”نہیں نے اس کو اپنی ہانہوں سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔“

”دراصل وہ چاہتا ہے کہ میں ڈاکٹری کے مقدس پیشے پر کلنگ لگا دوں۔ وہ کروں جو ایک ڈاکٹر کے شایان شان نہیں۔“

وہ اب بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میری جانب حیرت سے گھورتے ہوئے مخاطب ہوئی۔ ”نہیں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”دیکھو خالده، ہم دونوں کا پیشہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم مرض کی تشخیص کے بعد اس کے علاج یا مرض پر ایک خاص حد تک قابو پانے کی کوشش کریں، اسی مطابق مریض کو موثر ادویات دیں۔“ ”نہیں نے پھر اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں ایسا ہی ہے ناں؟“

اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ”ہاں ایسا ہی ہے۔“

”لیکن اس ڈین کا کہنا یہ ہے کہ ہم کپنیوں سے معاہدہ کریں گے، اور جو کپنیاں ہمیں کچھ دیں گی تو ہم بھی انہیں کپنیوں کی ادویات اپنے مریضوں کو تجویز کریں گے۔ چاہے ادویات موثر ہوں یا نہ ہوں۔“

”لیکن یہ تو سراسر رشوت ہے اور اپنے پیشے سے غداری بھی۔“ اس نے حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جواب دیا۔

”اگر نہیں ایسا نہیں کروں گا تو وہ میرا جینا مرنا دو بھر کر دے گا۔ اور تمہیں معلوم ہے خالده! کہ میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔“ میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

”پلیز، خالده۔۔۔ میرا مقصد تمہیں ہرگز نہیں پہنچانے کا نہیں تھا، میں تو صرف تم سے مشورہ مانگ رہا ہوں۔ باقی جو تم کوگی اور جیسا تم چاہو گی۔“

اس نے اس مرتبہ مجھے اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ اس کے جسم کے گداز حصوں سے مس کرتے ہوئے مجھے اپنا آپ ہلکا سا لگا تھا۔ وہ میری حواشی اور نہیں اس کا آدم۔ ہماری سیدھی سادی خوبصورت سی بسی بانی جنت میں جانے کہاں سے شیطان گھس آیا تھا۔ وہ میرے کاندھے کو سہلاتے ہوئے بولی۔

”نہیں سوچتی ہوں جیل، کیا یہ ہے اکیسویں صدی؟ جس کا انتظار انسانوں نے کیا تھا کہ ایک نمایاں تبدیلی آجائے گی۔ انسانی ذہنی خلفشار دور ہوں گے۔ پریشانیوں میں کمی آجائے گی۔ انسان ترقی کرے گا۔ انسانیت کے امور والے فلاحی کاموں میں اضافہ ہوگا۔ زندگی جنگ و جدل اور برائیوں کے عزائم سے پاک ہوگی۔ ایسی فضا ہوگی جس میں ہر آنے والی نئی روح ایک طمانیت اور فرخندگی کے رے کی اور اپنے خالق کا شکر بجالائے گی جس نے اسے اس صدی میں پیدا کیا۔ میں سوچتی ہوں کہ یہ سواہنے خواب دکھائے تھے، اُن دنوں دفریب کے کارکنوں نے جو اپنے آپ کو نئی دنیا کا حکم سمجھتے ہیں۔ اور ہم نے ان لوگوں کو اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا جو لوگ ازل کی بھوک کے مارے، رزق اور انسانی خون و جسم میں فرق نہیں سمجھتے۔ واہ جیل واہ۔۔۔ یہ ہے اکیسویں صدی جس کے آغاز پر دنیا بھر میں ایسا جشن منایا گیا تھا کہ جیسے دنیا کے تمام مسائل حل ہوئے کو جا رہے ہیں۔“

”نہیں اس کی باتوں کو غور سے سنتا رہا تھا، کیونکہ وہ اکیسویں صدی کے ان نئے کارناموں کو اپنے دکھ بھرے انداز میں ٹھیک ہی تو بتا رہی تھی۔“

”اور ہاں ایک بات یہ بھی تھی، خالده۔۔۔ ڈین چاہتا ہے کہ میں پرچیز کمیٹی (Purchase Committee) میں شامل ہو کر جاؤں اور محل خریداری میں اس کا 7% اور اپنا 5% حصہ رکھتے ہوئے بل بنواؤں اور ہسپتال کے لئے خریداری کروں۔“

”لیکن یہ تو سرکاری ہسپتالوں میں حکومتی فنڈز کا مہین کرنے کی غرض سے وہاں کے بڑے ڈاکٹر ز ایسا کرتے ہیں، آپ کے کئی ہسپتال کو اس سے کیا فائدہ ہو گا؟ یہ تو سراسر اُن کا نقصان ہوگا۔“ اس نے پریشانی میں سوچتے ہوئے دریافت کیا۔

”اگم ٹیکس کم دینا پڑے گا اور دیگر فوائد بھی ہوں۔“ ”نہیں نے مختصر کہا۔“ ”ہسپتال کے مالک کا وہ داماد بھی ہے۔“

”تو یہ بات ہے!۔۔۔“ اس نے طنز پر جملہ کہا۔ ”نئی صدی، نئے لوگ، نئی سوچ، نیا آغاز۔“

”ہاں ایسا ہی ہے لیکن تم مجھے کیا مشورہ دو گی؟“

”میرا خیال ہے کہ میں ڈیڈی سے اس بات کا ذکر کرنا چاہئے۔“

”کمال ہے، خالده۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔“ ”نہیں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا مطلب ہے کہ کیا سوچیں گے؟“ اس نے مجھے اپنی ہانہوں کی قید سے آزادی بخشتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا اور اس بات کو کرتے ہوئے وہ بخندہ تھی۔

”مطلب۔۔۔ اگر تمہیں یاد ہو کہ مجھے اس مقام تک پہنچانے میں بھی تو تمہارے اُن سے بات کرنے کا عمل دخل رہا ہے تو کہیں وہ۔۔۔“ ”نہیں نے دانستہ اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا۔

”جیل، پلیز۔۔۔ یہ کامیابیاں آپ کی ہی تھیں۔ آپ کا حق جو میں دے رہے تھے، اُن سے دلو کہ آپ کو دے دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں جانتا چاہتی ہوں کہ ڈیڈی کے پاس اس کا توڑ کیا ہے۔“

”اوہ اچھا یہ بات ہے تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔“ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا نہیں خیال کہ میں یہ باتیں اب ڈیڈی سے کرنی چاہیں کیونکہ اب ہم بھی نہ تو بچے ہیں اور نہ ہی اتنے غیر بھگدار کہ بار بار میری ڈیڈی کو پکارتے رہیں۔ میں اس لئے کہہ رہا تھا کہ ڈیڈی بھی پھر کیا سوچیں گے؟“

”نہیں کہہ رہی ہوں ناں کہ وہ ایسا کچھ نہیں سوچیں گے، اس وقت فی الحال آپ کو اور مجھے نیند کے متعلق سوچنا چاہئے، باقی کے معاملات مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں جاؤں ڈیڈی جہاں میں اور ہمارا کام۔“

”نہیں نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور دھیمے سے ”ٹھیک یو“ کہہ کر کروٹ بدل لی۔

”کوئی ناراضگی ہے کیا؟“ میرے عقب سے اس کی آواز سنائی دی اور جب میں نے اس کی جانب کروٹ لی تو اس نے مجھے زور سے اپنی ہانہوں میں بھینچ لیا۔

اس کی ہانہوں میں آکر میں اپنے سارے جھیلے بھول گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

خالده کے ڈیڈی نے میرے ٹرانسور پوسٹنگ کے آرڈر جاری کروا دیے تھے۔ دوسرے شہر لیکن جزواں شہر میں مجھے ترقی دلا دی تھی اور یہی نہیں بلکہ ایک نئے عالی شان بنگلے میں بھی ہمیں شفٹ کروا دیا تھا جو انہوں نے اپنی بیٹی خالده کو تحفے میں دیا تھا۔

جب ہم تینوں نئے بنگلے میں آئے تو خالده کے ڈیڈی نے جبراً ہم سے اپنی دعوت کروائی۔ وہ زندہ دل انسان ہیں۔ صنعت کار بھی ہیں اور اب تک ایک مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے بھی اس نئی اسکیم میں بنگلہ خرید لیا ہے اور اپنی اہلیہ سمیت یہاں منتقل ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہمسایہ ہیں۔ اُن کی اگلی اولاد اگر خالده ہے تو اُن کا داماد اور بیٹا میں بھی ہوں۔ دعوت میں جب امی جان، خالده اور اس کی مئی قدر سے فاصلے سے آپس میں بات چیت اور خوش گپوں میں مصروف تھیں تو میں نے اُن سے سوال کیا،

”انکل، ایک بات بتائیے کہ ہم کس شعبے میں محفوظ ہیں۔“

حالیہ واقعات کے تناظر میں وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے کافی کی چٹی بھرتے



خونی نمبر

فاطمہ خان۔ علی پور مظفر گڑھ

خوہرو حسینہ کے ہاتھوں سے اچانک موبائل نیچے گر پڑا تو حسینہ خوف کی وجہ سے گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی اور پھر اس کے سامنے ایک آتما نمودار ہوئی جسے دیکھ کر حسینہ کی.....

جسم و جاں میں خوف کی لہر دوڑ اُٹی اور آنکھوں کو پتھر اڑنے والی دہشت ناک روداد

”چھ سال ہو گئے اس اخبار میں کام کرتے ہوئے محال ہے کہ ایک دن بھی پاس ہمارے کام سے خوش ہو، اور بھول کے بھی تھوڑی بہت ترقی دی ہو۔“ کرن نے ایک بھاری قائل جانوی کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”جانوی اور کرن کو مصافحت میں آئے ہوئے کم و بیش چھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اتفاق سے وہ بہت اچھے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے خواب بھی ایک ساتھ ہی دیکھنے لگے تھے مگر کرن کا کہنا تھا کہ جب تک وہ ایک گھسے پے پھانسی سے تھوڑا اوپر ترقی نہیں کر لیتا تب تک جانوی سے شادی نہیں کرے گا۔ جانوی جس حال میں تھی خوش تھی۔ اس نے اونچے اونچے خواب کبھی دیکھے ہی نہ تھے۔ مگر کرن کی اس ضد کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہ بخوبی

بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔“

”آپ نے آج تک کنٹوں کو رشوت دی ہے؟“ سوال احمقانہ سا تھا لیکن میں نے کروایا۔

”سرکاری محکموں میں تو ہر قدم پر اور نجی کام میں بعض جگہ اور بعض جگہ بالکل بھی نہیں۔“ انہوں نے کچھ گلی بندھی رکھے بغیر جواب سے مجھے لو اڑ دیا۔

”انگل، میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ میں بھگتا ہوں کہ میں اس نظام میں شاید۔۔۔“

”Miss fit ہوں۔۔۔“ انہوں نے میری بات مکمل کرتے ہوئے کہا تو میں نے اشیات میں سر ہلا دیا۔ ”ہاں تو صحیح ہے، تم واقعی مس فٹ ہو۔ بلکہ تم جیسے اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو پردیس میں ہیں اور جو لوگ یہاں آئے ہیں اور انہوں نے کوئی مقام حاصل کیا ہے تو شرانگہ کے ساتھ۔ ورنہ وہ بھی یہاں نہ ٹھہرتے۔“

”کیا یہ خوفناک بات نہیں کہ ملک کی اصل انسانی دولت ضائع ہو رہی ہے؟“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”خوفناک بات ہی نہیں بلکہ انتہائی خطرناک بات بھی ہے۔ کالا دھن جس معیشت میں عام ہو جائے، اُس کی دھجیاں اُڑ جاتی ہیں، پیٹا ایسوں کا تو، نام بھی نہیں رہتا نام والوں میں۔“

وہ تو اپنی بات روانی میں کہہ گئے تھے لیکن مجھے شہدے پسے آنے لگ گئے تھے کیونکہ مجھے اسے وطن سے شدید پیار رہا تھا اور اب بھی ہے۔ کیونکہ یہ وطن میرا آبائی گھر ہے۔ مجھے ان کی بات سن کر یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے ایک زلزلہ آیا، 18 اکتوبر 2005 والے زلزلے سے بھی شدید زلزلہ اور وہ سب کچھ اور سب کو زمین بوس و مسمار کرتے ہوئے نکل گیا۔

انگل نے یہ کیا کہہ ڈالا تھا۔

”ایسوں کا تو پیتا نام بھی نہیں رہتا نام والوں میں!۔“



ہوئے پوچھا۔

”تمہارا مطلب یہ کہ کرپشن سے؟“

”جی ایگزیکٹ لی! میں نے جواب دیا۔

”بیٹا میں ایک صنعت کار ہوں۔ اس میدان میں پرانا کھلاڑی ہوں۔ اور جب سے اس میدان میں ہوں تو تب سے میں اپنا ہر کام نکلوانے کے لئے دانہ ڈال آیا ہوں۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ میرے کہنے کا کیا مطلب ہے؟“

”جی!۔۔۔“ میں نے مختصراً جواب دیا۔ پھر میں نے کچھ سوچتے ہوئے اُن سے پوچھا۔ ”اور اگر کوئی دانہ نہ ڈالے تو؟“

”تو پھر کوئے کا کیا بنے گا؟“ انہوں نے میری آنکھوں میں نہایت رعب دار انداز میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”لیکن انگل، جب میں جرنی میں تھا تو وہاں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ سب ایک نظام کے تحت حکومت اور سرکاری مشینری کے قابو میں تھا اور۔۔۔“ میری بات کاٹتے ہوئے وہ بولے۔

”روم میں وہی کرد، جو رومی کرتے ہیں۔“ پھر وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولے۔ ”اور ویسے بھی تم جنس کی مثال دے رہے ہو۔ یہاں تو کوئے زیادہ ہیں اور جنس کم۔ کوا، کوا ہی رہے تو بہتر ورنہ سب نے کیا کہتے ہیں، کوا چلا جنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا!“

”کیا یہ نظام بدل سکتا ہے؟“ میں نے دو ٹوک سوال کر دیا۔

”نظام ایک قوم بدلتی ہے۔ نظام کو ایک بھیڑ، جھوم، اختلاقی سوچ رکھنے والے لوگ نہیں بدلتے۔ بلکہ آریشار کی ہمتی دھارا کے ساتھ خود بھی بنے جاتے ہیں، کیونکہ یہی بات اُن کی نظر میں اور ہر دیکھنے والے کی نظر میں آسان ہے۔ لیکن اہل نظریہ کہتے آئے ہیں کہ نظام ایک سوچ کے زیر نگین رہتے ہوئے بدلا جاتا ہے، مختلف افکار رکھنے والے تو شاید عمر بھر اپنا آپ بدلنے کی

☆ لوگوں کے مکانوں کی دیواریں اتنی بلند ہو گئی ہیں کہ مساجد کے مینار میری نگاہ کی رسائیوں سے باہر نکل گئے ہیں۔

☆ دکھ بے بسی کا دوسرا نام ہے۔

☆ حیا سوچ کا لباس ہے۔

☆ تحکمن فنا کی طرف اشارہ ہے۔

☆ انسان کی قیمت اس کا کام ہے۔

☆ خ. غرض، اتحاد کو، یکا، یکا، 7-1-1

— 11 —

جان ہے۔

کھڑکی اوروں کے لئے بجیے کا نام ہے۔

☆ محبت کے بارے

کر دیتے ہیں۔

☆ سب کچھ پالینا ہی کا

کامیاب کر دیتی ہے۔

☆ سماجی مقام بدلنے سے رشتے تبدیل نہیں

— ८५ —

(میرزا احمد دلاور خان)

وہ کہہ کر اٹھ کر گئے۔

اس نے موبائل پر ایک ممبراویزاں تھا۔ اس

جانوی تھو تو کاں رہو تھی اس کو سمجھ نہیں آ رہا۔

تھاکہ آخر کرے تو کہا کرے۔ موبائل، ایک بار پھر بیچ اٹھا

وراب کی بار بھی وہی راگ نمبر اس کے موہاٹل کی

سکرین پر نمایاں نظر آ رہا تھا۔

جانوی کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر نیچے پر

پڑا۔ مکر موہا نل اب بھی بدستور بج رہا تھا۔ کافی دیر بعد

موبائل خاموش ہوا تو جانوی نے ڈرتے ڈرتے موبائل

اس خونریز راگِ نمبر کے بارے میں مشہور تھا کہ جس کسی نے جیجی کا ریسٹیکو تو وہ آتما کا شکار بن گیا۔

بریک ٹائم میں جاوٹی اور کرن ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ کرن بولا۔ ”جاوٹی مجھے لگتا ہے کہ اپنے آرٹیکل کو ٹھوڑا اور مزیدار بنانا چاہئے ہو سکتا ہے یہ کسی انسان کا کام ہو۔ تم نے کہا تھا کہ آتما پر کوئی یقین نہیں کرتا۔“

”ہاں بالکل میں نے کہا تھا۔“ جانوی نے چائے کی چمکی لیتے ہوئے کہا۔ کرن بول اٹھا۔ ”اس نمبر پر کال کرتا ہوں۔“

جانوی اچھل پڑی۔ ”نہیں کرن! یہ نہیں کیا
 راز ہے اس خبر کا کچھ بھی ہو سکتا ہے ہمیں بس آرمیکل
 لکھتا چاہئے۔ کال وال چھوڑو۔“ جانوی نے
 ڈرتے ہوئے کہا۔ کرن جھنجھلا کر بولا۔ ”جانوی میں

چوچھتا ہوں وہ درست ہوتا ہے حاموی رہو، اور مجھے کال کرنے دو۔“ یہ کہہ کر کرن نے اپنا موبائل اٹھا لیا۔ ”اوہ شٹ! میں لوڈ کروانا تو بھول ہی گیا۔“ حامی نے موبائل پر ہاتھ رکھا۔ ”کرن جھنجھلا کر بولا۔ ”جانوی خالی ہے موبائل میرا۔“ کرن کے ہاتھ سے موبائل اٹھ کر اس نے دیکھا۔ ”کرن کے ہاتھ میں دل و جان سے مدد کرنی آتی ہے۔“ یہ کہہ کر کرن نے موبائل اس میں بیٹھنے بھی دیا۔ ”یہ اور کیسے بھی۔“

کرن نے جھٹ جانوی کا موبائل لے لیا۔

☆.....☆.....☆

مہر ڈال کر کے کرن نے کالی تو آگے
مکمل خاموشی طاری رہی۔ چندہ بیس منٹ گزر جانے
کے بعد بھی مکمل خاموشی رہی۔ کرن نے کال کاٹ دی
اور بولا۔ ”ایک اور مذاق اب کیا آرٹیکل لکھتا ہے اس
مذہب کے لوگ؟“

جانوی مکمل خاموش رہی، آفس کے بعد کرن نے اسے گھر ڈراپ کر دیا۔

گھر پہنچ کر جانوری نے اپنا موبائل فیلل پر رکھ دیا اور نہانے چلی گئی۔ جب لوٹی تو اس نے اپنا موبائل دیکھتے ہوئے بابا۔ فون اٹھانے پر۔

1 April 2018

پراسرار خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔“
جانوی نے ہنسنے والے انداز میں بولی۔ ”اے
کرن پہلے یہ تو بتاؤ کہ خبر ہے کیا؟“
”جانوی خبر یہ ہے کہ سننے میں آیا ہے ایک
راگ نمبر سے لوگوں کے موبائل پر کال آتی ہے جو کوئی
فون اٹھا لیتا ہے تو ایک آتما اسے مار دیتی ہے۔“ کرن
نے پراسرار لہجے میں کہا۔

یہ سننا ہی تھا کہ جانوی کی ہنسی نکل پڑی۔ اس نے زور زور سے ہنسا شروع کر دیا اور یوں: ”کرن اس ٹیکنالوجی کے جدید دور میں اور ایک بڑے مکے صحافی ہوتے ہوئے بھی تم یہ اتنا دھماکہ یقین کرتے ہو، تو ہوا ہوش کرو اگر اس قسم کا کوئی آرٹیکل لکھا بھی تو پاس ہم روڈوں کو دھکے مار کر نکال دے گا تو کرسی سے پھر کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔“

کرن غصے میں لال پتلا ہو گیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اگر تم میرا ساتھ نہیں دینا چاہتی تو نہ دو اور دور ہو مجھ
 سے..... نہ خود کبھی ترقی کرو گی اور نہ ہی کبھی مجھے ترقی
 کرنے دو گی، آئندہ بات کرنے کی جرات نہ کرنا مجھ
 سے۔“ کرن غصے سے تقریر چلا رہا تھا ہونے لگا ہوا۔

جانوی سب کچھ برداشت کر سکتی تھی مگر کرن کا غصہ کبھی نہیں، وہ بھوکا لہٹ میں بولی۔ ”میں کرن میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی تم جو کہو گے میں کروں گی بلکہ میں تمہاری مدد بھی کروں گی یہ آرٹیکل لکھنے میں، بس تم مجھ سے ناراض مت ہو۔“ جانوی کے اس طرح گڑگڑانے پر کرن بول اٹھا۔ ”مجھیک ہے کل مچ ارجن سے ملنا ہے میں تمہیں پک کرنے آ جاؤں گا تم تیار رہنا۔“

اگلی طرح وہ ارجن کے ساتھ ایک کافی شاپ میں موجود تھے۔ ارجن ان کو سب کچھ بتا چکا تھا۔ وہ کرن کا متخلص دوست تھا اور ہمیشہ کرن کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا، اسی لئے اس نے کرن کی اس قدر مدد کی کہ خونی رائے نمبر کا بھی سرخ لگا سکا تھا۔

☆.....☆.....☆

جانتی تھی کہ وہ دونوں معمولی صحافی ہیں اور اب اس سے زیادہ انہیں رجبہ ان کے مقدر میں نہیں ہے مگر کرن ہواؤں میں اڑنا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ ایک مشہور صحافی اور تجربہ کار بن جائے دن رات چوٹی ترقی کرے اور اب یہ اس کا جنون بن گیا تھا۔

کرن کا اس طرح باس کو کوسنا معمول تھا لہذا
جانوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کرن یا رجموڑو تمہیں
اچھی طرح معلوم ہے کہ اپنا باس کبھی کسی کے کام سے
خوش نہیں ہوتا تو پھر تم کیوں کڑھتے رہتے ہو، چلو دفع
کردان سب باتوں کو، آج آف ہونے کے بعد اچھی
سی کافی پیتے ہیں ساتھ، کافی دن ہو گئے ایک ساتھ جی
بھر کر گموئے بھی نہیں ہیں۔“ کرن کی ڈھارس صرف
جانوی ہی باندھتی تھی اور اس کے موڑ کو بھی وہ ہی خوشگوار
کرتا جانتی تھی۔ لہذا کرن اکتاہٹ بھرے چہرے پر
ایک مسکراہٹ لے آیا اور یوں اٹھا۔ ”چلو ٹھیک ہے چلتے
ہیں آج آفس کے آف ہونے کے بعد۔“

چند لمحوں بعد ہی وہ کافی شاپ میں حیدر کا کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے ٹھنڈے موسم میں گرم گرم کافی نے ان کے موڈ کو تازہ کر دیا تھا۔ اسے میں کرن کا فون بج اٹھا۔ اس نے دیکھا تو اس کا دوست ارجن تھا۔ ”ہاں ارجن بول۔“ فون اٹھانے کے بعد وہ گویا ہوا۔ ”اوہ بھگوان کیا بول رہا ہے تو؟“ کرن کے چہرے پر ہجرت، خوشی اور بوجھ کی تاثرات تھیں۔

”چل سب ٹھیک ہے کل پھر ملتے ہیں۔“ کرن نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تو جانوی بول اٹھی۔ ”کیا کہہ رہا تھا؟“

کرن پر جوش انداز میں گویا ہوا۔ ”جانو! ارجن بتا رہا تھا کہ ایک افواہ بہت مشہور ہو رہی ہے اور مختلف اخباروں کے صفحوں اس کے متعلق ٹھوس معلومات اکٹھی کر رہے ہیں، یقیناً اس کے بعد وہ آرٹیکل لکھیں گے لیکن اگر میں سب سے پہلے سے معلومات اکٹھی کر کے آرٹیکل لکھ دوں تو شاید بوڑھا باس خوش ہو جائے اور پھر ترقی کے بعد بھی جاسں ہیں کیونکہ لوگ ایسی ہی



پراسرار مخلوق

ایس اقبال احمد - کراچی

منفی سوچ رکھنے والوں پر لازم ہے کہ وہ کسی بھی جانور کو عام جانور سمجھتے ہوئے اس پر سختی نہ کریں کیونکہ ہو سکتا ہے وہ جانور کوئی اور نادیدہ مخلوق ہو جو کہ.....

ایک حقیقی کہانی جس میں پڑھنے والوں کے لئے خوف ہراس کے ساتھ ساتھ سبق ہی سبق ہے

یہ کہانی اس واقعہ سے متعلق ہے جو گزشتہ سال گرمیوں کے مہینے میں ہمارے ساتھ پیش آیا تھا۔ ہماری بڑی سی کوئٹی میں آکر شہر کی آلودہ فضاؤں میں بیمار ہونا نہیں چاہتے، یہی وجہ ہے کہ سوئرس کی عمر کے باوجود وہ دونوں ابھی تک صحت مند اور چاق و چوبند ہیں چونکہ نور پور پنجاب کا ایک دور دراز مگر انتہائی سرسبز علاقہ ہے لہذا ہم سب ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے نور پور آتے ہیں لیکن گزشتہ سال جان اور ابو کے بے حد اصرار کے باوجود وہ شہر میں سال گرمیوں کے مہینے میں ہمارے ساتھ پیش آیا تھا۔ گرمیوں چھٹیوں میں جب ہم کزنز اپنے آبائی گاؤں نور پور گئے تھے۔ جہاں ہمارے پردادا، دادی کا بہت بڑا مکان ہے، دراصل وہ شہر کی ہنگامہ پرور اور گرد آلود فضاؤں میں رہنے کی بجائے گاؤں کی سرسبز و تر و تازہ فضا اور ماحول میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے تیار

چھتیں ہیں، پہچاننے میں اس نے بالکل دیر نہ لگائی۔ کیونکہ یہ جانوی کی اپنی چیخنے کی آوازیں تھیں جو اسے موہاگل سے آ رہی تھیں۔ موہاگل اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی۔

چند ہی لمحوں میں اس نے سیاہ لباس میں ملبوس ایک آتما کو اپنے سامنے دیکھا جس کے لمبے نوکیلے دانت کسی ڈر کیلا سے مشابہت رکھتے تھے جانوی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں اتنی سخت نیچی کیڑہ بھاگ جائے۔

آتما اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی۔ اس کے لمبے نوکیلے دانت منہ پر صاف نظر آ رہے تھے حلقوں میں آنکھوں کا نام و نشان تک نہ تھا اور رخسار ایسے جیسے کسی نے سارا گوشت نوچ لیا ہو۔

خونی آتما جانوی پر ہل پڑی۔ کرن دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو خون میں لت پت جانوی تڑپ رہی تھی کیونکہ جانوی آتما کا شکار بن چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کرن تڑپتی ہوئی جانوی کو جلد از جلد اسپتال لے گیا مگر تب تک جانوی زندگی کی بازی ہار چکی تھی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد تصدیق ہو گئی تھی کہ کسی درندہ نے اپنے نوکیلے دانتوں اور پنجوں سے جانوی کی گردن کو بھجھوڑ ڈالا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جانوی کی لاش کرن کو دے دی گئی تھی اور اس نے اس کی آخری رسومات ادا کر دی تھیں۔

کرن نے جانوی کی موت کے بعد صحافت کا کام چھوڑ دیا تھا اور ضروری کرنے لگا تھا۔ وہ جانوی کی موت کا ذمہ دار خود کو ہی سمجھ رہا تھا۔ ایک جانوی ہی تھی جو اس دنیا میں اس کا واحد سہارا تھی اب وہ بھی اس کے پاس نہ رہی تھی۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا اور جانوی کو یاد کرتا رہتا۔ اس کی زندگی ایک پلٹتی پھرتی لاش کے علاوہ کچھ نہ تھی۔



اٹھایا اور کرن کو کال کی، کرن نے جلد ہی کال ریسیو کر لی تو جانوی یوٹکلاہٹ میں بول اٹھی۔ ”کرن مجھے بچاؤ وہی رنگ..... وہی راتگ نمبر میرے موہاگل پر بار بار آ رہا ہے۔ مجھے بہت خوف آ رہا ہے۔ کرن پلیز! جلدی آ جاؤ۔ کرن پلیز۔“

کرن پریشان سا ہو گیا اور بولا۔ ”میں ابھی آ رہا ہوں جانوی تم پریشان نہ ہو میں ابھی آ رہا ہوں۔“ جانوی نے موہاگل واپس ٹیکل پر رکھ دیا۔ اس کے حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے چبھ رہے تھے۔ سردی کے باوجود بھی اس کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ اس نے ٹیکل پر سے پانی کا جگ اٹھایا تو وہ خالی تھا، وہ بچن کی طرف مڑ گئی۔ پانی کا گلاس اس نے ایک ہی سانس میں پی لیا۔

جانوی اور کرن کا کوئی رشتہ دار نہ تھا، وہ دونوں ہی تنہا رہے تھے۔ والدین نہ جانے کب حادثے میں گزر گئے تھے۔ جانوی کے اور کرن کو ایک دور دراز کے رشتہ دار نے بلا لیا تھا جو کب کا مر چکا تھا۔

زندگی میں پہلی بار جانوی کو اپنے گھر کی تنہائی سے خوف آیا تھا۔ وہ خوف سے تقریباً کانپ رہی تھی۔ بچن سے جب وہ واپس لوٹی تو ایک مرتبہ پھر اس کا موہاگل بج اٹھا۔ اس نے دیکھا تو وہی راتگ نمبر بج رہا تھا۔ جانوی نے فیسے اور ڈر کے ملے جلے جذبات میں فون دیوار پر دے مارا تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ مگر یہ کیا چہرہ ہی لمحوں میں موہاگل فون دوبارہ مکمل تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر بج اٹھا۔

☆☆☆☆

جانوی کو اب یقین ہو گیا تھا کہ یہ ضرور کسی آتما کا پتھر ہے۔ موہاگل فون کی مسلسل بجتی ہوئی رنگ ٹون اسے وحشت زدہ کئے جارہی تھی اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کال ریسیو کرے گی۔

بھر پور جرأت اور بہادری سے اس نے کال ریسیو کر لی۔ اس نے اپنے موہاگل سے چند دلخراش

نور پور میں پیش آنے والے واقعہ نے ہم سب کزنز کو بے حد خوف زدہ کر دیا۔ بالخصوص مجھ سے چھوٹا فرحان جو مزاجاً چلبلا ہوا کرتا تھا اس واقعہ کی وجہ سے پورا سال گزرنے کے باوجود اب تک سہا ہوا رہتا ہے۔ دراصل واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہرسال کی طرح گزشتہ سال بھی نویں جماعت کے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد ہم سب کزنز یعنی میرے تایا ریاض احمد اور میرے ابو شیر احمد شہر میں ایک ہی کوشی میں اوپر نیچے کے پورشن میں اپنی اپنی تعلیم کے ساتھ رہائش پذیر ہیں اور ہمارا لیدر گارمنٹس کا کاروبار بھی ساتھ ہی ہے۔ چونکہ تائی جان اور ای آپس میں بہنیں بھی ہیں اس لئے دونوں خاندانوں میں مثالی محبت اور یکجہت ہے جس کے باعث ہم سب کزنز ایک ہی گھر میں بہن بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ تایا جان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جبکہ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ یعنی تین بھائی اور ایک بہن۔

بہر حال فاسل انگریز اس سے فارغ ہوتے ہی ہم سب کزنز چھوٹے ماموں جو ابھی کالج میں زیر تعلیم ہیں، کے ساتھ نور پور گاؤں روانہ ہوئے چونکہ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا اس لئے ہم سب ماموں کے ساتھ بیٹھے سفر کو انجام دے رہے تھے آپس میں کہیں لڑاتے ہوئے جارہے تھے۔ تینوں لڑکیاں یعنی میری بہن شمع اور تابا زاد کی شاد اور روشنی پچھلی سیٹوں پر اپنی باتوں میں مگن تھیں۔ ہم سب پہلے اسکول کے فصول میں اتنے مگن تھے کہ سفر کتنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ جب نور پور گاؤں کی حدود میں گاڑی داخل ہوئی تو ڈرائیور نے ہی ہمیں سربز ہللاتے کھیتوں کی جانب متوجہ کیا۔ صاف ستھری پکی سڑک کے دونوں اطراف گندم کی فصل لہلہا رہی تھی اور سچ پگھڑی نما سڑک سے ہماری گاڑی گزر رہی تھی۔ تب ہی ڈرائیور کے کہنے پر ہم سب بے ساختہ کھڑکیوں کی جانب لپکے اور پردے ہٹا کر باہر کے خوب صورت سربز نگاروں کی دلکشی میں محو ہو گئے تھے۔ گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ سنہری

بالیوں کے ڈھیر جیسے سورج کی روشنی میں سونے کی طرح دک رہے تھے۔ حالانکہ یہ اور ایسے بے شمار دلکش مناظر ہمارے لئے نئے نہیں تھے لیکن قدرت کے ان دلکش فطری مناظر میں کچھ ایسی کشش ہے کہ جتنی بار دیکھو یہ منظر آنکھوں کو پھلے اور دل کو تازگی بخشتے ہیں۔ جیسے صاف ستھری آلودگی سے پاک دھلی شفاف فضاؤں سے روح تراور شفاف ہو جائے۔

بہر حال ڈرائیور کافی تیز رفتاری سے آگے کا سفر طے کر رہا تھا کیونکہ دوپہر سربز تھی اور ہم سب کو بھوک بھی لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم نور پور گاؤں کے داخلی چھانک پر پہنچ چکے تھے۔ وہاں رک کر ماموں نے حلوائی کی دکان سے ڈھیر ساری مٹھائی اور دادی کی پسندیدہ مٹھائی رس ملائی خریدی تھیں۔ پھر گاڑی آگے روانہ ہوئی۔

اگلے آدھے گھنٹے کے بعد ہم ناریل، کیلے، اسروہ، آم اور چنکے کے سربز درختوں میں گھرے بڑے سے باغ کے درمیان بنے سرخ آبنائوں کے بڑے مکان کے سامنے موجود تھے۔ ڈرائیور کے برآمدے میں گاڑی پارک کرتے ہی گھر کی ملازمین نے آکر گاڑی سے سامان اتارنا شروع کیا اور ہم سب نے اندر کی جانب دوڑ لگا دی۔ جہاں دادا، دادی اور گھر کے سب سے پرانے ملازم سلیم چاچا بے چینی سے ہم سب کی آمد کے منتظر تھے۔ ہم سب بڑے ہال میں پہنچے تو ساڑھے چھ فٹ کے لمبے چوڑے دادا اور عظیم دادی نے ہم سب کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر ڈھیروں پیار کیا۔ جبکہ ملازمین ہماری آمد پہلے ہی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ تب دادی جان نے ہم سب کو مطالب کر کے کہا۔

”چلو بچو! پہلے تم لوگ نہادھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ پھر سب مل کر بڑے ہال میں کھانا کھائیں گے۔“ دادی کا با آواز بلند فرمان جاری ہوتا ہے ہی سب کے فرمانی پر دو گرام شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے مجھ سے چھوٹا فرحان بولا۔

”دادی میں نے گڑ والے چاول کھانے ہیں۔“ لہذا پھر حان کو کچھ کرڈیشان اور عمر بھی پیچھے نہیں رہے۔ ”اور دادی، ہمیں کھانے میں آم کی ٹیٹھی چٹنی بھی کھانی ہے۔“

ڈیشان اور عمر کی اسی مصیبت پر میں اور ماموں جی کھول کر بیٹھے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بڑے ہال میں گاؤں کے روایتی کھانوں سے اٹھتی۔ اشتہار انگیز خوشبوؤں نے سب کی بھوک بڑھا دی تھی اور کچھ ضرورت سے زیادہ کھانے کے باعث سب ہی لیلو کی غرض سے سونے مشترکہ کمرے میں آرام کے لئے چلے آئے جبکہ لڑکیاں بھری دوپہر میں اپنی دلچسپ سرگرمی یعنی آم اور پٹیل کے کئے درخت پر ڈالے گئے گھولوں پر جمونے چل دی تھیں۔

شام کو پانچ بجے منہ ہاتھ دھو کر ہم سارے لڑکے ماموں کے ساتھ دادی اور دادا سے اجازت لے کر گاؤں کی نہر کی جانب چل پڑے تھے۔ جہاں ہماری ذاتی زمینیں ہیں چونکہ فصلوں کو پانی دیا جا چکا تھا اس لئے نہر میں پانی زیادہ نہیں تھا مگر ماموں کے منع کرنے پر ہم لڑکوں نے نہر میں نہانے سے گریز کیا۔ الہت کھیتوں میں لگے ٹیڈ ویل کے ٹھنڈے پانی سے صاف خوب لطف اندوز ہوئے۔ وہاں مونج سستی کرتے ہوئے وقت گزرنے کا اندازہ نہیں ہوا اور ساڑھے چھ بجے گلابا سرمنی اندھیرا چلیے ہی ارد گرد کے گھروں سے دھبے تندوروں میں پتی روٹوں کی سوندھی سوندھی ٹھیک اور کھلی فضاء کی ٹھنڈک کے باعث ہلکی خشکی نے ہم سب کو گھر کی جانب چلنے پر مجبور کر دیا۔ لہذا ماموں نے ہم سب لڑکوں کو بلا کے اکٹھا کیا، پھر پیدل ہی گھر کی جانب چل پڑے تھے۔ ابھی ہم گھر سے چند فلاٹک کے فاصلے پر تھے کہ وہاں موجود ایک اندھے کنویں کے پاس ایک کالی بلی کو بیٹھے دیکھا۔ اس بلی کی آنکھیں بڑی عجیب سی تھیں، جیسے کسی جانور کی نہیں بلکہ انسان کی بولتی آنکھیں ہوں۔ میں نے بڑے غور سے رک کر اس بلی کو دیکھا تھا اور ماموں کو بھی

بتایا تھا لیکن جواب ماموں بولے۔ ”دیکھو کاشان! یہ گاؤں ہے اور یہاں اب بھی پرانے زمانے کی تو ہم پرستی کے واقعات کو مانا جاتا ہے۔ بڑے بزرگ کہتے ہیں کالی بلی کا راستہ کاٹ جانا اچھا نہیں ہوتا۔ اس لئے بلی سے کوئی چھیڑ چھاڑ کئے بغیر چپ چاپ یہاں سے نکل چلو۔“ فرحان کے مزاج کو تم جانتے ہو، ہمیں اس کی کسی شرارت سے ہم سب کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔“

ابھی ماموں نے اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ فرحان نے زمین سے پتھر اٹھا کے کنویں کے پاس ٹیٹھی کالی بلی کو مارا جو زمین بلی کی دہائی آنکھ پر چاکے لگا اور وہ زور کی غراہٹ کے ساتھ وہاں سے بھاگ گئی۔ اس سے پہلے کے ماموں، فرحان کی اس حرکت پر سرنش کرتے بلی کی خوف ناک غراہٹ سے سب نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔

گھر پہنچ کر ہم سب راستے کے اس معمولی سے واقعہ کو بھول بھی چکے تھے کیوں کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آگے جا کر یہ معمولی سا واقعہ ہمارے لئے بہت بڑی سبق آموز کہانی بن جائے گا۔

چونکہ گاؤں میں لوگ جلدی سو جاتے ہیں اور سویرے اٹھ بھی جلد جاتے ہیں۔ اس لئے مغرب کے بعد ہی سلیم چاچا نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تھی، لہذا ہم سب معمول کے مطابق ہاتھ منہ دھو کر بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب کی مشترکہ فرمائش تھی کہ آج دادی جان سے کوئی پرانے زمانے کا خوف ناک قصہ یا کہانی سنیں گے۔ لہذا سب نے اندر کمروں میں سونے سے انکار کر دیا تھا اور کچھ اس روز فضا میں جس بھی تھا، لہذا ملازم سے کہہ کر ہم سب کے لئے گھر کے کھلے دالان میں چار پائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ ہم سب دالان میں پاس پاس چار پائیوں پر بیٹھے دادی کے عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے منتظر تھے حالانکہ وہ روز ہی ہمیں باقاعدگی سے پانچوں وقت نماز پڑھنے کی تلقین کرتی تھیں۔ فجر

گوھر آبدار

اللہ تعالیٰ کی عبادت رات کے پہلے صے میں پھول اور پھلے صے میں پھل ہوتی ہے کیوں کہ وہ وقت ہوتا ہے جب دعاؤں کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہیں۔

وہ بد بخت روح جس سے رب تعالیٰ نے منہ موڑ لیا ہو اب وہ خواہ جس قدر افسوس کرے اور غم میں کھلتی رہے رب تعالیٰ کو دوبارہ پاتا اس کے نصیب میں نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ان ہی کو ملتی ہے جو راتوں کو جاگ کر فکر کے ساتھ ذکر الہی کرتے ہیں۔

بے زاری اور بے بسی کے عالم میں ترک دنیا کوئی کمال نہیں اصل کمال تو یہ ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر اللہ سے لولگی جائے۔

(شرف الدین جیلانی - شذوالہ یار)

انہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہئے۔ پھر تجھے ضرورت کیا ہے، ادھر ادھر گھومنے کی۔ آئیں تیرا ذم صاف کروں۔“

دادی اس کالی بلی سے باتیں کر رہی تھیں جیسے کسی انسان سے باتیں کر رہی ہوں۔ میری خوف سے کھلمی بندھ چکی تھی کیونکہ آنا فانا دادی نے دونوں بازو پھیلا کے اس کالی بلی کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا تھا۔ پھر وہیں بیٹھ کر اس کا ذم صاف کرنے لگیں۔ ساتھ ہی اس سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ میں وہیں کھڑا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ دادی

بچنے اس کالی بلی کو پتھر مار کے اچھائیں کیا۔ جیسے وہ کالی بلی حقیقت میں جانور نہیں کوئی اور مخلوق ہو، کیونکہ جس لائق فرحان نے اس کالی بلی کو پتھر مارا تھا جب اسے پلپ تک اگر وہ بلی عام جانور تھی تو اس کا خون خشک ہو جانا چاہئے تھا مگر بلی کی آنکھ سے اب بھی تازہ خون پلپ رہا تھا جس کے باعث مجھے خوف کے ساتھ ساتھ کسی انہونی کا بھی ڈر تھا۔ بہر حال دادی کے چونک کر دیوار کی منڈیر کی جانب دیکھنے اور پھر خاموشی اختیار کر لینے پر مجھے بھی اچھٹا ہوا تھا۔ دادی نے بلی کو دیکھ کر اچھٹا پن کرتاڑ کیوں دیا؟

اگر بلی نہیں نظر آ رہی تھی تو انہیں بھی نظر آئی ہوگی پھر انہوں نے اسے نظر انداز کیوں کیا؟ حالانکہ بلی کی جانب دیکھ کر ان کی آنکھوں میں اچانک اچھٹے کے ساتھ فکر مند بھی امنڈ آئی تھی۔ ان کی خاموشی میں نے دانستہ فرحان کو دادی کے ساتھ سونے کی تاکید کی تھی۔ تب جا کر مجھے اطمینان ہوا تھا۔ جانے کیوں؟ مجھے یقین تھا کہ دادی کی موجودگی میں وہ کالی بلی فرحان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔

بہر حال تھوڑی دیر بعد ہم سب گہری نیند میں چلے گئے، شاید کوئی رات تین بجے کا وقت ہوگا تب اچانک جیاس گھٹنے کی وجہ سے میری آنکھ کھلی گئی۔ میرا اور اموں کا پلنگ ساتھ ساتھ بچھا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میری نظر بے ساختہ دادی کے پلنگ پر پڑی تھی اور وہاں ان کو ن پا کر میں بے اختیار اپنے پلنگ سے چھلانگ لگا کر اتر کر فرحان کو قریب سے صبح سلامت دیکھ کر میری جان میں جان الٹی تو میں دادی کی تلاش میں آگے بڑھا اور جب میری آنکھیں خوف اور حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں جب میں نے دادی کو سامنے سخن کی دیوار کے پاس کھڑے دیکھا۔ میں میکا کی انداز میں چلتا ہوا ان کے کچے پاس پہنچا تو وہ کالی بلی سے کہہ رہی تھیں۔

”یہ تیری آنکھ کو کیا ہوا؟ تیرے ذم سے تو خون پھیر رہا ہے کہ نہیں کسی شرارتی بچے نے تو نہیں مارا۔ دیکھ تو اس کو معاف کر دینا۔ معصوم بچے فرشتے ہوتے ہیں۔“

در اصل وہ کالی بلی مسلسل دیوار سے ٹیک لگائے فرحان کو گھور رہی تھی اور تب ہی میرا ہاتھ کاٹھا تھا۔ فرحان نے ہی اس بلی کو پتھر مار کے ڈھی کیا تھا۔

”نہیں یہ بلی فرحان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔“ میرے دل میں اچانک ہی یہ خیال آیا تھا اس لئے میں نے فوراً سے پتھر سب کو مخاطب کر کے کہا۔

”بہت رات ہوگئی ہے، مجھے تو اس کھلے آسمان کے نیچے سردی لگ رہی ہے، چلو ہم سب اندر چل کے سوتے ہیں۔“ میرے یہ کہنے پر دادی کے بائیں گھٹنے پر سر رکھے ڈیشان اور عمر نے منہ بسور کے مجھے دیکھا۔ وہ قصہ بچ میں ادھورا چھوڑ کر وہاں سے اٹھنے کے لئے تیار نہ تھے اور فرحان بھی ان کا ہموا بن گیا تھا لیکن میرے اصرار پر بے اختیار دادی نے سامنے دیوار کی منڈیر کی جانب دیکھا تھا اور اچھٹے میں رہ گئیں شاید انہوں نے کچھ محسوس کیا تھا۔ ورنہ ہم نے کالی بلی کی وہاں موجودگی کے بارے میں دادی کو نہیں بتایا تھا مگر جانے کیسے انہیں پتہ چل گیا تھا؟ اور انہوں نے بھی میری بات کی تائید کی تھی۔ البتہ ان سب کی ضد کی وجہ سے مجھے اور اموں کو بھی اس رات وہیں چار پائیوں پر سونا پڑنا پڑا تھا لیکن میری چھٹی حس خطرے کا الارم دے رہی تھی اس لئے میں نے ڈیشان، عمر اور فرحان کی ضد کی وجہ سے بالخصوص فرحان کو دادی کے ساتھ ان کے بڑے سے پلنگ پر سونے کے لئے کہا تھا۔ وہ تیرہ برس کا تھا اور چونکہ سب گھر بھر کا لاڈلہ بھی تھا اس لئے جانے کیوں مجھے اس کی حفاظت کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔

جانے اس کالی بلی کی آنکھوں میں کیسی وحشت تھی کہ میں ڈر گیا تھا۔ میں تو ہم پرستی پر یقین نہیں رکھتا لیکن بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے قدرتی طور پر فطری لگاؤ اور محبت کے باعث میرے دل میں فرحان کی فکر بڑھ گئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے فرحان

جانے اس کالی بلی کی آنکھوں میں کیسی وحشت تھی کہ میں ڈر گیا تھا۔ میں تو ہم پرستی پر یقین نہیں رکھتا لیکن بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے قدرتی طور پر فطری لگاؤ اور محبت کے باعث میرے دل میں فرحان کی فکر بڑھ گئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے فرحان

میں باقاعدہ سر پر کھڑے ہو کر سب کو نماز کیلئے اٹھاتی تھیں، جن میں سے میں اور اموں ہی بمشکل اٹھ کر نماز پڑھتے تھے پھر دوبارہ بلی ان کے سو جاتے تھے۔

بہر حال تھوڑی دیر بعد چکن کے سفید براق سوٹ میں دادی اپنی مخصوص لٹھی ہاتھ میں تھامے چلی آئیں۔ تو سب نے مشترکہ ”دادی کہانی سنائیں۔“ کا نعرہ بلند کیا۔ جواباً دادی اپنے پر نور چہرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئیں جبکہ کچھ فاصلے پر اپنے پلنگ پر بیٹھے دادا گرم حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہماری فرمائش سن کر دادی سے مخاطب ہو کر بولے۔

”سنو بھائی گوان! کوئی سچ بچ کی خوف ناک کہانی سن کر بچوں کو پریشان مت کر دینا۔ بس اپنے اور میرے بچپن کا کوئی واقعہ سنا دو۔ ورنہ رات کا وقت ہے، بچے ڈر جائیں گے۔“ جانے دادا جان کی سرزنش میں کیا بات تھی کہ مجھے لگا انہوں نے دانستہ دادی جان کو کسی خاص بات سے روکا ہو کیونکہ دادی نے جواب دینے بغیر بس ہاتھ سے اشارہ کیا تھا اور دادا سمجھ گئے تھے اس لئے پھر سے اپنے شغل میں مگن ہو گئے۔

پھر دادی نے واقعی اپنے بچپن کا واقعہ سنانا شروع کیا جب وہ اپنے پھلوں کے باغ میں بھری دو پہری میں کھو ما کرتے تھے اور کچے امرود اور کیریاں توڑا کرتے تھے۔ ابھی وہ ایسا ہی ایک واقعہ سن رہی تھیں کہ میری نظر والان کی منڈیر پر پیشی کالی بلی پر پڑی۔

چاند کی روشنی میں وہ بلی مجھے صاف نظر آ رہی تھی اور بخورد کیسے پر میں چونکا بلکہ اچھل پڑا تھا۔ یہ وہی بلی تھی جو آج نہر سے واپسی پر راستے میں کنویں کے پاس موجود تھی اور جسے فرحان نے پتھر مارا تھا۔ اس بلی کی آنکھ سے ابھی تک سرخ سرخ خون بہہ رہا تھا جسے دیکھ کر بے اختیار خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ساتھ بیٹھے ماموں کو کنبی مار کے دیوار کی منڈیر پر پیشی کالی بلی کی جانب اشارہ کیا تب ماموں بھی بری طرح چونکے کیونکہ میری طرح انہوں نے بھی اس کالی بلی میں غیر معمولی پراسراریت محسوس کی تھی۔

بار بار اسے ایک ہی تاکید کر رہی تھیں کہ ”دیکھ شامو! جس بچے نے بھی یہ شرارت کی ہے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا اسے کیا معلوم کہ تو کون ہے؟ اور ہاں شہر سے بچے آئے ہوئے ہیں۔ جب تک وہ سب یہاں ہیں، تو یہاں موت آنا، وہ بے چارے خوف زدہ ہو جائیں گے۔“

دادی اپنی بات مکمل کر کے کالی بلی کو دوبارہ دیوار کی منڈیر پر بیٹھا کے کہہ رہی تھیں۔ ”اب تو اپنے ٹھکانے پر جا۔ صبح ہونے والی ہے، کسی بچے کی آنکھ کھل گئی تو وہ طرح طرح کے سوال کریں گے۔“

دادی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور جانے کہاں سے میرے اندر راقی طاقت آئی تھی کہ میں اٹنے پاؤں وہاں سے تیزی سے آ کر واپس اپنے پیگ پر لیٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد واقعی صبح ہونے والی تھی کیوں کہ فخر کی نماز کے لئے دادی وضو کرنے اندر جا چکی تھیں۔ مگر میری تیناڑ بجی تھی۔ مجھے فرحان کی فکر ستا رہی تھی کیونکہ دادی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کالی بلی (جو کہ اصل میں پراسرار مخلوق تھی) اس کو فرحان نے پتھر مار کے ڈھکی کیا ہے۔ تب ہی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ مجھے دادی کو بتادینا چاہئے کہ بلی کو فرحان نے پتھر مار کے ڈھکی کیا ہے۔

دراصل میرے دل میں اب بھی یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ پراسرار مخلوق فرحان کو نقصان نہ پہنچائے۔ اگرچہ دادی نے اس کالی بلی کو تاکید کی تھی کہ وہ اس انتہائی بچے کو معاف کر دے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے لیکن میرے دل کو بے چینی لاحق تھی۔ اس لئے صبح ہوتے ہی میں نے دادی کو جالیا۔ وہ فجر کی نماز اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں ان کے فارغ ہوتے ہی میں نے ان سے سوال کر ڈالا۔

”دادی! رات آپ اس کالی بلی سے جو باتیں کر رہی تھیں وہ میں نے سن لی تھیں۔ دراصل میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کالی بلی کو فرحان نے پتھر

مار کر ڈھکی کیا تھا۔ پہلے میں بھی اسے عام جانور سمجھا تھا لیکن کل رات آپ کو اس سے باتیں کرتے سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی عام بلی نہیں بلکہ کوئی پراسرار مخلوق ہے آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟ کہیں وہ فرحان کو نقصان نہ پہنچا دے۔ پلیز آپ مجھے بتائیں آخر یہ ماجرا کیا ہے؟“

میرے اصرار پر مجبوراً دادی کو اس کالی بلی کی حقیقت بتانی پڑی۔

”کاشان جسے تم بلی سمجھ رہے ہو اور جسے فرحان نے پتھر مار کے اس کی ایک آنکھ ضائع کر دی ہے وہ دراصل ایک ہندو بچے کی آتما ہے۔ شہر کے بڑے گھسے لوگ جن، بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے ہیں، لیکن یہ سچ ہے۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہوتے ہیں کچھ ٹیک اور کچھ شرارتی، مگر یہ ہندو بچے ہمارے گھر کا وفادار ملازم تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے گھر کے دوسرے بچوں کی طرح سمجھا۔ اسے ملازم سمجھ کر بدسلوکی یا تعزیریں نہیں کی۔ اسی لئے وہ مجھ سے زیادہ قریب تھا۔ ایک رات وہ گاؤں میں لگے میلے سے واپس آ رہا تھا، راستے میں کسی چور لیرے نے اسے لوٹ لیا اور اس کے ہاتھ سے گھڑی میچن کر اسے زندہ کنویں میں پھینک کر فرار ہو گیا۔ جب وہ گھر واپس نہ لوٹا تو تمہارے دادا نے چاروں طرف ملازمین کو ڈوڑا کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن واپس ہو کے واپس آ گئے۔“

تب چاروں بعد گھر سے قریب اندھے کنویں سے اس کی مٹی سڑی لاش ملی۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب تمہارے ابو اور چچا بچے تھے۔ وہ ہندو بچہ ان ہی کے ساتھ پلا بڑھا تھا۔ اس کی بے بسی کی موت کا ہم سب کو بہت صدمہ تھا، بے چارہ اندھے کنویں میں دن رات زندہ پڑا جانے کب تک زندہ رہا ہوگا پھر جا کے بھوک پیاس اور زخموں سے چور بدن سے روح نکلی ہوگی۔ چونکہ ہندو دھرم میں دوسرے جنم کا عقیدہ پختہ ہوتا ہے اس لئے گاؤں کے سب ہی لوگوں کا اس کی ناکہانی موت پر کہنا تھا کہ یہ بچہ دوسرا جنم لے کر اپنے

اصل سے اپنی موت کا بدلہ ضرور لے گا اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ کچھ عرصے بعد گاؤں کے چانک پرایک انجان شخص کی لاش پڑی بلی، جس کی آنکھیں کسی جانور نے پھول سے نکالی ہوئی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شخص کسی دوسرے گاؤں کا چور تھا۔ چونکہ دوسرے جنم میں اس نے بلی کی شکل لی تھی اس لئے تب ہی اپنی موت کے کچھ عرصے بعد سے اس کالی بلی نے مستقل گھر سے اس گھر میں ڈیرا ڈال لیا جسے تم کالی بلی سمجھ رہے ہو۔

”دراصل یہ وہی ہندو بچہ ہے۔ وہ تمہیں بلی نظر آتی ہے مگر میں اسے اسی انسانی روپ میں دیکھتی ہوں جس میں وہ میرے گھر میں پلا بڑھا تھا۔ وہ صرف ایک انسانی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ شاید میری محبت اور انسانی ہمدردی کے صلے میں قدرت کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ اب سب کو ایک جانور بلی کی شکل میں دکھائی دیتا ہے لیکن میری آنکھیں اسے اپنے شامو کے روپ میں دیکھتی ہیں۔ بس یہی حقیقت ہے اس کالی بلی کی، لیکن فرحان کو اسے ارنا نہیں چاہئے تھا کیا ہوا جو وہ جانور کی شکل میں نظر آتا ہے یہ تو اللہ کی مخلوق! اور اللہ کی جگہ رہا ان مخلوق کو کسی جان بوجھ کر تک نہیں کرنا چاہئے۔ کیا پتہ؟ کوئی دوسری مخلوق کے روپ میں موجود ہو۔“

تب میں نے فکرمند لہجے میں جوابا کہا تھا۔ ”لیکن دادی اب فرحان کو وہ مخلوق نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ پلیز آپ کچھ کریں مجھے فرحان کی بہت فکر ہے۔“ میری پریشان صورت دیکھ کر دادی بھی فکرمند ہو گئی تھیں اور فوراً اٹھ کر میرے ساتھ باہر دالان کی چاب دوڑی تھیں مگر شاید ہماری باتوں میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ جب ہم وہاں دالان میں پہنچے تو فرحان دادی کے پیگ سے غائب تھا۔ خوف سے میری چیخ نکلی تھی اور انجانے دکھ نے میری آنکھیں اٹھکبار کر دی تھیں۔

میری چیخ کی آواز سے سب اٹھ گئے اور آٹا ٹاٹا

فرحان کی کشمکش کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ ہم سب اسی وقت فرحان کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ تب اندھے کنویں کے قریب جہاں پرفران نے کالی بلی کو بیٹھے دیکھ کر پتھر مارا تھا۔ وہیں پرفران بے ہوشی کی حالت میں ملا۔ جب ماموں نے اس کی پشت پکڑ کے سیدھا کیا تو ہم سب کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں کیونکہ فرحان کی آنکھیں نکال لی گئیں تھیں اور اس کے خالی دیدوں کی جگہ گڑھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اور ماموں نے فرحان کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور اسی وقت اسے لے کر گاؤں میں شہر کے اسپتال پہنچے تھے۔ ڈاکٹر کی بروقت فریڈنٹ سے فرحان کی جان بچ گئی لیکن وہ اپنی دونوں آنکھیں گنوا بیٹھا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہو چکا تھا۔ بس ایک معمولی سی شرارت نے فرحان کو ہستی سکرانی دنیا کو اندھیروں میں بدل دیا تھا۔ اس دکھ اور صدمے نے ہم سب کو ادھوا کر دیا تھا۔ مگر دادی نے پڑ پڑتے کی محبت میں اس کالی بلی کو جو حقیقت میں وہ ہندو بچہ تھا جسے اپنے ہاتھوں سے دادی نے پال پوس کے بڑا کیا تھا ہمیشہ کے لئے گھر بدر کر دیا تھا اور اپنی اس سزا کے بعد وہ کالی بلی پھر بھی اس گھر تو دور گاؤں میں بھی دکھائی نہیں دی۔ اس نے فرحان سے اس کی شرارت کا بدلہ تو لے لیا تھا لیکن دادی کی محبت و شفقت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

بس تب سے خاندان کے سارے بچوں نے کسی بھی بے زبان جانور کو مارنے یا تکلیف پہنچانے سے گریز کیا۔

اگرچہ فرحان کی ذات کا اتنا بڑا نقصان ہو چکا تھا مگر اس مخلوق نے اس کی جان بخش دی تھی۔ ہم سب کے لئے یہی کافی تھا۔ البتہ اس واقعہ کے بعد سے اس بلی کو سب نے پراسرار خونی بلی کے نام سے یاد رکھا۔



محبتیں شمار کرنا

محمد قاسم رحمان - ہری پور

حقیقت سے چشم پوشی انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے اس لفظ کو احاطے کرتی اپنی نوعیت کی دل سے محو نہ ہونے والی برسوں یاد رہنے والی حقیقی کہانی

کیا یہ حقیقت ہے کہ عشق و محبت میں پڑ کر انسان کہیں کا نہیں رہتا، سبق آموز کہانی



کے لئے ٹشوے رہا تھا۔
”رونا بند کرو فرمنا بس کرو کیا رونے سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا؟“

فرماتا بولی۔ ”نہم لڑکیاں تو رونے کے سوا کچھ بھی کیا سکتی ہیں ایک عورت ازل سے قربان ہی تو ہوتی ہوئی آتی ہے۔ مردوں کی اتنا کی تسکین کے لئے عورت کی قربانی ہی اس دنیا کا دستور ہے خواہ وہ مرد بھائی کے روپ میں، شوہر کے روپ میں یا باپ کے روپ میں۔ ہمارے معاشرہ میں عورت کی کوئی چاہ نہیں ہو سکتی۔ میرے باپا صرف اس لئے ہماری شادی نہیں کروانا چاہتے کہ وہ اپنے دوستوں اور شہر داروں کو کیا منہ دکھائیں گے کہ میں نے اپنی اکلوتی بیٹی ایک بڈل کلاس انسان سے بیاہ دی۔ ایسے میں، وکرم تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ کیا مجھے رونے کا حق بھی حاصل نہیں ہے؟“

وکرم بولا۔ ”فرماتا بہت آسان ہوتا ہے لیکن چیزوں کو فیس کرنا اتنا ہی مشکل۔ لیکن یاد رکھو اس دنیا میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ ہو۔۔۔۔۔ تم پریشان نہ ہوا اپنے آپ کو پرسکون رکھو اور دماغ کو ٹھنڈا رکھ کر یہ سوچو کہ اس مسئلہ کا کیا حل نکل سکتا ہے۔ کیسے

فرماتا بولی۔
فارگاڈ سیک فرماتا مت رو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے تمہارے رونے سے پلیز مجھے بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟ وکرم کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔

”وکرم وہ باپا میری شادی اپنے دوست کے سوشائٹ سے کروانا چاہتے ہیں وہ کی صورت میں تم دونوں کو ایک نہیں ہونے دیں گے وکرم میری کچھ نہیں کھائیں آ رہا کہ میں کیا کروں کدھر جاؤں میں مرجاؤں گی وکرم میں مرجاؤں گی۔“ فرماتا روتے روتے بولتی چلی گئی۔

”شانت ہو جاؤ فرماتا، اور ابھی اور اسی وقت مجھ سے ملو۔“

”اوکے میں بھی تم سے ملنا چاہتی ہوں مجھے کہاں آنا ہوگا؟“

”ٹھیک ہے پھر وہیں آ جاؤ اسی ہوٹل میں جہاں ہم ملے تھے۔“

☆ ☆ ☆

وکرم اور فرماتا ایک دوسرے کے آٹنے سائے بن گئے تھے۔ فرماتا کی آنکھوں سے آنسو تھننے کا نام نہیں لے رہے تھے اور وکرم، اسے آنسو صاف کرنے

لگتا ہے۔“

فرماتا نے آگے بڑھ کر ارجن کمار کی کلائی پکڑ لی۔ ”باپا آپ ایک مرتبہ تو وکرم سے مل لیں آئی ایم شیور کہ وہ آپ کو اچھا لگے گا۔“

ارجن کمار نے غصے سے فرماتا کی طرف دیکھا اور اپنی کلائی جھٹک کر کمرے سے نکل گئے۔

فرماتا زمین پر بیٹھ گئی اب وہ بچکیوں کے ساتھ درد رہی تھی اس کا دل جل رہا تھا۔۔۔۔۔ روح گھائل ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ نجانے کتنی دیر تک وہ اپنی اجڑتی محبت کا سوگ مناتی رہی وہ خود اندازہ نہ کر پاتی لیکن جب اس کا موبائل رنگ کر لے لگا تب وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔ خود کو سنبھالتی ہوئی وہ ٹیبل تک گئی اور موبائل اٹھایا۔ اسکرین پر وکرم کا نمبر جکمار ہاتھ فرماتا نے کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو فرماتا تم نے اپنے باپا سے بات کی۔۔۔۔۔ وہ مان گئے نا۔“ دوسری طرف سے وکرم بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔

فرماتا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بولے۔ کیسے بولے کیسے بتائے اس کو، اسے باپ کے شکد لاٹا فیصلے کے بارے میں۔۔۔۔۔ فرماتا مضبوط نہ کر پاتی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کیا ہو فرماتا۔۔۔۔۔ تم کیوں رو رہی ہو۔ مجھے بتاؤ میں پریشان ہو رہا ہوں؟“

”باپا آپ جانتے ہیں نہ کہ میں وکرم سے کتنا پیار کرتی ہوں اس کے باوجود آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں سوشائٹ سے شادی کر لوں۔۔۔۔۔ کیوں کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ ایسا۔۔۔۔۔ باپا میں آپ کی بیٹی ہوں آپ کو اپنی بیٹی کی خوشی سے زیادہ اپنے اسٹیٹس کی پرواہ ہے۔“ فرماتا اپنی بات مکمل کر کے رونے لگی۔

ارجن کمار، اپنی بیٹی کو دیکھنے لگے جس کی آنکھوں سے بدستور آنسو بہہ رہے تھے وہ بولے۔ ”بیٹا تم میری بیٹی ہی ہو اسی لئے تمہاری شادی وکرم سے نہیں کروانا چاہتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم کبھی بھی وکرم کے ساتھ خوش نہ رہو پاؤ گی۔۔۔۔۔ تم جس آسودگی میں بی بی بڑھی ہو وہ خوشحالی، وہ آسودگی تمہیں کبھی بھی وہ وکرم نہیں دے پائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بہت کم حیثیت کا ہے میں سماج کو کیا بتاؤں گا کہ میرا داماد نہیں ہزار روپے ماہوار کما تا ہے۔“

”آپ کو سماج کی پرواہ اپنی بیٹی کی کوئی لگر نہیں ہے آپ کی بیٹی اس میں ہزار روپے کمانے والے عام سے انسان پر مرمی ہے اسے اپنا بھگوان مانتی ہے اور آپ۔۔۔۔۔“ فرماتا بات کر رہی تھی کہ ارجن کمار زور سے دہاڑے۔

”بس کرو لڑکی تمہیں پیار کی زبان سمجھ میں نہیں آتی کیسی بے حیا ہو گئی ہو کیا تم یہ نہیں جانتی کہ تمہارے سامنے جو انسان کھڑا ہے وہ رشتے میں تمہارا باپ

تمہارے بابا کو مٹایا جاسکتا ہے۔“

”دکرم میں بابا کا اچھی طرح جانتی ہوں وہ جب ایک بات کر دیتے ہیں تو اس پر قائم رہتے ہیں کسی صورت میں پیچھے نہیں ہٹتے۔“ نمرتا نے کہا اب وہ پہلے کی بانہست تھوڑی پرسکون تھی۔

”اگر تمہارے بابا ایک بات کر کے اس پر قائم رہتے ہیں تو تم بھی انہی کی بیٹی ہو۔ ضد پراڑ جاؤ وہ تمہاری بات ضرور مانیں گے۔“ Lets hope for the best

لیکن دکرم میں اپنے بابا سے بغاوت نہیں کر سکتی میں بہت پیار کرتی ہوں ان سے..... بہت چاہتی ہوں انہیں..... اپنی محبت مجھے اپنے بابا کی شفقت سے زیادہ عزیز نہیں ہے..... آج میں ان سے آل ریڈی بہت Miss behave کر چکی ہوں اور بہت شرمندہ ہوں.....“ نمرتا نے کہا۔

دکرم بولا۔ ”نمرتا تم اپنے بابا سے بغاوت نہیں کر رہی ہو تمہیں ہر انسان کی طرح خوش رہنے کا پورا حق حاصل ہے اور تمہیں وہ ساری خوشیاں میں ہی دے سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر تمہارے بابا ہم سے ناراض رہیں لیکن وہ بعد میں تمہیں خوش دیکھ کر مان جائیں گے کیونکہ تمہاری خوشی میں ہی ان کی خوشی ہے۔ لیکن اب اگر تم ان کے لئے سوشائٹ سے شادی کر لیتی ہو تو یاد رکھو تم اس کے ساتھ خوش نہ رہو یاؤ گی اور بعد میں تمہارے باپ بھی تمہاری حالت دیکھ کر جلتے کڑھتے رہیں گے۔“

نمرتا نے کہا۔ ”دکرم تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... میں صرف تمہارے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہوں۔ تم ہی مجھے خوش رکھ سکتے ہو۔ میں آج جا کے بابا کو دوبارہ کنوینس کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

نمرتا بھگوان سے بھی نراش نہیں ہونا لے شور پراپنا یقین قائم رکھو سب اچھا ہوگا۔“

☆.....☆.....☆

ارجن کمار اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی پر بہت غصے

تھے۔ بہت دکھ ہو رہا تھا ان کو..... ماضی یاد آرہا تھا..... جب ان کی بیٹی نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھیں گے۔

ارجن کمار ایک خاندانی رئیس تھے..... ان کی شادی ان کے ماں باپ کی مرضی سے چلتا دیوی سے ہوئی تھی..... چلتا واپسی کسی دیوی سے کم نہ تھی..... اس نے ارجن کمار کی زندگی خوشیوں سے بھری۔

شادی کے دو سال بعد جب رچنا نے اپنے بچے کو ایک پیاری سے گڑیا کا تحفہ دیا تو اس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی..... ابھی نمرتا دو برس کی ہی تھی کہ یہ انکشاف ہوا کہ رچنا کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو گئی ہے..... اور کینسر تھا آخری اسٹیج پر..... رچنا کو امریکہ لے جایا گیا علاج کے لئے..... مگر شاید اوپر والے نے رچنا کی موت لکھ دی تھی..... رچنا کی موت کے بعد ارجن کمار کے ماں باپ نے ان پر شادی کے لئے بہت زور ڈالا مگر وہ نہ مانے اور یوں نمرتا ماں کے بغیر ہی پروان چڑھتی رہی۔

آج ارجن کمار کو نمرتا پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ ایک لڑکے کی خاطر اس نے اپنے باپ سے بدتمیزی کی تھی..... آفس میں بھی ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی ساری فائزر کلوز کی اور چائے پینے کے لئے قریبی ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔

ارجن کمار نے ریسٹورنٹ کا دواڑہ کھولا اور سامنے کا نظارہ دیکھ کر ان کے طوطے اڑ گئے وہ حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ سامنے نمرتا، ایک لڑکے کے ساتھ کارڈوالے ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی..... مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سو جی ہوئی تھی اور چہرہ متورم تھا..... مگر پھر بھی وہ بدستور رونے جاری تھی..... اس کے ساتھ والا لڑکا اسے خاموش کروانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بھی کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔

ارجن کمار نے ایک آخری نگاہ اپنی بیٹی کے چہرے پر ڈالی اور ایک لمبے میں فیصلہ کر لیا کہ انہوں نے کیا کرتا ہے۔

☆.....☆.....☆

تمہا جیٹا تو سیکھ لیا ہم نے

پر خوش بھی نہ رہا میں گے

تیری دوری تو پھر بھی سہ لیتا ہے دل

پر تیری محبت کے بغیر نہ جی بائیں گے

نمرتا اپنے کمرے میں مسلسل ٹھہل رہی تھی۔

اور اپنے بابا کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے طے

کر لیا تھا کہ آج وہ انہیں منا کر ہی رہے گی..... تھوڑی

دیر میں اس کا انتظار ختم ہو گیا۔ ارجن کمار کے کار کے

ہارن کی آواز سنائی دی۔ نمرتا نے کھڑکی سے جھانکا

چوکیدار دروازہ کھول رہا تھا..... نمرتا کمرے سے باہر نکل

آئی..... سامنے سے ارجن کمار آ رہے تھے۔

”کیسی ہے میری پیاری سی گڑیا.....“ ارجن کمار

نے پیار سے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں بابا آپ جلدی آ گئے آج۔“

”ہاں جلدی آ گیا ہوں..... کیونکہ میں

چاہتا ہوں کہ آج ہم کچھ مہانوں کو انوائٹ کریں کیا نام

بتایا تھا تم نے اس لڑکے کا..... ہاں دکرم..... دکرم کے

گھر والوں کو بلاؤ..... میں ان سے تمہارے رشتے کی

بات کروں گا۔“

”جج بابا.....“ نمرتا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں

آ رہا تھا۔

”جی میری جان..... تم کوئی خواہش کرو اور میں

اسے پورا نہ کروں..... بھلا یہ ممکن ہے؟“

ارجن کمار نے نمرتا اور دکرم کی گفتگو کی ڈیٹ فکس

کر دی تھی..... لیکن اب خود بہت پریشان تھے..... بیٹی

کی خوشی کے لئے مان تو گئے تھے لیکن وہ اس رشتے سے

مطمئن نہیں تھے۔

انہیں اپنے دوست شوریرکھنے کی طرف سے بھی

پریشانی لاحق تھی..... کہ اب اپنے شوریرکھنے کو کیسے منہ

دکھائیں گے۔ کیسے انہیں اپنی بیٹی کی گفتگو پر بلائیں

گے..... لیکن ان سے بات تو کر رہی تھی کیونکہ ان کے پاس

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ارجن کمار ٹیس پر ٹپکتے ہوئے اس بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ان کا سیل فون رنگ کرنے لگا..... ارجن نے ٹراؤڈر کی پاکٹ سے سیل فون نکالا اسکرین پر کوئی ان ہون نمبر تھا۔

”ہیلو جی کون.....؟“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”یار میں ہوں

شوریرکھنے میں اپنے بیٹے کے ساتھ اٹھ آیا گیا ہوں.....

جلدی سے انٹر پورٹ آ جا..... ہمیں لینے کے لئے۔“

”کیا شورے تم کب آئے.....“ ارجن کمار کی

حیرت دیدنی تھی۔

”اوکے فائن میں آ رہا ہوں..... تمہیں لینے

کے لئے۔“

☆.....☆.....☆

”کیا بکواس کر رہے ہو تم، ہوش میں تو ہو..... اسنے سالوں پہلے کی گفتگو کو کیسے تم توڑ سکتے ہو..... تم نے ہماری برسوں پرانی دوستی کا لحاظ بھی نہ کیا۔“ شوریرکھنے حقیقت سن کر دنگ رہ گئے تھے اور اب اونچی آواز میں چلا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا سوشائٹ بھی آیا تھا..... لیکن ان کی بیٹی امریکہ سے نہ آئی تھی۔

نمرتا ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر کھڑی ساری گفتگو سن رہی تھی۔

”یار میں اپنی بیٹی کے آگے بے بس ہو گیا.....

کچھ نہ کر پایا..... نمرتا اس لڑکے سے بہت محبت کرتی ہے

کیسے میں اس کی محبت کو اس سے جدا کر دیتا..... یار میری

غلطی ہے مجھے معاف کر دو.....“ ارجن کمار نے اپنے

دوست کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

نمرتا یہ سب نہ دیکھ پائی اور اپنے کمرے میں

میں آ گئی۔

”مکمل آپ پلیز ہاتھ مت جوڑیں..... آپ

چاہتے ہیں نہ کہ نمرتا کی شادی مجھ سے ہو..... اس کی

شادی مجھ سے ہی ہوگی..... وہ بھی نمرتا کی اپنی مرضی

سے..... وہ خود کرم سے گفتگو نہیں کرے گی۔“ سوشائٹ

اب تک خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

لیکن جب اس نے بات کی..... تو ارجن کما اور شور برکھنہ میرا رہ گئے۔

”کیا مطلب.....؟ یہ کیسے ممکن ہے۔“ ارجن کمار نے تذبذب میں سوال کیا۔

”ممکن ہے..... اور بیک میچ سے ممکن ہے۔“ سو شانت نے کہا۔

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کالا جادو؟“

”تم نے کالا جادو کہاں سے سیکھا؟“ شریر نے حیرانی سے پوچھا۔

”ریلیکس انکل اینڈ پاپا..... میں آپ کو ساری بات تفصیل سے بتاتا ہوں اس بارے میں۔“

☆.....☆.....☆

”اس روز میں بہت ہی خوش تھا۔ میری خوشی کی وجہ یہ تھی کہ میں نے قمار خانے میں جوا کھیلا تھا اور ہر بازی میں جیت میری ہی ہوتی رہی تھی۔ جب میں قمار خانے سے نکلا تو میرے پاس پانچ سو ڈالرز تھے۔ اس خوشی کو تسلیم کرنے کے لئے میں ایک پار میں چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا وہ لڑکی بہت حسین تھی اس نے گرین شرٹ کے نیچے سفید پھولوں والا اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بہت ہی زیادہ نشے میں تھی..... وہ لڑکی میرے پاس آ گئی اور اس نے جھومتے جھومتے مجھ سے پوچھا۔“

”اے مسٹر..... کیا تم مجھے میرے اپارٹمنٹ تک ڈراپ کر دو گے۔“

”ایسی حسین ختی کی قربت کون بے وقوف نہیں چاہے گا۔“ میں نے حامی بھر لی۔ اور اسے لے کر باہر اپنی کار میں آ گیا..... اس نے اپنے گھر اپارٹمنٹ کا ایڈریس مجھے سمجھایا اور میں اسے ڈراپ کرنے اس کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ اس نے اپنا نام روڈی بتایا تھا۔

اپنی دین جب میں اسے چھوڑ کر واپس آ رہا تھا کہ اس نے ایک لفافہ میری جانب بڑھایا اور کہا کہ ”تمہارا انعام ہے۔“ پہلے تو میں نہ مانا مگر جب اس نے فورس کیا تو مجھے ماننا پڑا۔

بعد میں جب میں نے لفافہ دیکھا تو اس میں ایک یو ایس بی ٹی تھی۔ اور ایک نوٹ ہوا کاغذ تھا..... اس کاغذ کی تحریر کچھ یوں تھی۔

”ڈیئر سو شانت تم ہرگز یہ جاننے کی کوشش نہ کرنا کہ میں کون ہوں؟ ہاں تمہیں اتنا بتا دیتی ہوں کہ ہم شیطان کے چیلے ہیں۔ شیطانیت کے پیروکار ہیں..... تمہاری زندگی میں ایک موڑ ایسا آنے والا ہے کہ تمہاری شیطانیت کی ضرورت پڑے گی۔ اس یو ایس بی ٹی کو سنبھال کر رکھنا..... مستقبل میں یہ تمہارے کام آئے گی۔“

”Wish you all the best“

میں نے وہ منجھیک طرف پھینک دیا اور یو ایس بی ٹی چیک کی اس میں ٹو ٹکے اور غمگیناں تھیں۔

پھر میں روزی کے اپارٹمنٹ میں گیا لیکن اب وہاں وہ اپارٹمنٹ تو کیا..... وہ بلڈنگ ہی سرے سے غائب تھی۔

”اس وقت سے یہ یو ایس بی ٹی میرے پاس ہے۔“

”تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہمیں کالے علم کے ذریعے غمگیناں من کو بدلنا ہوگا۔“ ارجن کمار نے سوال کیا۔

”ہاں انکل کیونکہ اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔ غمگیناں میری محبت ہے میں اسے کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ درم نہر تا کو کبھی خوش نہ رکھ پائے گا۔“ سو شانت نے کہا۔

شور برکھنہ بولے۔ ”لیکن یہ غلط ہے۔ کالا علم کرنا باپ ہے اور میں تم دونوں کو یہ باپ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“

”انکل پہلے آپ مجھے بتائیں کہ آپ کی کیا رائے ہے۔“ سو شانت نے اپنے باپ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ارجن کمار سے پوچھا۔

وہ بولے۔ ”میں تو شروع سے ہی درم کے ساتھ اپنی انگوٹھی بیٹی کا رشتہ نہیں جوڑنا چاہتا تھا کیونکہ وہ

ہمارے ایشیٹس کا نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کی خوشی کے لئے مان تو کیا کیونکہ میں نے دیکھا تھا اسے ریٹورنٹ میں اس وکرم کے ساتھ..... اس وقت وہ زارو قطار رو رہی تھی اور مجھ سے اس کا رونا نہ دیکھا گیا۔ میں مان گیا لیکن اب بچے تار ہوں.....“

”اب اگر کوئی بھی راستہ ہے اس رشتے کو توڑنے کے لئے تو میں رضامند ہوں اس کے لئے..... خواہ وہ راستہ کالے جادو کا ہی کیوں نہ ہو۔“

شور برکھنہ بولے۔ ”ارجن تو پاگل ہو گیا ہے اوپر والے کے شراب سے ڈر۔“

”دیکھیں بابا اصل بات یہ ہے کہ وکرم، صرف دولت حاصل کرنے کے لئے غمگیناں سے شادی کر رہا ہے۔ غمگیناں اسے کوئی پیار و یار نہیں ہے غمگیناں کی زندگی کا سوال ہے..... اگر ہم کسی کی زندگی بچانے کے لئے کالا علم استعمال کریں تو اس میں برائی ہی کیا ہے؟“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو.....“ شور برکھنہ نے کہا۔ اور تینوں اس بات کے لئے رضامند ہو گئے۔

”شیطان ابھی بہت خوش ہوگا آج..... کیونکہ تین اور انسانوں کو ہسٹل کے میں کامیاب تھا۔“

☆.....☆.....☆

کمرے کا ماحول بہت بھیاں تھا..... کمرے کے چاروں اطراف میں کالی ماں کی خوف ناک بت رکھے ہوئے تھے..... شور برکھنہ، ارجن کمار اور سو شانت آلتی باقی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے آس پاس صندوق سے دائرے بنا رکھے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹا سے ہون رکھا ہوا تھا جس میں آگ روشن تھی سو شانت اونچی آواز میں متر پڑھ رہا تھا اور ہون میں کالی مرچیں ڈال رہا تھا۔

تموڑی ہی دیر میں ان کا عمل ختم ہوا اور ہون کی آگ اپنے آپ بجھ گئی۔

سو شانت نے متر پڑھنے بند کر دیے اور ہون کی طرف دیکھا..... اس نے ہون میں سے ایک چنگی راکھ نکالی اور اس راکھ کو صندوق کی ڈبیا میں کس کر دیا

اور بولا۔

”اب ہمیں یہ راکھ غمگیناں کے جسم کے ساتھ لگانا ہوگی..... اور اس کے بعد غمگیناں وکرم سے نفرت کرنے لگے گی۔“

”ٹھیک ہے..... کشوری میری بہت ہی پرانی اور وفادار ملازمہ ہے میں یہ ڈبیا اس کو دے دیتا ہوں۔ اور یہ غمگیناں کے جسم کے ساتھ لگا دے گی۔“ ارجن کمار نے کہا۔

سو شانت اور شور برکھنہ نے اثبات میں سر ہلادیا اور یوں ارجن کمار نے اپنی ملازمہ سے مدد لے کر اپنے کالے کر تو کو مکمل کر لیا۔

☆.....☆.....☆

تجھ سے ہار جاؤں توجیت جاتا ہوں

تیری خوشیاں عزیز ہیں..... اتنی

آج غمگیناں اور وکرم کی سگائی تھی..... پورے گھر کو بہت ہی اچھے طریقے سے ڈیکوریت کیا گیا تھا..... وکرم بہت خوش تھا..... لیکن غمگیناں کی ماں باپ کی طرح اس کی ماں گامخری دیوی بھی خوش نہ تھی..... صرف اور صرف اپنے بیٹے کی خوشی کے لئے مان گئی تھیں۔

سگائی کا وقت ہو گیا تھا..... گامخری دیوی نے ارجن کمار سے پوچھا۔

”بھائی صاحب آپ کی صاحبزادی کہاں رہ گئی کیا وہ نہیں جانتی کہ سگائی کا مہورت ہو گیا ہے۔“

”بس بہن جی تیار ہو رہی ہے..... آپ تو جانتی ہی ہیں کہ لڑکیاں ایسے موقعوں پر کتنا سختی سمجھتی ہیں تیار ہو کر بس آنے ہی والی ہوگی۔“ ارجن کمار نے کہا اور پھر اپنے آپ سے بولے۔

”ہاں بس ابھی آئے گی میری بیٹی اور تم ددکے کے لوگوں کو ان کی اوقات یاد دلادے گی۔“

گامخری دیوی سخت سے بولی۔ ”پتا نہیں ایسا کیا بچا سنو رہا ہے۔“

”آگئی غمگیناں وہ دیکھیں۔“ سو شانت نے کہا

اور بیڑیوں کی طرف اشارہ کیا جہاں سے نمرتا بچے
اتر رہی تھی لیکن وہ تیار نہ تھی بالکل سہل سے چلے میں تھی۔
”نمرتا کیا ہوا ہے؟ تم بدلی بدلی سے دیکھا کی
دے رہی ہو؟“ نمرتا کے اندر کے بدلاؤ کو سب سے
پہلے وکرم نے محسوس کیا۔
”اور تم تیار بھی نہیں ہوئی ہو۔ کیا تم جانتی نہیں
کہ آج ہماری سگائی ہے۔ ہماری انجمن کا فٹنشن چل
رہا ہے۔“

نمرتا نے کہا۔ ”ماں میری سگائی تھی۔ لیکن
ہے نہیں۔ تھی۔ مجھے کل رات اس بات کا اندازہ
ہو گیا کہ تمہیں مجھ سے کوئی محبت و محبت نہیں ہے بس تم
صرف دولت کے حصول کے لئے مجھ سے شادی کرنا
چاہتے ہو۔“

وکرم کی آنکھیں آنسوؤں سے لہا لہا بھر گئی۔
”نمرتا میں بیگوان کی سونگد کھا کر کہتا ہوں کہ
میرے من میں کوئی لالچ نہیں ہے۔ میں لالچی نہیں
ہوں میرے من میں صرف تمہارے لئے پریم۔“

”بس ختم کر دیو یہ پیار کا بھاشن۔ میں نہیں
سننا چاہتی تمہارے من سے پیار کی کوئی بات۔ اور نہ
ہی میں تم جیسے دو کوڑی کے انسان سے شادی کروں گی
دفعہ ہو جاؤ یہاں سے گیت آؤت فرام مائی ہاؤس۔“
نمرتا زور سے چلائی۔

”بس بہت سن لی میں نے بے عزتی۔“ گھٹری
نے کہا۔

”ارے میں تو تجھ جیسی آوارہ اور دوسرے لڑکی
کا بچی بہو بنانا ہی نہیں چاہتی تھی جو آئے دن نت نئے
لڑکے چھانسلے۔ ارے میں تو صرف اپنے بیٹے کی
خوشی کے لئے مان گئی ورنہ۔“

”ایک منٹ۔ آپ کی ہمت کیسے ہوئی میری
بیٹی کو آوارہ اور دوسرے کہنے کی۔“

گھٹری نے کہا۔ ”اب دو نمبر آور آوارہ لڑکی
کو میں دو نمبر آور آوارہ نہ کہوں تو کیا اسے میں شریف
لڑکی کہوں۔ ارے اس لڑکی نے میرے بیٹے

کو بھانسا ہے۔“

”یوشٹ اپ۔“ ارجن کمار دھاڑے تھے۔
”میری بیٹی نے آپ کے بیٹے کو نہیں بھانسا بلکہ
آپ کے بیٹے نے میری بیٹی پر ڈورے ڈالے ہیں
ارے اس وکرم نے دولت حاصل کرنے کے لئے
شارٹ کٹ راستہ چنا ہے۔“
”بس بہت ہو گیا۔“ وکرم نے کہا۔

”نمرتا تم نے مجھے بے عزت کیا۔ وہ تو میں
برداشت کر رہی لیتا مگر اب تمہارا باپ میری ماں کو ذلیل
کر رہا ہے۔ اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ آج
سے میرا تمہارا رشتہ ختم۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں اپنے
دل سے تمہاری محبت نہیں نکال سکتا۔ لیکن محبت عزت
سے زیادہ ضروری نہیں ہوتی۔“ گڈ بائے۔

سوشانت ایک طرف کھڑا سارا تماشا دیکھ رہا
تھا۔ مگنی کینسل ہو گئی۔ لوگ واپس چلے گئے۔
سوشانت دل ہی دل میں اپنی جیت کا جشن
منانے لگا۔

زندگی تیرے بن ادھوری ہے
نجانے کیوں تیرے میرے سچے نیہ دوری ہے
سوچتا ہوں کبھی خود کو مٹا دوں
پر تجھ سے کیا ہوا وعدہ بھانا بھی ضروری ہے
وکرم کی ہوتی ہوئی سگائی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ خود

بھی ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ اس نے نمرتا کو دل کی
گہرائیوں سے چاہا تھا۔ نمرتا سے مل کر اس نے محبت
کے مفہوم کو جاننا اور سمجھا تھا۔ لیکن پتا ہی نہ چلا کہ کب
وہ محبت کی دیوی اس ظالم زمانے کی آواز میں بولنے
لگی۔ پتا ہی نہ چلا کہ وہ نمرتا جو وکرم کے دل میں بہتی
تھی اب وکرم کی محبت کو دولت کے ترازو میں تولنے لگی۔
وکرم سوچ سوچ کر پاگل ہوتا جا رہا تھا۔ نمرتا
ایسی تو نہ تھی۔ اچانک اسے کیا ہو گیا تھا۔ کیا اس
کے باپ نے اسے ایسا کرنے پر پریشور اثر کیا ہے۔

نہیں یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ نمرتا کے کسی بھی
انداز میں اداکاری کا شائبہ تک نہ تھا۔

وکرم کو نمرتا کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی کہ
کیسے نمرتا نے اسے ذلیل کیا یہ بات تو وہ نمرتا کی محبت
میں برداشت کر لیتا لیکن وہ یہ بات برداشت نہیں
کر سکتا تھا کہ اس کی ماں کی ذلت ہوئی تھی۔ اتنے
زیادہ لوگوں کے سامنے نمرتا کے باپ ارجن کمار نے اس
کی ماں کے ساتھ بحث کی تھی۔

اب وکرم کو ایک بار پھر یہ باتیں یاد آنے لگی
تو اس کا خون کھولے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔

”نمرتا کو اس بات پر غور ہے نہ کہ میں اس پر
مرتا ہوں۔ اس کے بغیر جی نہیں سکتا۔ ہاں یہ سچ بھی
ہے۔ لیکن میں اس سچائی کو اب تبدیل کر دوں گا۔ نمرتا
اور اس باپ ارجن کمار پر یہ بات ثابت کروں گا کہ
میری نمرتا سے محبت انہیں میری ماں کو ذلیل کرنے کا
دارنٹ نہیں دیتی۔“

وکرم اسی وقت اٹھا اور گھٹری دیوی کے کمرے
میں آ گیا۔

”کیا ہوا ہے بیٹا؟ اس وقت، کوئی کام ہے
”کیا؟“ گھٹری دیوی نے سوال کیا۔

”ماں میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“
”شادی؟“ گھٹری دیوی حیران ہو گئی۔

”لیکن تیری تو نمرتا کے ساتھ سگائی بھی نہ ہوئی
مگر بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟“

وکرم بولا۔ ”نہیں ماں۔ نمرتا سے نہیں۔
میں بھی لڑکی سے میری شادی کرواد دو جلد از جلد۔“

لڑکی جیسی بھی ہو۔ لنگڑی لولی ان پڑھ، چال بھی
ہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”چل شکریہ نمرتا کا بھوت تیرے سر سے اتر
میں کل ہی آئی کے رشتے کی بات کرتی ہوں۔ آرتی
میری سیکلی کی بیٹی ہے۔ اور میں تو شروع سے ہی یہ
اپنی بیٹی کی آرتی میری بہو بنے۔“

گھٹری کی بات سن کر وکرم اپنے کمرے
میں آ گیا۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو
پہ گئے۔

تو عالم ہے سمجھتا ہے کہ یوں کی زبان
میرا چہرہ بھی پڑھ، میرے حالات بتا
بس ہو جائے مجھے تیری محبت حاصل
تو کوئی ایسی دعا ایسے مناجات بتا
کمال کرتے ہوئے دل تم بھی
اسے فرصت نہیں، تمہیں چین نہیں

دو مہینے گزر گئے تھے۔ آرتی، وکرم کی سہاگن
بن چکی تھی۔ نمرتا پر کئے جانے والے کالے جادو کا
اثر اب تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ سوشانت کی امریکہ میں
کوئی امپورٹ برنس میٹنگ تھی وہ وہاں گیا ہوا تھا۔

نمرتا سب جانتی تھی کہ اس نے اپنے ساتھ کیا
کر ڈالا کیسے اپنی محبت کا اپنے ہی ہاتھوں بلیڈان دے
دیا۔ وہ محبت جسے حاصل کرنے کے لئے اس نے کتنی
محنت کی کوشش کی تھی۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں۔
اور جب سے نمرتا کو یہ پتا چلا کہ وکرم شادی کر چکا ہے
تو وہ مزید ٹوٹ گئی تھی۔ وکرم سے بات کی ہمت نہ تھی
اس میں۔ بس اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔

کشوری، بھی نمرتا کا حال دیکھ رہی تھی نمرتا کی
دلی کیفیات اس کے سامنے روز و رات کی طرح
عیاں تھی۔

وہ شرمندہ تھی۔ اس روز جب ارجن کمار نے
کشوری کو وہ ڈیالا کر دی تھی اور کہا تھا کہ اسے نمرتا کے
جسم پر لگا دینا جب وہ سوئے۔ اس وقت کشوری کے
دماغ میں کالے جادو والی بات تھی لیکن اس نے یہ سوچ
کر اپنے خیال کو جھٹک دیا کہ بھلا ایک باپ اپنی بیٹی
پر کالا جادو کیسے کر سکتا ہے۔

کشوری ایک دودھ (بیوہ) عورت تھی۔ وہ
شروع ہی سے ارجن کمار کے ہاں ملازمہ تھی۔ جب
نمرتا کی ماں رچنا دیوی کی نرس کا ذکر ہو گئی اور اس کی مرتیو
کے بعد کشوری نے نمرتا کو ماں کی طرح پالا ہوا تھا۔

ارجن کمار بھی اس حوالے سے ان کی بہت
عزت کرتے تھے۔ نمرتا نے بھی کشوری کو کبھی ملازمہ
نہیں سمجھا تھا۔ ہمیشہ کشوری کو ماں کی طرح سمجھا تھا۔

دکرم سے شادی کے لئے ارجن مکار کو منانا اور پھر سوشانت اور شور پکھنے کا اچانک امریکہ سے لوٹ آنا..... پھر ارجن مکار کا اپنی بیٹی پر کالا جادو کرنا..... پھر نمرتا کا اپنی سگائی کے دن دکرم سے لڑنا..... اور پھر سگائی کا لوٹ جانا..... سب کچھ شوری نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا..... پہلے تو وہ کچھ نہ سمجھ پائی..... لیکن اب نمرتا کی حالت دیکھ کر شوری سمجھ گئی تھی کہ اس کا شک درست تھا..... نمرتا پراس کے باپ نے کالا جادو کروایا تھا صرف اور صرف اس لئے کہ وہ دکرم سے شادی نہ کرے اور ارجن مکار کو اپنے دوستوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے..... آج کل ارجن مکار بھی بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے..... نمرتا کا حال دیکھ کر شاید کچھ بتا رہے تھے۔

”بیٹا میں نے تیری زندگی برباد کر دی..... اپنے ہاتھوں سے تیری خوشیوں کو آگ لگا دی..... مجھے معاف کر دے.....“ اتنا کہہ کر کشوری پھوٹ پھوٹ کر روئے گئی۔

”پاپا دیکھیں نہ کشوری ماسی مجھ سے کہہ رہی ہیں کتاب نے کالا جادو کروایا ہے مجھ پر..... کہیں زنان سے کہ یہ جھوٹ بول رہی ہیں۔“ غمزدانے بہت آس بہت ہی امید بھری نگاہوں سے ازجن کلماری طرف دیکھا۔

جب تجھ سے ناطہ جوڑا ہے
 مت بوجھ کیا کیا چھوڑا ہے
 نہر تار مری خمی اس نے اپنی کلائی کو کاٹ کر
 خود کٹی کر لی تھی۔ اگرچہ اسے اسپتال لے جایا گیا مگر وہ
 نچ نہ سکی۔ نہر تار نے اپنے باپ سے کوئی سوال کرنے کے
 بجائے موت کو ترجیح دی تھی..... اور یہی بات ارجن
 کمار کو توڑی تھی..... ارجن کمار تو جیسے بیٹی کی موت
 میں ٹوٹ کر بکھر ہی گئے تھے۔ وکرم، نہر تار کی موت سے
 دون دن پہلے اپنی چچی آرنی کے ساتھ جرمنی چاکا تھا۔
 اس لئے وہ نہ جان پایا کہ نہر تار مر چکی ہے۔

دائرہ بنایا ہوا تھا اور صندوق کے آس پاس سوم بتیاں لگائی گئی تھیں ارجن کمار دائرہ میں بیٹھتے تھے۔ لباس کے نام پر انہوں نے صرف ایک انڈیئر مین رکھا تھا۔ اور اوچی آواز میں متروں کا جاپ کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سوم بتیاں بجھ گئی۔ کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ اور ایسی آوازیں آنے لگی جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ جیسے بجلی چمک رہی ہو۔ اور پھر کمرے میں اچانک آواز گونجی۔

”کیوں بھلا یہ مجھے۔“

ارجن کمار دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ”اے شیطان دیوتا۔ اے پوجے دیو۔ میں نے تیری وجہ سے اپنی بیٹی کو کھو دیا۔ میری نمرتا مر گئی۔ مر کر ششان چلی گئی۔ اور اب تو مجھے میری نمرتا لوٹا۔ بتا کوئی اوپائے۔ دیکھا کوئی راستہ کہ کیسے میں اپنی نمرتا کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہوں۔“

ارجن کمار آج اس وقت ایک کامیاب بزنس مین نہیں بلکہ ملھون چاؤر گرو دیکھائی دے رہا تھا۔ وہی آواز دوبارہ آئی۔

”اے میرے غلام۔ اے شیطانیت کے نئے بھروکار۔ اس شیطانی دنیا میں تمہارا سوا گت ہے۔“

”تیری بیٹی مر گئی ہے۔ لیکن تو جانتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے۔ میں تجھے بتا دوں گا کہ نمرتا کب اور کہاں نیا جنم لے گی اور اس وقت بتاؤں گا جب نمرتا نیا جنم لے کر اٹھارہ برس کی ہو جائے گی لیکن اس کے لئے میری ایک شرط ہے۔“

ارجن کمار بولے۔ ”ہاں بول کیا شرط ہے تیری؟“

”تجھے اس مندر کو چھوڑنا ہوگا۔ اپنا سب کچھ چھوڑ کر میری خدمت کرنی ہوگی۔ مجھے پوچھنا ہوگا میں برس۔ شیطان مترو پڑھنے ہوں گے انسانوں کی بلی چڑھانی ہوں گی۔ بول منظور ہے۔“

ارجن کمار نے کچھ بل سوچا اور پھر ایک ارادے سے بولے۔ ”ہاں منظور ہے۔“

ہم یہی پوچھتے پھرتے ہیں زمانے بھر سے جن کی تقدیر بدلتی ہے وہ کیا کرتے ہیں

☆ ☆ ☆

پنڈت جگن ناتھ مندر کے پجاری تھے۔ وہ بہت ہنس کھ اور دیوانہ انسان تھے ہر کسی کی مدد کرتے تھے گاؤں میں ہر کوئی پنڈت جگن ناتھ کے کن کا تھا۔ کسی کو کوئی بھی معصیت پیش آتی تو وہ سیدھا پنڈت جگن ناتھ کے پاس جاتا تھا۔

پنڈت جگن ناتھ کی جتنی بھی ان کی طرح ہی بہت رحم دل تھیں ان کا نام سریتا تھا۔ سریتا کو اپنے دھرم سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ آئے دن اپنے گھر میں جگن کرواتی رہتی تھیں پنڈت جگن ناتھ کی اور سریتا کی آنکھوں کا تارا ان کی آنکھوں میں عالیہ تھی۔

عالیہ کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ہائی اسکول پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

ان دنوں عالیہ بہت پریشان رہنے لگی تھی پریشانی کی وجہ سے وہ اپنی پڑھائی پر دھیان نہیں دے پاری تھی اس کی پریشانی کا سبب وہ خواب تھے۔ جن کا مقصد وہ جان نہیں پاری تھی۔ کل رات کو بھی عالیہ نے اپنے سننے میں دیکھا تھا کہ وہ ایک نہایت حسین و جمیل جگہ پر گھڑی ہے۔ چاروں اطراف میں سرسبز پہاڑ ہیں ان پہاڑوں سے آبشاریں بہہ رہی ہیں۔ ہر طرف رنگ برنگ پھول کھلے ہیں۔ جن کی خوشبو نفا کو سمجھ کر رہی تھی۔

عالیہ کھڑی تھی اور اس کے سامنے ایک لاکڑا کھڑا ہوا تھا۔ اس لڑکے نے عالیہ کے دونوں ہاتھ تھام رکھے تھے۔ اور پیار بھری باتیں کر رہا تھا۔

عالیہ بھی اس کی محبت بھری باتوں میں گم ہو رہی تھی کہ اچانک عالیہ کے ہاتھ جگن ناتھ کے آگے ان کے پاس ایک کمان تھی۔ عالیہ نے دیکھا کہ پنڈت جگن ناتھ نے کمان میں تیر کو سیت کیا اور اس لڑکے کا نشانہ لے کر تیر کو چھوڑ دیا۔

تیر نفا میں سرسراتا ہوا آیا۔ اور سیدھا اس

لڑکے کے دل میں پیوست ہو گیا۔ اس لڑکے نے ایک بمیا نک جی ماری اور وہی پرم گیا۔

عالیہ کی ہمت نہ جھکی کہ وہ اپنے باپ سے کچھ پوچھتی۔ اس لئے وہ بھاگی اور آگے ایک بہت گہری کھائی تھی عالیہ کو بتائی نہ چلا کہ وہ اس کھائی میں کر گئی۔ پچھلے ایک مہینے سے عالیہ مسلسل یہ خواب دیکھ رہی تھی۔ اور اب تو عالیہ کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اپنے خواب والے اس لڑکے سے عالیہ پیار کر رہی ہے نہ جانے کیوں عالیہ کا دل کرتا تھا کہ وہ اس لڑکے کو حقیقت میں دیکھے۔ قریب سے دیکھے۔

لیکن عالیہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس خواب کا مقصد جان کر رہے گی۔ اور اس کے لئے وہ مندر کے بڑے پجاری پنڈت شاستری کے پاس جائے گی۔ کیوں کہ وہ اپنے خواب کے بارے میں اپنے باپ پنڈت جگن ناتھ کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اس لئے کہ وہ پریشان ہو جاتے اور عالیہ نہیں چاہتی تھی کہ پنڈت جگن ناتھ ذرا بھی پریشان ہوں۔ آخر کیوں وہ اس کے پتا تھے۔

☆ ☆ ☆

ارجن کمار نے نہیں برس تھا گزارے تھے۔ صرف اور صرف شیطان کو پوجا تھا۔ لوگوں کی موت کے منتر پڑھتے تھے۔ شیطان کو خوش کرنے کے لئے کتنے لوگوں کی بلیاں چڑھاتی تھیں کہ کسی طرح انہیں ان کی نمرتا واپس مل جائے۔

آج بھی وہ ایک بلی چڑھا چکا تھا۔ ایک سات سال کے معصوم بچے کا گلا کاٹ رہا تھا اور اب شیطان سے مخاطب تھا۔

”اے شیطان دیوتا۔ میں نے تجھے اپنا سب کچھ مانا ہے۔ تیرے لئے اپنے دھرم کو چھوڑا ہے۔ اے شیطانی طاقتوں والے لازوال دیوتا میں برس گزار چکے۔ اپنا وعدہ نبھادنا کر اپنا وعدہ۔ کہاں ہے میری نمرتا۔“

کہاں ہے میری بیٹی۔ کہاں اور کس روپ میں اس نے دوسرا جنم لیا ہے۔

شیطان دیوتا کی آواز آئی۔ ”ہم اپنا وعدہ وفا کرنے آگئے۔ ہمیں برس پہلے ہم نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ نمرتا کو دوسرا جنم دیں گے۔ نمرتا دوسرا جنم لے چکی ہے۔ دوسرے جنم میں وہ پنڈت جگن ناتھ کی بیٹی عالیہ ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ نمرتا ہے۔ جگن ناتھ کاؤں شاستری مگر میں رہتا ہے۔ تو جلد از جلد شاستری مگر چلا جا۔ عالیہ کی شکل ہو ہو نمرتا کی طرح کی ہے۔ اور بہت جلد وہ بھی اپنی حقیقت جان لے گی۔“ اور وہ محسوس شیطانی آواز آئی بند ہو گئی۔

ارجن کمار بہت خوش تھے۔ انہیں ان کے تپسیا کا صلہ ملنے والا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے دوبارہ ملنے والے تھے۔

ارجن کمار نے شاستری مگر جانے کی تیاری شروع کر دی۔

عالیہ پنڈت شاستری کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پنڈت شاستری کو اپنے خوابوں کے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔ اور اب پنڈت شاستری کوئی کیاں کر رہے تھے ان کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ تقریباً چارہ منٹ کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولی پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

عالیہ نے پوچھا۔ ”پنڈت جی خبریت تو ہے نا؟“

پنڈت جی بولے۔ ”خبریت نہیں ہے عالیہ۔ شیطانی اور کالی طاقتیں تیری تلاش میں ہیں۔“

”میری تلاش میں کالی طاقتیں وہ کیوں؟“

عالیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کیونکہ یہ تیرا دوسرا جنم ہے؟“ پنڈت شاستری نے کہا۔

عالیہ پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ گرے لگا۔ لیکن وہ ایک باہمت لڑکی تھی اس نے اپنے اعصاب پر قابو پا کر پوچھا۔

”تو کیا وہ کالی طاقتیں پچھلے جنم سے میرے پیچھے ہیں؟“

پنڈت شاستری بولے۔ ”میں تجھے ایک بیوت
دے رہا ہوں یہ بیوت رات کو اپنے جسم کے ساتھ مل کر
سو جانا اس بار تجھے تیرے سینے میں سب کچھ بتا چل
جائے گا۔“

عالیہ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے پنڈت جی..... لیکن
میرے پتا جی سے اس حوالے سے کوئی بات نہ کرنا وہ
میں نہیں چاہتی کہ وہ پریشان ہو جائیں۔“
پنڈت شاستری نے اثبات میں سر ہلادیا اور
عالیہ کو وہ بیوت دے دیا۔

عالیہ نے سونے سے پہلے وہ بیوت اپنے بدن
کے ساتھ لٹائی اور سو گئی..... اور خواب میں اسے سب
یاد آتا گیا..... سب سے پہلے اپنی ماں رچنا دیوی کی
موت..... گھر میں وہ سوگ کا عالم..... پھر کستوری کا اس
کی ماں کا رول ادا کرنا، ماں کی طرح اس کا خیال کرنا.....
سب یاد آ رہا تھا عالیہ کو..... اپنے باپ ارجن
کمار کی اپنے بزنس میں مصروفیات یاد آ رہی تھیں۔

اس کے بعد پہلی دفعہ ہوں میں وکرم سے
ملاقات..... پھر وکرم سے محبت..... سوشانت کا اس کی
زندگی میں آنا..... اور پھر اسے کے سب سے باپ ارجن کمار
کا اس کی زندگی میں زہر کھولنا..... سگائی والے دن اس
کی سگائی کا نہ ہونا..... اور پھر اس کا خودکشی کر لینا ایک
ایک منظر وہ اپنے خواب میں دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے
یہ بھی دیکھا کہ اس کا باپ ایک بزنس مین نہیں ایک
شیطان جادوگر بن گیا ہے۔

رات کے دو بجے عالیہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا
بدن پسینے سے شرابور تھا اب اسے سمجھ آ رہی تھی کہ خواب
والے اس لڑکے سے کیوں پیار کر رہی تھی کیونکہ وہ اس کا
پیار تھا..... محبوب تھا..... اس کا۔

وہ سوچنے لگی۔ نہ جانے وکرم کہاں ہوگا اب تو اس
کے پیچھے بھی ہوں گے اگر میں اس سے ملی تو کیا وہ مجھے
پہچان پائے گا۔

نہ جانے کیوں عالیہ کو وکرم یاد آ رہا تھا حالانکہ اس
نے حقیقت میں وکرم کو دیکھا نہ تھا۔

شاید اسے ہی محبت کہتے ہیں۔
یوں تو شاخ سے پتے ٹکرائیں کرتے
چمچ کر لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے
☆.....☆.....☆

ارجن کمار شانتی گھر میں آ گئے تھے..... وہ اس
وقت مندر میں تھے..... شیطان نے ارجن کو بتا دیا تھا
کہ اس مندر کا پجاری شاستری سب جانتا ہے اس لئے
وہ شاستری سے ملنے کے لئے آئے تھے کہ شاستری سے
پوچھ سکیں کہ ان کی بیٹی کہاں ہے۔

”آپ پنڈت شاستری ہیں۔“ ارجن کمار نے
پوچھا۔

”جی اور آپ غالباً ارجن کمار ہیں۔ شیطان
کے پیروکار۔“ پنڈت شاستری نے طنز سے کہا۔
”اگر تم سب جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ
میں صرف اپنی بیٹی کے لئے شیطان کا پیروکار
بنا ہوں۔“ ارجن کمار نے کہا۔

پنڈت شاستری بولے۔ ”لیکن تم اپنی بیٹی کے
قاتل تھے..... اس پر کالا جادو کروادیا..... چلو
شور برکھنہ اور سوشانت تو فیر تھے..... لیکن تم تو اس کے
گئے باپ تھے..... تم ہی تھے وہ..... جو اپنی اکلوتی بیٹی
کو اس حد تک لے گئے کہ اس نے خودکشی کر لی.....
اس کے بعد تم نے کستوری کو مار ڈالا کہ اس نے تمہاری
سچائی تمہاری بیٹی کو بتا دی تھی..... تم نے اس پر انتقام
کیا بلکہ وکرم کو مار ڈالا..... اس کی پتی کو سہاگن سے
ابھاسن بنا دیا..... اور پھر شیطان کھیل کھیلنے کے
تمہاری بیٹی تمہیں کبھی نہیں مل سکتی..... چلے جاؤ یہاں
سے..... چلے جاؤ۔“

ارجن کمار بولے۔ ”یہ فیصلہ کرنے والے تم کون
ہوتے ہو۔“

”ہاں میں کون ہوتا ہوں یہ فیصلہ کرنے
والا..... یہ فیصلہ تو عالیہ کرے گی..... میں نے اسے
سندیرہ بھجوا دیا ہے..... وہ آتی ہی ہوگی..... لووہ
آگئی۔“

پنڈت شاستری نے سامنے اشارہ کیا جہاں
سے نر تاپا عالیہ آ رہی تھی۔

ارجن کمار کو لگا کر جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے
ہیں۔ بالکل نر تاپا جیسی شکل تھی عالیہ کی۔

عالیہ نے ہاتھ جوڑ کر پنڈت شاستری کو تسکین دیا
اور پوچھا۔ ”پنڈت جی آپ نے مجھے بلایا۔“
”ہاں بیٹا..... یہ دیکھ تیرا باپ آیا ہے تجھ سے
ملنے۔“

عالیہ نے ارجن کمار کی طرف دیکھا۔ ارجن کمار کو
نہ جانے ایک دم کیا ہوا..... انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ
عالیہ کے سامنے جوڑ دیئے اور رونے لگے وہ بولے۔
”بیٹا میں جانتا ہوں کہ سب میری غلطی ہے
..... تو میری وجہ سے مری ہے..... تیری موت کے
بعد میں پاگل سا ہو گیا تھا..... میں نے اسی پاگل پن میں
کستوری اور وکرم کو مار دیا..... معاف کر دے مجھے
بیٹا..... معاف کر دے۔“

عالیہ نے بولنا شروع کیا۔ ”پاپا آپ نے میری
زندگی کے ساتھ شیطان کھیل کھیلایا..... میں نے اس
وقت ہی آپ کو معاف کر دیا تھا کیا میری خودکشی کے
بعد یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی کہ میں آپ سے
بہادوت کرنے پر موت کو ترجیح دوں گی..... لیکن آج نہ
سمجھ پائے..... میری ماسی کستوری اور میرے محبوب وکرم
کے قاتل بن گئے..... میں اس کے لئے بھی آپ
کو معاف کر دیتی..... لیکن پاپا آپ انسان سے شیطان
بن گئے تھے لوگوں کو شیطان کے قدموں میں قربان کیا
اور آپ کا یہ جرم تا قاتل معافی ہے..... میں آپ کو نہیں
معاف کروں گی آپ جائیں دوبارہ اس شیطان کے
ہاں..... اور اس کی پوجا کریں۔“

عالیہ نے اپنی بات ختم کی تو ارجن کمار کا ہاتھ
اپنے سینے پر اٹھتا چلا گیا۔ وہ نیچے کرکے۔ پنڈت
شاستری نے ان کی نبض چیک کی وہ مر چکے تھے انہوں
نے عالیہ سے کہا۔ ”عالیہ یہ مر چکے ہیں۔“

عالیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ

بولی۔ ”آپ ان کا تم سن کر کروں بیچے گا۔ میں جارہی
ہوں۔“

عالیہ مندر کی بیڑیوں سے نیچے اتر رہی تھی کہ
اسے کسی نے بلایا۔ ”سنو۔“

عالیہ نے مرکز دیکھا..... وہ خوابوں والا لڑکا اس
کے سامنے کھڑا تھا۔
”وکرم تم؟“ عالیہ حیرت زدہ تھی۔
”تم تو مر چکے ہو۔“

وکرم بولا۔ ”ہاں میں مر گیا ہوں..... تمہارے
باپ نے مجھے مار دیا تھا..... میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں
کہ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں اور میں یہ چاہتا ہوں
کہ اپنی نئی زندگی کے سفر میں تم جب بھی ہماری محبت
کو شمار کرو تو اس میں اپنے باپ کی عداوت کو نہ شمار کرنا
بھول جانا کہ ہماری محبت کے امرت میں تمہارے باپ
نے کیسا زہر ملا دیا تھا..... انہیں ان کے کئے کی سزا ملنی
ہے اور تمہیں بھی نیا پر پوار مل گیا ہے..... اپنی نئی زندگی
خوشی خوشی جیو..... زندگی میں خوشیاں پانے کے بعد
تمہیں موت کے بعد بھی خوشیاں ملیں گی کیونکہ میں
ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تمہاری زندگی میں
بھی..... اور تمہارے مرنے کے بعد بھی۔“ وکرم اتنا کہہ
کر غائب ہو گیا۔

عالیہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے دل کو اپنی
مٹھی میں جکڑ لیا ہو..... لیکن اس نے اپنی کیفیت پر
قابو پایا اور واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے کیونکہ اس کا
پر پوار، اس نئی زندگی اسے اپنی طرف بلا رہی تھی..... یہ
الگ بات تھی..... کہ اس کی نئی زندگی میں وکرم اس کے
ساتھ نہیں تھا۔ لیکن ابھی وکرم نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ
ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا اس کی زندگی میں بھی.....
اور اس کے مرنے کے بعد بھی.....

عالیہ، وکرم کے ان الفاظ کو سوچ کر مطمئن
ہو گئی۔



برس ہا برس سے پراسرار قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے سرگرداں انسانوں کی پراسرار ہولناک داستان حیرت، قدم قدم پر سحر جادو اور عملیات کی حیرت انگیز مناظر پڑھنے والوں کو انگشت بدندان کر کے اچنبھے میں ڈال دیں گے، ایک بالکل نئے طرز کی حیرت ناک دلوں پر دہشت طاری کرتی کہانی۔

ایک نادریدہ اور پراسرار ہستی کی ہولناک روادولوں کی ہر کنشیں تیز کرنے والا سلسلہ

میں نے چونک کر ماں جی کی طرف دیکھا تھا اور پھر بے اختیار میری نگاہیں رحیم بابا کی طرف گھوم نکلیں۔ وہ پوری طرح ماں جی کی طرف متوجہ تھے، ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ مل رہے تھے، وہ یقیناً کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں بے چین سا ہو گیا..... پہلے کی طرح ایک بار پھر ماں جی کا چہرہ بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ عین اسی وقت رحیم بابا نے ماں جی کو مخاطب کیا۔ ”سہیل! کہن..... کیا آپ اسے جانتی ہیں؟“ ”کس کو؟“ ”انہوں نے رحیم بابا کو گھورا۔“ ”جان لیوا کو.....“ وہ پرسکون لہجے میں بولے۔ ”یہ جان لیوا ہے کون.....؟ کہاں رہتا ہے.....؟“ ”ارے..... آپ باہر کیوں کھڑی ہیں؟ اندر آ جائیں.....“ ”نہیں..... میں یہیں ٹھیک ہوں.....!“ وہ بولیں۔ ”کیونکہ میرے پاس وقت نہیں ہے، مجھے بہت سارے کام کرنے ہیں۔“

”اوہ! اچھا.....“ رحیم بابا نے سر ہلایا۔ ”میں نے آپ سے جان لیوا کے بارے میں پوچھا تھا.....! کون ہے وہ.....؟“ ”جلد معلوم ہو جائے گا.....“ ماں جی نے سر ہلا کر کہا۔ پھر انہوں نے چاروں طرف نظر گھمائی اور فوراً ہی دروازے سے ہٹ گئیں۔ وہ چانچکی گئیں، میں نے ہونٹوں کی طرح رحیم بابا کی طرف دیکھا وہ بھی خالی دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ”رحیم بابا.....!“ میں نے ان کا ہاتھ ہلایا۔ ”آپ کہاں گم ہو گئے.....؟“ ”آں.....!“ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ”گم کہاں ہوا ہے؟ تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔“ ”دیکھا آپ نے.....!“ میں نے ان کی توجہ مبذول کروائی۔ ”بھئی بھئی یہ حال ہو جاتا ہے ماں جی کا.....“ ”ہاں..... میں اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں.....!“ انہوں نے سر ہلایا۔

”تم جلدی سے جا کر نہیں دیکھو..... مجھے فوراً بتاؤ“
 ”کہو کیا کر رہی ہیں اور کہاں ہیں۔“
 ”جی اچھا..... میں فوراً تھا۔“
 ”جلدی کرو بیٹا.....“ انہوں نے کہا تھا۔
 میں سر ہلا کر کمرے سے نکل آیا، میں ادھر ادھر
 جھانک تاک کرتا ہوا کچن میں جا پہنچا، ماں جی یہاں موجود
 تھیں اور بڑے مڑے سے چولہے پر رکھی ہوئی ہانڈی میں
 چچہ کھارہی تھیں۔
 ”اماں جی.....“ میں نے انہیں پکارا۔
 وہ فوراً لائیں اور بولیں۔
 ”ارے کلکلی..... تم بالکل صحیح موقع پر آئے
 ہو..... یہ لو..... ذرا شک تو چکھ کر بتاؤ..... میری تو آج
 سمجھ میں نہیں آ رہا۔“
 میں نے بے ساختہ اپنی ہتھیلی آگے بڑھا دی،
 انہوں نے منچے میں موجود شوربہ پر پھونک ماری اور میری
 ہتھیلی پر پکڑ دیا۔
 میں نے زبان سے شوربہ چاٹا اور سر ہلا کر بولا۔
 ”بالکل ٹھیک ہے اماں جی..... براہِ رے۔“
 ”شکریہ ہے.....“ انہوں نے طویل سانس لی۔
 ”میں آج تمہارا پسندیدہ قورمہ گوشت بنا رہی
 ہوں۔ اور رحیم بھائی کو بھی جانے مت دینا۔“
 ”جی ٹھیک ہے.....“ میں نے سر ہلایا۔
 پھر میں نے محتاط انداز میں ان کی طرف دیکھ
 کر کہا۔
 ”آپ ابھی کمرے کی طرف کیوں آئی تھیں؟“
 کوئی کام تھا.....؟“
 ”کمرے کی طرف.....؟“ انہوں نے حیرت
 سے مجھ دیکھا۔
 ”نہیں تو..... میں ایک گھنٹے سے یہاں موجود
 ہوں..... میں تو ایک پل کے لئے بھی باہر نہیں نکلی۔“
 ”اچھا.....“ میرے منہ سے نکلا۔ میں حیرت زدہ
 رہ گیا۔
 ”کیوں..... کیا ہوا.....؟“ انہوں نے مجھے غور

سے دیکھا۔
 ”تم نے مجھے کہاں دیکھ لیا.....؟ میں تو سائن
 بنانے میں مصروف ہوں۔ کہاں جاؤں گی۔“
 ”یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔
 پھر میں کچھ کہے بغیر ہی دروازے کی طرف بڑھ
 گیا۔
 ”سنو..... رحیم بھائی کو جانے مت دینا.....
 ہاں.....“
 ”اچھا..... تو یہ بات ہے۔“ رحیم بابا نے پر مٹھی
 انداز میں سر ہلایا۔
 ماں جی نے جو کچھ کہا تھا، وہ بیان کے طور پر میں
 نے رحیم بابا کے سامنے پیش کر دیا تھا۔
 ”لیکن رحیم بابا..... اس کا کیا مطلب
 ہوا.....؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔
 ”ماں جی تو صاف انکار کر رہی ہیں، جبکہ وہ یہاں
 آئی تھیں۔“
 ”لیکن یہ بھی تو سوچو کہ وہ جھوٹ کیوں بولیں گی
 ۔“ رحیم بابا دیر سے مسکرائے۔
 ”دوسری بات یہ ہے کہ جو دروازے پر آیا تھا،
 اس کا چہرہ بھی تمہاری ماں جی سے کافی مختلف تھا، کیا تم نے
 غور نہیں کیا تھا؟“
 ”جی ہاں..... مجھے احساس ہے، ان کی یہ حالت
 میں اس سے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں میں نے آپ کو بتایا تھا
 کہ اس وقت بھی انہوں نے کسی جاں لیوا کا ذکر کیا تھا۔“
 ”مجھے یاد ہے.....“ انہوں نے سر ہلایا۔
 ”اور میں ایک نتیجے پر پہنچ چکا ہوں۔“
 ”وہ کیا رحیم بابا۔“
 ”یہ تمہاری ماں جی ہی تھیں.....“ رحیم بابا نے بتایا۔
 ”لیکن ان پر کوئی اپنا تسلط جتاتے ہیں، ان
 پر حاوی ہو کر انہیں اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔“
 ”اوہ.....“ میرے منہ سے نکلا۔
 ”یہ..... یہ بات ہے؟“
 ”ہاں.....“ وہ بولے۔

”اسی لئے تمہاری ماں جی کو ظلم نہیں ہوتا کہ وہ
 کہاں ہیں..... اور کیا کر رہی ہیں۔“
 ”اوہ میرے خدا.....“ میں کانپ اٹھا۔
 ”اس طرح تو وہ ماں جی کو نقصان بھی
 پہنچا سکتا ہے..... یہ سب کیا ہے رحیم بابا.....؟ کیا اب ہم
 دونوں کی باری ہے.....؟ کیونکہ اس گھر سے پہلے ہی تین
 لاکھ اٹھ سو تھی ہیں، اور اب میں اور ماں جی رہ گئے ہیں۔“
 ”تم گھبرائو نہیں.....“ رحیم بابا نے مجھے تسلی دی۔
 ”سب ٹھیک ہو جائے گا..... اگر اس شے
 کو نقصان پہنچا ہوتا..... تو اب تک نہ جانے کیا
 ہو چکا ہوتا۔“
 ”لیکن رحیم بابا..... کیا مجھوسہ ہے.....؟ کسی
 وقت بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے اعتراض کیا۔
 ”دیکھو.....! وہ میری طرف پوری طرح
 متوجہ ہو گئے۔“
 ”تمہاری ماں جی کو اپنے قبضے میں کر لینے کا مقصد
 فی الحال اس کا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے پیغامات تم تک
 پہنچا سکے۔“
 ”کیا مطلب.....؟“ میں نے چونک کر انہیں
 دیکھا۔
 ”بات سمجھنے کی کوشش کرو.....“ وہ بولے۔
 ”اے اگر کسی سے کچھ کہنا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ
 انسانی زبان کا سہارا لے گا۔ فی الحال وہ اپنے آپ کو جان
 لیوا کے نام سے صرف ظاہر کر رہا ہے۔ وہ بتانا چاہتا ہے کہ
 اس کی ہستی جیتی جاگتی موجود ہے..... البتہ وہ ہماری
 آنکھوں سے اوجھل ہے۔“
 ”لیکن اس کا کیا فائدہ.....؟“ میرے منہ
 سے نکلا۔
 ”وہ کیوں ایسا کر رہا ہے.....؟“
 ”یہ بات تو تو ہی بتا سکتا ہے۔“ رحیم بابا بولے۔
 ”تمہارے باپ دادا اور دیگر عزیز واقارب کی
 موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس کا کیا مقصد ہے۔“
 وہ کیا چاہتا ہے۔“

”اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے رحیم بابا۔“ میں
 نے ہونٹ میکرے۔
 ”وہ ہم دونوں کو بھی مار ڈالے گا۔“ ابھی وہ صرف
 لطف لے رہا ہے۔ ہمیں بریٹان کر کے اس کا دل خوش
 ہوتا ہے..... کیا آپ نے بھی مٹی اور چوہے کے مابین
 تماشہ دیکھا ہے؟“
 ”کیسا تماشہ.....؟“
 ”میں دیر سے سہارا اور پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔
 ”مٹی جب زیادہ بھوک نہیں ہوتی اور چوہے
 کو پکڑ لیتی ہے تو اسے چیرنے پھاڑنے کے بجائے اس
 سے کھاتی ہے..... اسے بھگاتی ہے اور پھر خود اس کے پیچھے
 بھاگتی ہے۔ پھر جب اس کھیل سے اس کا جی بھر جاتا ہے
 تو وہ اسے کھا جاتی ہے۔ کیا آپ نے بھی دیکھا ہے؟“
 جوا رحیم بابا خاموش تھے، میں نے ان کی طرف
 دیکھا اور پھر نے تلے لچے میں بولا۔
 ”تو اس وقت میرے باپ دادا کا دشمن وہی کھیل
 کھیل رہا ہے۔ اس نے میرے باپ کو ماں جی کے
 ہاتھوں مر دیا تھا۔ اور میں بے بسی سے سب کچھ دیکھتا رہ
 گیا..... میں..... میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرے باپ
 نے میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا..... میری
 دُخوب صورت، بہنوں کی لائیں اس کھیل میں ملیں، کہ
 جس کو ان بے چاریوں نے بھی دیکھا بھی نہیں تھا..... کوئی
 کچھ نہ کر سکا..... سب نے ہی اسے حادثے کا نام دے دیا
 اور وہ دونوں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میرے باپ
 پر خنجر سے وار کیا گیا..... لیکن پولیس آج تک قاتل کو گرفتار
 نہیں کر سکی..... اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل نے میری ماں
 جی کے ذریعے انہیں قتل کروا دیا تھا..... اف..... یہ کتنا بڑا
 ظلم ہے..... لیکن اس ظلم کا جواب دینے والا کوئی نہیں
 ہے..... مجھے..... انصاف دلانے والا کوئی نہیں ہے..... میں
 کے پکاروں.....؟ کسے آواز دوں.....؟“
 میں جذباتی انداز میں بولتا چلا گیا..... رحیم بابا
 میری شکل تک رہے تھے۔
 پھر وہ اٹھے اور انہوں نے قدرے جھکتے ہوئے

میرے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔
میری آنکھوں سے آنسو چمک آئے تھے، اس وقت نہ جانے کیوں میرے سارے ذمہ ابھر کر سامنے آ گئے تھے اور آج ان رختوں میں سخت تکلیف تھی۔
رجیم بابا نے میرا چہرہ اوپر اٹھایا اور شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

”میری بات سنو میرے بیٹے..... میں جانتا ہوں کہ تم پر بہت ظلم ڈھائے گئے ہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے اس گھر کو گویا آگ میں بھونک دیا گیا..... میں اس داستان سے اچھی طرح واقف ہوں..... لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا..... اور وہ یہ کہ عروج کو ہمیشہ زوال ہوتا ہے اور ظلم کبھی نہ کبھی ضرور اپنے انجام سے دوچار ہوتا ہے، کیونکہ مظلوم کی آہ عرش کو بھی بلا دیتی ہے۔“
”لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا.....“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیونکہ میں بہت بد نصیب ہوں..... بہت ہی بد نصیب اور کمزور انسان ہوں۔“
”یہ تمہاری غلط فہمی ہے میرے بیٹے.....“ انہوں نے میرا کاغذ ہالایا۔

”ت..... تم..... ہرگز کمزور نہیں ہو..... تم اگر زمین پر ٹھوک مارو تو اس میں سے پانی کا چشمہ نکل آئے..... نصیب کو برداشت کرو..... تم بہت کرو..... اور اپنا نصیب خود بناؤ۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہو گے..... ہاں وہ وقت ضرور آئے گا۔“

”میں کیا کروں رجیم بابا.....“ میں نے پوچھا۔
”اب آپ ہی بتائیں.....؟“
”ضرور بتاؤں گا.....“ انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”لیکن سب سے پہلے تم اپنے دل سے ڈر نکال دو..... اور خود کو مضبوط کر لو..... اور تم نے خود کو کمزور سمجھا تو پھر ہر قدم پر ناکامی ہوگی..... پہلے یہ کام کرو..... پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔“

انتا کہہ کر وہ چوٹے اور چلدی سے بولے۔
”ارے..... باتوں میں وقت کا خیال ہی نہیں رہا، مجھے واپس جانا ہے..... اچھا..... تو اب میں چلتا ہوں۔“
”آپ کھانا کھا کر جائیں گے..... ماں جی نے بھی تاکید کی ہے۔“

”نہیں.....! میں اب چلوں گا، ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی..... ایسا نہ ہو کہ بی بی صاحبہ کو شک ہو جائے۔“
”اچھا تو پھر یہ بتائیں کہ آپ کب آئیں گے؟“
”جس دن قاسم میاں واپس آ گئے، میں اسی دن آ جاؤں گا..... ٹھیک ہے ناں.....؟ اب میں جا رہا ہوں۔“
یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

☆.....☆.....☆
ماں جی اس بات پر بہت خفا ہوئی تھیں کہ رجیم بابا کھانا کھا کر بغیر ہی چلے گئے۔ خیر..... میں نے پھر انہیں سمجھا دیا تھا۔
دوپہر کی چٹپلائی ہوئی دھوپ میں سدو نازل ہو گیا..... ماں جی اس وقت آرام کر رہی تھیں۔

میں نے سدو سے کہا۔
”آؤ گھر میں ہی بیٹھے ہیں۔“
”ابے بھائی..... گھر سے تو نکل کر آ رہا ہوں.....“ اسنے منہ بنایا۔

”تم پھر ڈر بے میں تمہیں دے ہو۔“
”اس دھوپ میں کہاں دھکے کھاؤ گے..... میں نے پوچھا۔
”چلو..... آج پھر چشمے پر چلتے ہیں.....“ اس نے کہا۔

”لیکن برائے مہربانی آج وہ ڈرامہ مت کرنا۔“

”کون سا ڈرامہ.....؟“ میں انجان بن گیا۔
ویسے میں شک تھا کہ وہ کیا قصور تھا؟ لیکن آج وہ ”اب بھولے مت بنو.....“ اس نے میرے

نہ سے پر ہاتھ مارا۔
”تم ہر دفعہ بھانہ بنا کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے ہو۔“
”اچھا..... میں ہنسا۔
”چلو..... اب نہیں بھاگوں گا۔“
”یار..... ایک بات بتاؤں.....“ سدو نے کچھ چپے ہوئے کہا۔

”ہاں..... بولو.....“
”بات دراصل یہ ہے کہ ایسی جگہوں پر نہانے کا رعب اور ہے..... یقین کرو..... یوں لگتا ہے جیسے وہ پانی ج میں اتر گیا ہو..... دماغ کی ساری نیس کل جاتی ہے۔“

”یار تم نے تو حد ہی کر دی ہے..... میں ہنسا اٹھا۔
”میرا خیال ہے کہ اسٹریم لیتے ہوئے یہ حالت کی ہے۔ اور تم چشمے کے پانی میں ڈکیاں لگاتے ہو۔“
”ہا ہا ہا.....“ وہ ہنسنے لگا انداز میں ہنسا۔
”تم کافی اچھا بولنے لگے ہو..... اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد تم میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔“

”تم کہہ سکتے ہو.....“ میں مسکرایا۔
”کیونکہ تم میرے بچپن کے دوست ہو.....“
”اچھا چھوڑو..... یہ بتاؤ کہ تمہارے لباچی کے لبا کا کچھ ہا لگا۔“

”نہیں.....“ میں نے ننگی میں سر ہلایا۔
”ایسا کچھ نہیں ہوا.....“
”بڑے انکس کی بات ہے.....“ سدو نے بھڑکے لہجے میں کہا۔

”یہاں مارنا تو بہت آسان ہے، لیکن مارنے کو مارنا بہت مشکل ہے۔ ہر طرف بے انصافی اور قتل گری کا بازار گرم ہے بڑے بڑے محکموں میں استانی کا کاروبار عروج پر ہے۔ نہ جانے اس ملک کا کیا قصور تھا؟ لیکن آج وہ ان کے نیچے ہے اور اسے مارنے والا یقیناً اس وقت

کہیں مرے سا ڈار ہا ہوگا۔“
”ہو سکتا ہے.....! میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔
”لیکن میں کبھی کیا سکتا ہوں۔“
”واقعی.....“ سدو نے سر ہلایا۔
”تم نے ممبری کر لیا، کبھی بڑی بات ہے۔ آؤ اب چلیں۔“

راستے میں بھی اسی قسم کے موضوع پر باتیں ہوتی رہیں..... اور پھر ہم دونوں کافی مدت بعد ایک بار پھر چشمے کے قریب پہنچ گئے۔

یہاں کا منظر آج بھی وہی تھا۔ درختوں کے لمبے لمبے گئے سائے اور ان سے چمن کے آنے والی دھوپ میں چشمے کا ابلتا ہوا پانی چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔
”میں تو اکثر یہاں آتا رہا ہوں.....“ سدو نے بتایا۔

”کیونکہ مجھے یہاں بہت سکون ملتا ہے۔ اور سنو..... ایک دفعہ تو بڑا دوست واقعہ ہو گیا۔“
”وہ کیا.....؟“ میں نے پوچھا۔
”یہاں سے ذرا قافلے پر خانہ بدوش آ کر آباد ہو گئے ہیں۔“ اس نے ہنس کر بتایا۔

”تم کو تو میری عادت معلوم ہے کہ میں بغیر کپڑوں کے نہاتا ہوں۔ اتفاق سے اس دن ان خانہ بدوشوں کی چند لڑکیاں اس طرف نکل آئیں۔ میں اسی وقت نہا کر باہر نکلا تھا۔ وہ بے چاریاں چپیں مارتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئیں۔“

”نہیں.....“ میں نے ننگی میں سر ہلایا۔
”ایسا کچھ نہیں ہوا.....“
”بڑے انکس کی بات ہے.....“ سدو نے بھڑکے لہجے میں کہا۔

”یہاں مارنا تو بہت آسان ہے، لیکن مارنے کو مارنا بہت مشکل ہے۔ ہر طرف بے انصافی اور قتل گری کا بازار گرم ہے بڑے بڑے محکموں میں استانی کا کاروبار عروج پر ہے۔ نہ جانے اس ملک کا کیا قصور تھا؟ لیکن آج وہ ان کے نیچے ہے اور اسے مارنے والا یقیناً اس وقت

وہ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔
”تم اب جوان ہو گئے ہو..... میرے منے۔“
”اور تم کون سا چھوٹے رہ گئے ہو.....“ میں بولا۔

”تم بھی تو جوان ہوئے شرم“
 سدو ٹھٹھے مار کر ہنسا پھر اس نے ایک ایسی حرکت
 کی کہ میں اس جگہ سے بیان کرنے سے قاصر ہوں، البتہ
 میں نے اس سے کہا۔
 ”تم واقعی کافی بے غیرت ہو گئے ہو۔“
 ”اے مذاق کر ہا ہوں جانی“ وہ بولا۔
 ”تم تو میرے بچپن کے دوست ہو۔ اگر تم سے
 بے تکلفی نہ ہوگی تو پھر کس سے ہوگی۔ ورنہ تم مجھے بچوں
 کو پڑھاتے ہوئے دیکھ لو گے تو پہچان نہ سکو گے۔“
 کہہ رہا ہوں۔
 میں نے سر ہلا دیا، عین اسی وقت میری نظر سامنے
 اٹھ گئی۔ اور میں چونک اٹھا۔ درختوں کے درمیان ایک
 بار پھر وہی سیاہ ہولہ دکھائی دیا تھا۔
 حالانکہ کافی مدت بعد میں نے ادھر کا رخ کیا تھا۔
 اس کے باوجود وہ ہولہ اسی صورت میں سامنے موجود تھا۔
 میں نے اسے اپنا وہم خیال کیا۔
 اور پھر سر جھٹک کر سدو کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 ”سدو مجھے بہ غور دیکھ رہا تھا۔“
 ”کیا ہوا۔؟“
 ”آں۔“ میں چونکا۔
 ”کچھ نہیں۔؟“
 ”جھوٹ مت بولو۔؟“ سدو نے کہا۔
 ”تمہارے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ بتاؤ
 کیا بات ہے۔“
 ”وہی سایہ مجھے آج پھر دکھائی دے رہا ہے۔“
 ”کیا کہہ رہے ہو۔؟“ وہ حیرت سے بولا۔
 ”آخر یہ کیا ہے۔؟ اور تمہیں ہی کیوں دکھائی
 دیتا ہے۔“
 ”خدا جانے۔“ میرا لہجہ اچھا ہوا تھا۔
 میں نے اس بار کن انکھوں سے درختوں کی
 جانب دیکھا، ہولہ بدستور وہاں موجود تھا۔
 مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ اسی وقت مجھے
 رجم بابا کی باتیں یاد آنے لگیں انہوں نے کہا تھا کہ

ڈرانسان کو کمزور کر دیتا ہے۔ یہ ڈر۔۔۔۔۔ دل سے نکالا
 ہوگا۔ اور اپنے آپ کو مضبوط کرنا ہوگا۔
 دفعتاً ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن
 میں لپکا۔
 ”کہیں یہ وہی تو نہیں۔۔۔۔۔ جو میرے خاندان کا
 قاتل ہے۔ جس نے میرے سارے رشتے جھٹے
 جھین لے اور مجھے تنہا کر دیا۔۔۔۔۔ باپ کا سایہ کتنا مضبوط
 ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنی اولاد کو کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی
 میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن آج وہ میری دہانہ
 میں نہیں تھا۔ اسے مجھ سے جھین لیا گیا۔“
 نہ جانے کیوں میرے تن بدن میں آگ سی
 بھڑک اٹھی، میں نے ایک جھٹکے سے اس ہولے کی طرف
 دیکھا۔ جس پر کالے رنگ کی چادر تھی ہوئی تھی اور اسی
 میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔
 ”کیا ہوا نکیل۔۔۔۔۔؟“ سدو میرے قریب آ گیا۔
 ”کچھ نہیں۔“ میرا لہجہ زیر خستہ تھا۔
 ”یہ تمہیں دکھائی نہیں دے رہا، لیکن میں صاف
 طور پر اسے دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔ سدو۔۔۔۔۔ یہ میرا دشمن ہے
 میرے خاندان کا دشمن ہے اسی نے میرے پیاروں کو مجھ
 سے جدا کیا ہے۔“
 ”اچھا۔۔۔۔۔“ سدو ہنستوں کی طرح سر ہلا کر بولا۔
 اس غریب کو تو کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔
 میں نے کہا۔
 ”آج میں ذرا اس سے معلوم کرتا ہوں کہ یہ
 کیا چاہتا ہے۔“
 ”کیسے معلوم کرو گے۔؟“ سدو نے پوچھا تھا۔
 ”ایسے۔؟“ یہ کہہ کر میں چشمے کی گہرائی سے
 باہر نکل آیا، میں اس قدر جوش میں تھا کہ برہنہ حالت میں
 ہی اس سیاہ ہولے کی طرف بڑھا۔
 میرے قدم اس کی طرف اٹھ رہے تھے اور نگاہیں
 اسی پر جمی ہوئی تھیں میرے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو رہی
 تھیں، لیکن میں خود ہی اپنے آپ کو جوصلو سے بڑھا تھا۔
 ذرا ہی فاصلہ دیکھ رہا تھا کہ اچانک وہ ہولہ غائب

۔۔۔۔۔ درختوں کے درمیان وہ لب موجود نہیں تھا۔
 میرے اٹھتے قدم رک گئے، میں نے ادھر ادھر
 انکھیں پر اسرار بیوں کے کا نام نشان بھی نہیں تھا۔
 کچھ سوچ کر میں ذرا آگے بڑھ گیا، عین اسی
 جگہ اپنی برہنگی کا احساس ہوا، لیکن دیر ہو چکی تھی۔
 چنانچہ سامنے سے آنے والی دونوں لڑکیوں کی
 آمد بچوں سے گویا درخت بل گئے۔
 وہ اچانک ہی سامنے آئی تھیں اور مجھ پر نظر پڑتے
 وہ اچھل پڑی تھیں۔
 میں بھی بوکھلا کر درختوں کی آڑ میں ہو گیا۔۔۔۔۔ ان
 کے ہاتھوں میں منگے تھے، وہ یقیناً خانہ بدوش تھیں
 مجھے پر پانی بھرنے آئی تھیں۔
 میں نے گردن نکال کر جھانکا، وہ اسی جگہ کھڑی
 انھوں نے انھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی
 تھیں۔
 ان میں ایک لڑکی کافی خوب صورت تھی، یوں
 چھوٹوں کا چاند جنگل میں اتر آیا ہو، مجھے اس وقت
 یہ سوچ ہی تھی۔
 میں بلند آواز میں بولا۔
 ”تم دونوں ابھی واپس چلی جاؤ۔۔۔۔۔ چشمے پر میرا
 کچھ بھی موجود ہے۔۔۔۔۔ وہ ابھی نہا رہا ہے۔“
 ”یہ کیا حرکت ہے جی۔۔۔۔۔؟“ خواہ صورت کے
 بدلنے یا تھک چکا کر بولا۔
 ”وہ ہمارے پینے کا پانی ہے، تم لوگ نہا کر اسے
 نہ کر رہے ہو۔“
 ”چشمے کا پانی گندنا نہیں ہوتا۔“ میں نے اسے
 دیکھا۔
 ”تم کو اتنا بھی معلوم نہیں ہے۔؟“
 اب دونوں کی ہمت بڑھ چکی تھی، اسی لڑکی نے
 مجھے اچھا کیے کان میں کچھ کہا اور زور سے ہنس پڑی۔
 خوب صورت لڑکی نے اس کے دو ہتھوڑے رسید
 کیے۔ اور پھر واپس کے لئے کھوم رہی تھیں کہ پہلی
 نے اس کا بازو تھام لیا۔

”تم کہاں جا رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ بولی تھی۔
 ”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ ضرور صحرانیت۔۔۔۔۔ میں نے
 سر ہلا کر کہا۔
 ”لیکن ہمیں کپڑے پہننے کا موقع تو دو۔“
 ”ہم کیا کریں۔؟“ پہلی والی نے حیرت سے
 پوچھا۔
 ”اے بھئی ذرا آگے پیچھے ہو جاؤ۔۔۔۔۔“ میرا لہجہ
 تیز ہو گیا۔
 ”تھوڑی دیر بعد ادھر آ جانا ہم لوگ بھی چلے
 جائیں گے۔“
 ”اچھا ٹھیک ہے۔؟“ پہلی بولی تھی۔
 ”ہم جا رہے ہیں آؤ شالا۔“
 ”شالا۔۔۔۔۔“ میں نے بے خیالی میں دھرایا۔
 ”نام تو اچھا ہے۔“
 لڑکی جاتے جاتے چلی اور بولی۔
 ”تم نے کچھ کہا۔“
 ”نہیں۔۔۔۔۔ اب جان بھی چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ میں نے
 درخت کے عقب سے ہی آواز لگائی۔
 ”اگر اب تم نہیں نکلتی تو میں۔۔۔۔۔!“
 ”ہاں۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ کیا کرو گے۔؟“ وہ شاید
 نلک کر بولی تھی۔
 ”میں اسی حالت میں باہر نکل آؤں گا۔“
 ”چلو چننا۔۔۔۔۔“ شالا نامی لڑکی نے پہلی بار زبان
 کھولی تھی۔
 ”تم تو ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہو۔۔۔۔۔
 چلو۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ جائیں گے۔“
 اس کی آواز میں عجیب سی مٹھاس تھی میں نے
 جھانک کر دیکھا۔ اس کی نگاہ مجھ سے ٹکرائی اور پھر وہ چندا
 کو ہنستی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ جلد ہی وہ دونوں
 درختوں کی آڑ میں ادھمچل ہو گئیں۔
 میں باہر نکل آیا، اب میں تیز رفتاری سے چشمے کی
 طرف قدم بڑھ رہا تھا۔

اپنے ذہن کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی، کیونکہ مجھے رجم بابا کی باتیں یاد آگئی تھیں۔
میرے ساتھ اتنا کچھ ہو چکا تھا۔ کہ اب ذرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ ذر مجھے نقصان پہنچا سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے اپنے دل کو مضبوط کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

”کون ہو تم۔۔۔۔۔ سامنے آؤ۔۔۔۔۔“

کوئی جواب نہیں ملا، میں چوکنے والے انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا، لیکن کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پھر نکارا۔

”ہلولو۔۔۔۔۔ جواب دو۔۔۔۔۔“

ہوا کے شور کے علاوہ کوئی اور آواز نہ ابھری۔

ہوا کے شور کے علاوہ کوئی اور آواز نہ ابھری۔

میں نے سوچا کہ دو قدم آگے بڑھوں، لیکن قدموں نے ساتھ نہ دیا حوصلہ پست سا ہو گیا تھا۔

عین اسی وقت تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت موٹا آدمی ہانپ رہا ہو۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اب مجھ میں سکت ندی کہ میں اس ماحول میں اکیلا کھڑا رہ سکوں۔

چنانچہ میں بھاگ کر اُٹھ گیا اور دروازہ بند کر لیا۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا، ماں جی بدستور سوئی ہوئی تھیں۔

بہر حال یہاں ان کے دجو دکا سہارا کافی تھا، میں نے اپنے بستر کا رخ کیا اور دبک کر لیٹ گیا۔۔۔۔۔

نہ جانے کب تک وہ پراسرار آوازیں بازگشت کی طرح میرے کانوں میں گونجی رہیں اور پھر خود بہ خود ہی میری آنکھ لگ گئی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن صبح ہی صبح رجم بابا کی شکل دکھائی دی، ان کے عجیب تاثرات تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

”کیا بات ہے رجم بابا؟“

”پرتوجہ دو۔ تاکہ اچھی نوکری مل سکے۔۔۔۔۔ مجھے جلد تمہاری شادی کرنی ہے، میں اپنی زندگی میں ہی کی بہاریں دیکھنا چاہتی ہوں۔“
”یہ سب کچھ ضرور ہوگا اماں جی۔۔۔۔۔ آپ فکر مت میں نے کہا۔

☆.....☆.....☆

رات کے وقت نہ جانے کیوں مجھے نیند آ رہی تھی۔۔۔۔۔ میں کافی دیر تک آنکھیں بند کئے پڑا رہا، اور پھر آگنا کاشٹھ بیٹھا۔

اماں جی اپنے بستر پر بے خبر سو رہی تھیں۔۔۔۔۔ میں ان کو جھل پٹنی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

خوشی سی ہوا کے جھونکے نے میرا استقبال کیا۔۔۔۔۔ اس گھر میں تھا ہی کون؟ چاروں طرف

کاراج تھا۔۔۔۔۔ ہوا کا عالم تھا۔۔۔۔۔ اس قدر خاموشی تھی

کی اس سرسراہٹ صاف طور پر گونج رہی تھی۔

میں نے ایک طویل سانس لی، نہ جانے کیوں لی لڑکی کا سراپا، میری آنکھوں کے سامنے کھونٹے

تھے وہ منظر بھی یاد آیا جب میں برہنہ حالت میں ان کے سامنے آ گیا تھا۔

مثلاً میں ضرور کوئی خاص بات تھی، وہ میرے سے چپک کر رہ گئی تھی اور اب دل میں صرف یہی تھنا

کہ کسی بھی طرح اس سے مل بیٹھوں، خوب باتیں

ان اور۔۔۔۔۔ جس قدر ممکن ہو۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ وقت

لڑوں۔۔۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ کس طرح

ہو گا؟۔۔۔۔۔ یہ بات غور طلب تھی۔

”کھیل۔۔۔۔۔ کھیل۔۔۔۔۔“ اچانک ایک آواز نے

میرا دل دھچکا دیا۔

میں نے فوراً ہی ادھر ادھر دیکھا، لیکن کوئی بھی تونہ

اب میں نے کمرے کی طرف دیکھا کہ کہیں اماں

نہ نکلا رہا ہو۔ لیکن دروازہ بھی خالی پڑا تھا۔

”کھیل۔۔۔۔۔ سنو کھیل۔۔۔۔۔“ ہوا کے دوش پر ایک

آواز ابھری۔

اب خوف مجھ پر طاری ہونے لگا، میں نے فوراً ہی

میں اس سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“
”اوہ۔۔۔۔۔“ سہو کے منہ سے نکلا۔
وہ میری طرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔
گھر واپس آیا تو ماں جی کو شدت سے اپنا منہ

پایا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم کہاں چلے گئے تھے۔۔۔۔۔؟“
”سہو کے ساتھ تھا اماں جی۔۔۔۔۔“ میں نے گول

مول جواب دیا۔

”ہم دونوں ذرا کھیل میں مصروف تھے۔“
”یہ تو ٹھیک ہے کہ تم سہو کے ساتھ

تھے۔ انہوں نے مجھے کھوڑا۔“
”لیکن کھیل کون سا کھیل رہے تھے؟“

”جی۔۔۔۔۔ میں سٹ پڑ گیا۔“
”وہ۔۔۔۔۔ اماں جی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“

”بس رہے دو۔۔۔۔۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے

چپ کر دیا۔

”تم ضرور کھیل کی طرف چلے گئے ہو گے۔“
”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”قسم لے لو اماں جی۔۔۔۔۔“ میں جھٹ سے بولا۔

”ہم کھیل رہے تھے۔“

”جانا بھی نہیں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ میں نے کہہ

دیا ہے۔ اگر تم وہاں بیٹھنے بھی تو مجھ سے برا کوئی نہ

ہوگا۔“

”آپ بے فکر رہیں۔۔۔۔۔ میں وہاں بھٹکتا بھی

نہیں ہوں۔۔۔۔۔“ میں نے سر ہلا کر کہا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، وہ کچھ سوچ رہی

تھیں۔ پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔

”میں نے محلے کی ایک عورت سے اپنے گھر کا

ذکر چھیڑا ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

”کس سلسلے میں اماں جی۔۔۔۔۔“ میں نے پوچھا۔

”گھر کا ایک حصہ کرائے پر دے رہی ہوں۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ یہی کرنا ہوگا۔۔۔۔۔ تم اب صرف اپنی

اور اب میرے ذہن میں اس ہیوے کی جگہ مثلاً
کا سراپا گھوم رہا تھا۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں؟
راستے میں خاموش دیکھ کر سہو نے پوچھ ہی لیا۔
”اب بتا دو کہ تم کہاں گئے تھے۔۔۔۔۔؟“

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”یار۔۔۔۔۔ میں تو اس کے تعاقب میں گیا تھا

جو مجھے بار بار دکھائی دیتا ہے، لیکن وہاں کچھ اور ہی

نظر آ گیا۔۔۔۔۔“

”اب اور کیا دیکھ لیا تم نے۔۔۔۔۔“ سہو نے حیرت

سے پوچھا۔

”یار۔۔۔۔۔ تمہاری آنکھوں میں خورو بین تو فٹ

نہیں ہے۔ کیا کیا دیکھ لیتے ہو تم۔۔۔۔۔؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ جیسی تمہاری

آنکھیں ہیں ویسی ہی میری بھی ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ خانہ

بدوش کی ہستی وہاں سے کتنی دور ہے۔۔۔۔۔؟“

”کیوں۔۔۔۔۔؟ یہ کس خوشی میں پوچھ رہے

ہو۔۔۔۔۔؟“

”یونی۔۔۔۔۔“ میں نے کندھے اچکائے۔

”تم ضرور کچھ چمپا رہے ہو۔۔۔۔۔“ اس نے غور

سے مجھ دیکھا۔

پھر اس کے اصرار پر مجھے زبان کھلنی ہی پڑی۔

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور بولا۔

”تو تم کو انہوں نے نہ دکھا دیکھا۔۔۔۔۔؟“

”ہاں یار۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ان سے

بدیہیز ہو جائے گی۔ میں تو فیس میں نکلا تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ مجھے

وہاں جوا کٹر دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔۔ میں تو اس کے

چکر میں باہر آیا تھا۔“

”ایک تو تمہارے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہے۔ وہ

آہستہ سے بولا۔

”خیر۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ اب تم خانہ بدوشوں کا کیوں

پوچھ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“

”یار۔۔۔۔۔ مثلاً نہی لڑکی مجھے بہت اچھی لگی ہے۔

”بات تو خاص ہے بیٹا۔“ وہ پیکے سے انداز میں مسکرائے۔

”تمہارے ماموں آگئے ہیں۔“

”اوہ۔“ میرے منہ سے نکلا۔

اماں جی اس وقت وہاں موجود نہیں تھیں۔ وہ چائے بنانے میں مصروف تھیں۔

”ہاں۔“ وہ بولے۔

”وہ کل شام سے آئے ہوئے ہیں، لیکن انہوں نے ایک بار بھی تمہارے والے کمرے کی خبر نہیں لی، اور نہ ہی مجھ سے کچھ پوچھا۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ممانی نے ان کے کان بھر دیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ایسا کچھ کہا ہو کہ قاسم ماموں شاید اب ہم لوگوں سے رابطہ بھی نہ کریں۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔“ وہ سر ہلا کر بولے۔

”کیونکہ اگر وہ عورت ایسا نہیں کرے گی تو خود اس کے لئے مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔“

”لیکن میں قاسم ماموں کو حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اب میرے دل میں یہ خواہش ہرگز نہیں ہے کہ میں واپس ان کے گھر میں جاؤں۔ لیکن میں یہ بھی نہ چاہوں گا کہ ان جیسا شخص بے وجہ کسی مشکل میں گرفتار ہو۔ کیونکہ اسی گھر میں ان کی موت کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔“

”کیا میں قاسم میاں سے ذکر کروں۔“ رحیم بابا نے سادگی سے پوچھا۔

”ارے آپ یہ غضب مت کیجیے گا۔“ میں چونک کر بولا۔

”اگر انہوں نے غصے میں آ کر آپ کو کچھ کہہ دیا تو مجھے بہت دکھ ہوگا، اور میں پھر بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ میں نے ہی آپ کو حالات سے آگاہ کیا تھا۔“

”لیکن مجھے ہرگز غصہ نہیں ہوگا۔“ وہ بولے۔

”اور نہ ہی میں تمہیں کوئی دوش دوں گا، میں نے اپنے مالک کا نمک کھایا ہے اور میں یہی چاہوں گا کہ قاسم میاں کو ان خطرات سے آگاہ کروں کہ جن کی آغوش خبر نہی نہیں ہے۔“

”آپ خود کو اس معاملے سے الگ رکھ کر میری مدد کریں۔ مجھے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔“

اسی وقت اماں جی دروازے سے اندر داخل ہوئیں، ان کے ہاتھوں میں ناشے کی ٹرے تھی، رحیم بابا بول اٹھے۔

”ارے آپ نے یہ تکلیف کیوں کی۔؟“

”اس لئے کہ آپ بھی ٹھیکل کے ساتھ ہی ناشہ کریں۔“ وہ مسکرائیں۔

”یہ بھی بھوکا ہے۔۔۔ اور شاید آپ بھی ناشہ کر کے نہیں آئے ہوں گے۔“

یہ کہہ کر وہ واپس سڑکیں پھر اچانک ہی دروازے کے قریب جا کر ٹھیکل اور رحیم بابا کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ کر بولیں۔

”میرا بیٹا اپنے ماموں کے لئے بہت پریشان ہے۔۔۔ آپ اس کی مدد ضرور کریں۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئیں، میں رحیم بابا کی طرف حیرت سے دیکھ کر بولا۔

”یہ ماں جی کو اچانک کیا ہو جاتا ہے رحیم بابا۔“

”ہاں۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں۔“ وہ سر ہلا کر بولے۔

”یہ بعض اوقات اپنے آپ میں نہیں ہوتیں۔ ارے بیٹا۔ بہت سے معاملات ہیں، جن کو دیکھنا ہے اور ان کے ساتھ جبراً آزما ہونا ہے۔۔۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک طویل سانس لی۔

”کل رات کو مجھے میرے نام سے کئی بار کسی نے پکارا۔“ میں نے رات کا واقعہ دہراتے ہوئے کہا۔

”یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا کے دوش پر وہ آواز کوئی رہی ہو۔“

”اچھا۔“ وہ قدرے فکر مند ہو گئے تھے۔

”جی ہاں۔۔۔“

”ضرور تم ڈرے ہو گے۔؟“

”کافی حد تک۔“ میں نے سر ہلایا۔

”بس یہی تمہیں اپنے دل سے نکالنا ہے۔“ وہ بولے۔

”کیونکہ ڈر کے ہوتے ہوئے کچھ نہیں۔۔۔ جہاں خوف آ گیا وہاں ہار ہوگئی۔“

اب میں نے آغوشِ چشمے و لاد واقعہ بھی بتا دیا، وہ سن کر ہنسنے لگے اور بول اٹھے۔

”یہ۔۔۔ یہی رویہ رکھو۔ یوں جیسے وہ صرف دھوکا ہو، زرا دوا ہو۔۔۔ تم اس سے دور بھاگنے کے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرو۔“

”لیکن رحیم بابا وہ ہے کون۔۔۔ اور کیا چاہتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”جس طرح وہ مجھے جگہ جگہ دکھائی دے رہا ہے۔ آواز سن دے کر پکار رہا ہے، اس سے تو اندازہ لگادہ مشکل مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔“

”ہاں۔۔۔ لیکن تم ان سب باتوں کو نظر انداز نہ کرو۔“ وہ بولے۔

”اگر تم نے انہیں خود پر حاوی کر لیا تو پھر کچھ بھی ہو سکے گا۔“

”تو کیا۔۔۔ یہ وہی ہے جس نے اماں جی کا روپ میرے باپ کو مارا تھا۔ اور ان کی جان لی گئی؟“

”ہاں۔۔۔ شاید یہ وہی ہے۔“ رحیم بابا نے بولے۔

”اور تمہاری اماں جی کے مطابق اس کا نام جان۔“

”تو پھر وہ میری بھی جان لے سکتا ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی اس کے رحم میں آؤں۔“

”میں اس بارے میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔“

کروں گا۔۔۔ وہ بولے۔

”فنی الحال جو مسئلہ درپیش ہے، وہ تمہارے ماموں کا ہے۔۔۔ ان کے لئے کیا کرنا ہے؟“

”یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”آپ مجھے یہ بتائیں کہ وقار نامی آدمی کا گھر کہاں ہے۔؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

☆ ☆ ☆

شام کے وقت میں ایک خوب صورت سی کوٹھی کے سامنے موجود تھا، یہ کوٹھی اسی وقار کی ملکیت تھی، جو ممانی کے ساتھ مل کر قاسم ماموں کے خاتمے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

میں نے کچھ سوچ کر دروازے پر کھٹی ہوئی تیل بجادی۔ تھوڑی ہی دیر بعد قدموں کی آواز ابھری اور پھر کسی نے دروازہ کھول دیا۔

ایک دراز عمر کی موٹی سی عورت مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے وقار صاحب سے ملنا ہے۔“ میں جلدی سے بولا۔

”کیا تو کوری چاہئے۔؟“ قدرے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

”جی نہیں۔۔۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”بہت ضروری کام ہے۔“

”بھلا تمہیں اس سے کیا کام ہو سکتا ہے۔“

”یہ میں ان ہی کو بتا سکتا ہوں۔۔۔ میں بھی اکڑتے ہوئے بولا۔

”کیا آپ مجھے ان سے ملوا سکتی ہیں۔۔۔؟“

”اچھا۔۔۔ زرا روکو۔“

یہ کہہ کر اس عورت نے دروازہ بند کر لیا، جلد ہی دروازہ دوبارہ کھلا تھا اور ایک مردانہ چہرہ دکھائی دیا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا، مجھے یقین تھا کہ اس شخص کا سراپا اور ضد و خال قاسم ماموں کے گھر میں دیکھ چکا ہوں۔

یہ سو فیصد وہی تھا، جو رات میں چوری چھپے قاسم ماموں کے گھر آیا کرتا تھا۔

میں اسے پہچان چکا تھا۔
 ”کون ہو؟“ وہ غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”مجھ سے کیا کام ہے تمہیں؟“
 ”مجھے صبح نے بھیجا ہے۔ میں نے ممانی کا نام لیا اور ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔“
 ”کیسا پیغام؟“ وہ چونک کر بولا۔
 ”آپ آج وہاں نہیں جائے گا۔“ میں آہستہ سے بولا۔
 ”کیونکہ قاسم صاحب آپ کے ہیں۔“
 ”اوہ۔“ اس کے منہ سے نکلا۔
 ”ٹھیک ہے۔ لیکن تم۔“
 ”میں ان کے مالی رجیم بابا کا بیٹا ہوں۔“ میں نے جھٹ سے کہا۔
 ”اور میں اس بات سے واقف ہوں کہ آپ وہاں آتے ہیں۔“
 ”اچھا۔“ اس کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ تدریس سخت لہجے میں بولا۔
 ”لیکن اگر تم نے یہ بات کسی اور کو بتائی تو اچھا نہ ہوگا۔“
 ”آپ فکرت کریں۔“ میں مسکرایا۔
 ”کیونکہ میں صبح صاحب کا وفادار ہوں۔“ اور وہ میرا ہر طرح سے خیال دیتی ہیں۔
 ”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا نوٹ نکالا اور اسے میری طرف بڑھا کر بولا۔
 ”اس ملاقات کو اپنی حد تک رکھنا۔ تم کافی کام کے معلوم ہوتے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ۔
 ”میں نے فوراً ہی نوٹ ہاتھ میں پکڑ کر اسے بڑے ادب سے سلام کیا اور بولا۔
 ”ٹھیک ہے صاحب۔ میں چلتا ہوں۔“
 اس نے سر ہلا کر دروازہ بند کر لیا۔ میں نے ہاتھ سے اپنی جیب کو ٹٹولا اور اس میں رکھی ہوئی چیز

کو تھپتھا کر مطمئن انداز میں گھوم گیا۔
 بھر میں وہاں رکنا نہیں تھا، البتہ تھوڑی دور جا کر میں نے جیب سے اس چیز کو نکال لیا۔
 یہ ایک چھوٹا سا شیپ ریکارڈ تھا، اب میرا رخ قاسم ماموں کے آفس کی طرف تھا۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری تھا۔
 قاسم ماموں اپنے آفس میں موجود تھے، مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر شدید غصہ اور نفرت کے آثار پھیل گئے۔
 ”چل جاؤ نکلیں۔“ وہ بلند آواز میں بولے۔
 ”اس سے پہلے کہ میرے منہ سے غلط الفاظ نکل جائیں۔ تم یہاں سے چل جاؤ۔“
 ”میں آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا ماموں۔“ میری آواز میں دھک تھا۔
 ”لیکن اس سے پہلے میں آپ کو کہہ سنانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں کچھ بتائیں سکتا۔“ البتہ سنا ضرور سکتا ہوں۔
 یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا شیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ میری اور وقار کی آوازیں گونجنے لگیں۔
 قاسم ماموں کے چہرے پر اب حیرت کے تاثرات تھے۔ شیپ کی ہوتی گفتگو ختم ہوئی تو ان کے منہ سے نکلا۔
 ”یہ۔“ یہ کیا ہے؟“
 ”میں ممانی صاحبہ کے بارے میں کچھ نہیں سکتا۔“ میں نے بخیر لہجے میں کہا۔
 ”لیکن وقار نامی یہ شخص اس سانپ کی طرح ہے، جسے آپ نے اپنی آستین میں پال رکھا ہے۔ میں جانتا کہ میرے اور ماں جی کے بارے میں آپ کو کیا ضرور جانتا ہوں کہ میں جس صبح کو گھر سے گیا ہوں۔ اس سے پیشتر گزرنے والی رات کو میں وقار کو۔ آپ کے کمرے میں دیکھ لیا تھا۔“
 ”نکلیں۔“ قاسم ماموں کی آواز میں نفرت کی

”ہاں ماموں۔“ میں غم زد لہجے میں بولا۔
 ”مجھے اس بات کا دکھ نہیں ہے کہ ممانی صاحبہ نے وہاں سے نکال دیا، بلکہ دکھ اس بات کا ہے کہ آپ انسان کو نہ صرف دھوکا دیا جا رہا ہے، بلکہ آپ کو راستے کی سازش بھی تیار کی جا رہی ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“ وہ چونکے۔
 ”جواب میں نے صحر ممانی اور وقار کے درمیان ہونے والے معاملے کے بارے میں ان کا چہرہ دیکھنے سے جانتا تھا، ایک رنگ آ رہا تھا، تو دوسرا جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ان پر ترس آنے لگا، میں نے انہیں کہا۔
 ”یقین کریں کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں کے ظلم میں لائے بغیر ہی اس معاملے کو دیکھ لیتا۔“
 ”زرے ہوئے وقت نے جو کچھ مجھے دکھایا ہے۔“
 ”میرے اعصاب کافی مضبوط کر دیئے ہیں۔“
 ”میرا سب کچھ چھین لیا گیا۔ اور اب میں اس دنیا میں۔“
 ”یہاں۔“
 ”یہاں۔“ وہ ٹپٹپٹا۔
 ”تمہاری ماں ہے، میں ہوں۔ ہم لوگ ہمارے پاس۔ تم تنہا نہیں ہو، اس عورت نے تم کو قوی طور پر ضرور تم سے دور کر دیا تھا، لیکن اب تم انہوں سے پردہ ہٹ چکا ہے۔ میں تم سے منددہ ہوں۔“ اس نے تم پر الزام لگایا تھا کہ تم نے سناٹے میں تم نے اس کمرے میں گھسنے کی کوشش کی اور۔“
 ”وہ بولتے بولتے رک گئے۔ میں نے ایک طویل اور بولا۔
 ”ممانی نے اپنی سوچ کے مطابق ہی کام کیا۔ خیر۔ جو راسخ ہوا۔ اب آپ صرف اپنی جان کی پرواہ کریں۔ اور دشمنوں سے خود بچیں۔“
 ”میں۔“ میں کیا کروں۔ تم ہی بتاؤ۔ یہ کہہ کر میرا ذہن ماؤف سا ہو رہا ہے، جس عورت

کو میں نے دنیا بھر کی خوشیاں سمیٹ کر دیں۔ اپنا آپ اس پر بھروسہ کر دیا۔ اس نے مجھے یہ صلہ دیا۔“
 ”میں کیا کروں؟“
 ”آپ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے انہیں حوصلہ دیا۔
 ”بچہ تو آپ کے پاس ہے، بس ان دونوں بچیوں کو اس میں بند کرنا باقی ہے۔“
 ”بچہ؟“ کیا مطلب؟“ قاسم ماموں نے حیرت سے میری شکل دیکھی۔
 ”آپ کے گھر کا وہ کمرہ ہی ان دونوں کے لئے بچہ ثابت ہوگا۔“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”میں آپ کو بتاتا ہوں کہ۔“ کرنا کیا ہے۔“
 ”میں نے جو منصوبہ ترتیب دیا تھا، اس کے بارے میں مجھے رجیم بابا سے بگے معلوم ہوتا رہا۔ کیونکہ وہ اکثر ہمارے گھر پر آیا کرتے تھے۔“
 ”اس دوران انہوں نے آدھا مکان کرائے پر اٹھا دیا تھا، بابا جی والے حصے میں اب کرائے دار آپ کے تھے اور وہ حصہ بادو گیا تھا۔“
 ”دونوں حصوں کے درمیان جو خلاء تھا، اس دروازے کو پھاٹ دیا گیا تھا اور اس دیوار کی وجہ سے ہمارا گھر اب دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔“
 ”رجیم بابا بھی اب ہمارے ساتھ شریک تھے، چنانچہ اسی ہفتے میں ایک دن شام کے وقت وہ قاسم ماموں کے ساتھ گھر آ گئے۔“
 ”انہیں دیکھ کر ماں جی سارے گلے شکوے بھول گئیں۔ بہن اور بھائی اپنے مقدس رشتے کا پاس رکھتے ہوئے گلے ملے۔“ دونوں ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
 ”قاسم ماموں نے ممانی صاحبہ کے سلوک اور اپنی بے اعتنائی کی معافی بھی مانگی تھی۔“
 ”ماں جی کو یہ جان کر بہت خوش ہوئی کہ قاسم ماموں اور رجیم بابا آج گھر میں ہی رہیں گے۔“

وہ فوراً ہی کھانے پکانے کی فکر میں جھلا ہو کر کچن کی طرف چلی گئیں اب میں قاسم ماموں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جی ماموں..... کیا حال چال ہیں.....؟“
”پتا نہیں.....“ انہوں نے مزاحیہ انداز میں کندھے اچکائے۔

”کیونکہ میں آج شہر سے باہر گیا ہوں.....“
”بھئی..... کاروباری سلسلے میں.....“

”اوہ..... گڈ.....“ میں مسکرایا۔
”یعنی آج رات کافی اہم ہے..... اور شاید انجام خیر بھی۔“

”ہاں.....“ انہوں نے قدرے خمیوگی سے کہا۔
”انہوں نے قدرے خمیوگی سے کہا۔“

”میں نے سارا انتظام کر دیا ہے..... اور مجھے یقین ہے کہ وہ آج ضرور وہاں آئے گا..... کیونکہ میں نے اس دوران سحر کو بالکل موقع نہیں دیا کہ وہ جہاں گئیں جاسکے..... میں پورے ہفتے کسی سائے کی طرح اس کے ساتھ رہا ہوں۔“
”یہ آپ نے بہت اچھا کیا.....“ میرے منہ سے نکلا۔

”رات کے وقت ہم یہاں سے نکلیں گے.....!“
”انہوں نے بتایا۔“

”میں نے اپنے ایک ذمہ دار دوست کو سب کچھ بتایا ہے وہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایک اہم عہدے پر فائز ہے..... ظاہر ہے کہ ہمیں ایسے معاملات کے لئے ٹھوس ثبوت کے ساتھ ساتھ گواہ کی بھی ضرورت ہے۔“

”بالکل ٹھیک.....“
”ویسے سحر مجھے پنکک کے پراگرام کے لئے اکساتی رہی ہے.....“ انہوں نے بتایا۔

”میں نے تو صاف منع کر دیا مجھے یقین ہے کہ اسی پنکک میں کچھ گڑبڑ کا امکان ہے..... ہو سکتا ہے کہ وہاں دقار خود بھی موجود ہو۔“

”ممکن ہے ماموں.....“ میں نے سر ہلایا۔

”اور کچھ بعید نہیں کہ وہ لوگ اسی پروگرام میں آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔“

”ہاں.....“ وہ بولے۔
”مگر تم نے میری آنکھیں نہ کھولی ہو تم تو شاہ مجھے کسی گہری کھائی میں دھکیل کر گناہی کی سوسہ مار دیا جاتا.....“

☆.....☆.....☆
آدھی رات کے وقت قاسم ماموں کی کاروبار پر سڑک پر دوں دوں تھی..... ساتھ والی سیٹ پر ان کا دوسرا برائے جہان تھا، جبکہ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

ان کے دوست کا نام ریحان احمد تھا، اور وہ پولیس کے مجھے سے تعلق رکھتا تھا، چونکہ آدھی رات ہو رہی تھی، اس لئے کچھ جگہوں پر پولیس کی گاڑیوں نے ہمیں روکا، لیکن ریحان احمد کی بدولت فوراً ہی ہماری کار پارٹی منزل پر دوں دوں ہو گئی تھی۔

پھر قاسم ماموں کے گھر سے ذرا فاصلے پر کار کو روک دیا گیا تھا سب سے پہلے ریحان صاحب اترے، ان کے پیچھے میں اور قاسم ماموں بھی باہر نکل آئے۔

صدر دروازے کے قریب پہنچ کر قاسم ماموں نے اسے دھک دیا، وہ آہستگی کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ انہوں نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولے۔

”یہ رحیم بابا کا کام ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قارندہ موجود ہے۔“

”جی.....!“ میں نے اتنا ہی کہا تھا۔
”تنہوں اندر داخل ہو گئے، چاروں طرف تاریکی اور نیم تاریکی کا راج تھا..... اور چاروں طرف کا ماحول سناتے میں ڈوبا ہوا تھا۔“

”عین اسی وقت ایک سایہ ہماری طرف بڑھا، سایہ اچانک ہی نمودار ہوا تھا، ریحان احمد نے فوراً ہی ہاتھ پٹل نکال لیا لیکن اسی وقت سایہ بول اٹھا۔“

”میں رحیم ہوں..... آپ لوگوں کا انتظار

”لوہ.....“ قاسم ماموں کے منہ سے نکلا پھر وہ

”یہ مادہ اندر موجود ہے؟“
”جی ہاں صاحب.....“ رحیم بابا نے جواب دیا۔
”وہ دروازے کی دھڑکیوں سے یہاں آچکا ہے۔“
”ٹھیک ہے رحیم بابا.....“ قاسم ماموں نے مدغم ہوا تھا۔

”آج کا کام ختم ہو گیا..... اب آپ آرام

”جی بہتر.....“ وہ بولے اور پھر فوراً ہی ایک کمرہ لے گئے۔

اب ہمارے قدم گھر کے اندرونی حصے کی طرف ہوتے پورچ سے ہوتے ہوئے ہم برآمدے میں گئے، جلد ہی قاسم ماموں کا کمرہ ہمارے سامنے

ایسے میں ریحان احمد نے سرگوشی میں پوچھا۔
”قاسم..... کبھی کمرہ ہے؟“

”ہاں.....“ انہوں نے سر ہلایا۔
”اس کا کوئی اور دروازہ تو نہیں ہے.....؟“

”نہیں.....“
”بھئی..... ٹھیک ہے.....“ ریحان احمد نے اشارے سے اطمینان کا اظہار کیا اور پھر قاسم ماموں کے بڑھ کر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

کوئی جواب نہ ملا تو قاسم ماموں نے ایک بار پھر دھڑکیوں سے دھکا دیا۔
”تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔“
”کون ہے.....؟“ یہ سحر ممانی کی آواز تھی۔

”لوں لگ رہا تھا جیسے وہ نیند میں ڈوبی ہوئی.....“
”ہمارے جھک رہا تھا میں ان کی ذہانت کی داد دیتے

”دروازہ کھولو سحر.....“ ماموں نے پرسکون لہجے

میں کہا۔
”میں ہوں.....“
”آپ.....؟“ ان کی گویا آواز ہی پھٹ پڑی۔

”آپ تو..... شہر سے باہر گئے تھے.....“
”ہاں..... لیکن جس کام سے گیا تھا وہ ہونہ

”جی..... جلدی دروازہ کھولو۔“
”جی..... میں کھولتی ہوں.....“ ممانی کی آواز میں صاف لغزش تھی۔

”ذرا رکھیں.....“
پھر شاید وہ واپس پلٹی تھیں قاسم ماموں نے پلیٹ کر ہم دونوں کی طرف دیکھا، ریحان صاحب نے انہیں رککنے کا اشارہ کیا تھا۔
”تھوڑی دیر اور گزری، لیکن دروازہ نہیں کھلتا تھا، اب قاسم ماموں نے دوبارہ دستک دے ڈالی اور بلند آواز میں بولے۔“

”کیا ہوا سحر..... کیا دوبارہ سو گئیں.....؟“
کوئی جواب نہیں ملا، اتنی دیر میں تیر قدموں کی چاپ ابھری اور پھر ملازم نصیر اور اس کی بیوی کی شکلیں دکھائی دیں۔

”ہمیں دیکھ کر ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے نصیر نے بول کلاہٹ میں کہا۔“

”صاحب..... آپ.....؟“
”ہاں..... میں..... کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ وہ اس پر اٹھوے۔

”جی..... جی..... نہیں..... اعتراض کیوں ہوگا بھلا.....!“ وہ جلدی سے بولا۔
”ہماری کیا عیال کو کوئی اعتراض کریں۔“

”تو پھر.....؟“
”اسی وقت نصیر کی بیوی آگے بڑھی۔“
”صاحب..... آپ آج کبھیں اور سو جائیں.....“

”میں صاحب نہیں اٹھیں گی۔“

”کیوں.....؟“
 ”ان کی طبیعت لمبک نہیں ہے۔“ وہ بولی۔
 ”رات کو دورانی کھا کر سوئی ہیں۔“
 ”اوہ.....“ قاسم ماموں نے اسے گھورا۔
 ”خوب..... دواؤں اکثر سے لی تھی؟“
 ”جی ہاں.....“ وہ پٹاخ سے بولی۔
 ”میں بھی ساتھ تھی۔“

”اچھا.....“
 ”جی ہاں.....“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔
 ”آپ لوگ دوسرے کمرے میں آ جائیں۔“
 ”میں صاحب سے مل لیجے گا۔“
 ”ہاں..... بالکل.....“ نصیر نے لقمہ دیا۔
 ”آپ ڈرائنگ روم میں آ جائیں۔ میں کھانا بھی لگا دیتا ہوں۔“

”اچھا..... تم کھانا لگاؤ.....“ قاسم ماموں بھی موڈ میں تھے، میں ڈرائنگ روم میں نصیر صاحب کی طبیعت پوچھ کر آتا ہوں۔
 ”جاؤ۔“
 ان دونوں نے بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بادل ناخواستہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔
 ”ریحان احمد نے“ معنی خیز لگا ہوں سے قاسم ماموں کی طرف دیکھا قاسم ماموں نے اس بار ڈوردار اندازہ دواڑہ پیٹ ڈالا۔

”سحر.....“ دروازہ کھولو.....“ وہ دباڑے۔

”ورنہ میں اسے توڑ دوں گا۔“
 فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور مہمانی کی متحوش شکل دکھائی دی، مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے کا رنگ مزید پیکا پڑ گیا۔
 قاسم ماموں نے انہیں دھکا دیا اور کمرے میں داخل ہو گئے۔
 قصہ مختصر یہ کہ دواڑہ رینگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اس کے سمیت سحر مہمانی کو جو ذلت اور خفت اٹھانی پڑی اسے بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔

نصیر اور اس کی بیوی بھی ان دونوں کے ساتھ شامل تھے۔ قاسم ماموں نے ان سب کے ساتھ صرف اتنا کیا کہ انہیں اسی وقت گھر سے بے دخل کر دیا تھا۔
 اس کے علاوہ اور کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوئی تھی، قاسم ماموں نے سب کے سامنے مہمانی صاحبہ کو طلاق دے دی تھی۔

سحر مہمانی کے ساتھ ساتھ وقار کا بھی بہت برا حال تھا ان دونوں کی کیفیت ایسی تھی کہ کانٹو بدین میں اپونئیں..... گویا زمین بٹے اور دونوں اس میں ساں جائیں..... ریحان احمد نے کہا بھی تھا کہ کم از کم وقار کو جیل کی ہوا کھانی چاہئے۔ لیکن قاسم ماموں نے متح کر دیا..... اور پھر بولے۔

”ان لوگوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں ان سب کو اپنی زندگی سے نکال رہا ہوں..... مزید کوئی اور سزا دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے ان لوگوں کو اہمیت دے دی..... لیکن میں ایسا نہیں کروں گا..... میں نے انہیں مکھن میں سے بال کی طرح نکال پھینکا ہے..... اور مجھے امید ہے کہ یہ لوگ ابھی مجھے اپنی صورت بھی نہیں دکھائیں گے۔“

چاروں ہارے ہوئے جوار یوں کی طرہ سر جھکائے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے اسی وقت میری نظر رجیم بابا پڑی۔
 وہ ایک کونے میں عزمین انداز میں کھڑے تھے۔

☆.....☆.....☆

قاسم ماموں کے بے حد اصرار کے باوجود میں ان کے گھر واپس نہیں گیا تھا، اماں جی کو جب حالات کا علم ہوا تو وہ سکتے میں آ گئیں۔
 قاسم ماموں اس وقت حویلی میں ہی موجود تھے اور ان کی کوشش تھی کہ وہ مجھے اور اماں جی کو اپنے ساتھ لے جائیں۔

لیکن میں پہلے ہی اماں جی کو سمجھا چکا تھا چنانچہ..... بولیں۔
 ”قاسم..... تم ہماری فکر مت کرو..... تم یہاں

آؤ..... ہم بھی ضرور آئیں گے لیکن اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جاسکتے۔“

”ہاں.....“ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کو ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔“ قاسم ماموں بولے۔
 ”میں ہمیشہ اس بات پر تادم رہوں گا کہ سحر کے ہر میں نے آپ لوگوں سے کتنا شکر ہی کرتی تھی۔“
 ”ایسی کوئی بات نہیں ہے قاسم.....“ اماں جی نے

”ہمارے دل بالکل صاف ہیں، بلکہ مجھے تو خوشی ہے کہ وہاں جانے اور پھر وہاں سے نکلنے میں حقیقت کا پتا لگنا خدا نہ کرے اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچتا تو ہمیں کدھ ہوتا۔“ اب تم جلد سے جلد شادی کر لو اور ایک نئی

”شادی.....“ ماموں کے منہ سے نکلا۔

”ہاں بھئی.....“ اماں جی مسکرائیں۔
 ”جب سحر اس موٹے سے شادی کا کھیل رچا سکتی تو تم کیوں اپنی زندگی برباد کرو.....؟ تمہیں بھی پورا ہے کہ ایک ابھی زندگی کی ابتدا کرو۔“

”بات تو تمہیک ہے آپ کی.....“ قاسم ماموں

”لیکن اب عورت ذات سے میرا بھروسہ ہی اٹھ

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ اماں جی نے

”دنیا میں اگر سب ایک جیسے ہو جائیں تو دنیا بھٹ کھلائے گی یا پھر جنم..... ساری عورتیں بھی ایک ہیں ہوتیں..... اب تم جاؤ اور جلدی سے اپنے لئے ابھی سی لڑکی ڈھونڈ لگاؤ..... ورنہ پھر میں تلاش کی اور تمہیں اسی سے شادی کرنی ہوگی..... میں اس کام کے لئے ایک ہفتے کا ٹائم دے رہی ہوں مدت میں اگر تم نے کوئی لڑکی پسند نہ کی تو میرا دل میں اتر جاؤں گی۔“
 اور پھر واقعی قاسم ماموں کسی لڑکی کی تلاش میں

سرگرداں ہو گئے..... اماں جی کی باتوں نے ان پر بھرپور اثر کیا تھا اور یہ ایک خوش آئند بات تھی۔

میں کافی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا کہ اب اماں جی پر کسی قسم کا کوئی ”دورہ“ نہیں پڑ رہا تھا..... ورنہ ہر دوسرے دن وہ کسی ”جان لیوا“ کا کوئی نہ کوئی بیٹھام سناری ہوتی تھیں۔

اس دوران رجیم بابا کا بھی آنا جانا لگا ہوا تھا..... سحر مہمانی کے معاملے سے فارغ ہوتے ہی مجھے شالا یاد آ گئی۔

وہی شالا..... جو مجھے جسے کے قرب و جوار میں ملی تھی..... اور پھر اس کا وجود میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا..... اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش اب بھی میرے دل میں جاگ رہی تھی..... اور اب تو اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

چنانچہ ایک دن میں اپنے دوست یعنی سدو کے پاس جا پہنچا..... میں اس سے پہلے بھی شالا کے بارے میں بات کر چکا تھا، اس نے ایک بار میری خواہش سنی تو فوراً بول اٹھا۔

”ارے یار..... تم نے دل بھی دیا ہوا کہاں دیا..... جنگل میں..... واہ.....“

”جنگل میں نہیں..... لڑکی کو دیا ہے.....“ میں نے سچ کی۔

”راہی تو وہ جنگل میں ہے نا.....“

”تو کیا ہوا.....؟“ میں نے کہا۔

”میں اسے اماں جی سے ملاؤں گا، اور پھر شادی کر کے گھر لے آؤں گا..... یوں بھی اماں جی جلد سے جلد میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔“

”ہوں.....“ اس نے سر ہلایا۔

”لیکن اگر انہوں نے اسے دیکھ کر انکار کر دیا..... تو کیا ہوگا.....؟“

”اسے تم نے نہیں دیکھا.....“ میں بولا۔
 ”ورنہ تم ایسی بات نہ کرتے..... یقین کرو کہ میں نے ابھی تک اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“

”ہاں..... یوں سمجھ لو کہ کونسل کی کان میں ہیرا ہے۔ اور جب اسے نکال کر تراشہ جائے گا تو اس کی چمک دمک کا کیرا عالم ہوگا۔“

”میں سمجھ گیا..... لیکن میرے دوست..... وہ لوگ خانہ بدوش ہیں، بگڑی ہوئی پھرنا ان کا کام ہے۔ اور پھر نہ جانے وہ لوگ کس دماغ کے ہوں..... ان لوگوں کی ذہنیت کیا ہو۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“ میں نے غور سے اسے دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”ان کا علاقہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“ تمہاری بات ٹھیک ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ ”لیکن پھر میں کیا کروں.....؟ مجھے اس لڑکی سے ملنا ہے۔ بات کرنی ہے۔“

”ہوں.....“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”ایک ترکیب ہے۔“ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”وہ کیا.....؟“ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

”تم صبح سویرے میرے ساتھ چشمے پر چلو..... میری معلومات کے مطابق اس وقت وہاں لڑکیاں پانی بھرنے آتی ہیں..... مجھے امید ہے کہ شالا سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔“

☆.....☆.....☆

اور پھر اماں جی سے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے میں صبح سویرے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ سدو کو جگانے میں کافی وقت کا سامنا ہوا، لیکن بہر حال یہ معاملہ بھی طے ہوا..... وہ بے چارہ ناشتے کے بغیر ہی میری خاطر گھر سے باہر آ گیا تھا۔

”چلو..... تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے۔“ سدو بولا۔

”لیکن واپسی میں کالے بھائی کی حلوہ پوری سے

ناشتہ کریں گے۔“

”منرو..... میں مسکرایا۔

”ناشتہ میری طرف سے ہوگا۔“

”نہیں.....“ وہ جلدی سے بولا۔

”ناشتہ میں دوں گا کیونکہ کل ہی ٹیوشن کی فیس ملی ہے۔ اس کی تم قلمت کرو۔“

”میں بھی اب لین لارڈ ہوں.....“ میں نے مذاقا کہا۔

”اماں جی نے مکان کرائے پر سود دیا ہے۔“ میں جانتا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔

”جب کرنا یہ ملے تو اس دن میری دعوت کرو دیتا۔“

”ٹھیک ہے.....! میں نے حامی بھری۔

اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں جلدی چشمے کے قریب پہنچ گئے۔ جنگل کے اس حصے میں بھی جنگلی پرندوں کی آواز اور چھپا ہٹ سے فضا کونج رہی تھی۔

صبح کا حسین منظر آنکھوں کے سامنے تھا، اور میں نے دور سے ہی ہے تابی کے عالم میں ادھر ادھر نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔

”یہ آنکھیں..... بڑی بے چینی سے شالا کو ڈھونڈ رہی تھیں..... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس دن کی طرح آج بھی اچانک میرے سامنے آ جائے گی۔“

ابھی چشمہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، لیکن ہوا کے دوش پر نسوانی قہقہوں اور لڑکی کی آوازیں کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

سدو نے متنی خیر نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

”دیکھا بیٹا..... میری بات کتنی سچی پکی ہوتی ہے۔“

لڑکیاں وہاں پانی بھرنے آ چکی ہیں۔“

”مانتا ہوں استاد.....“ میں نے تسلیم کیا۔

”لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم ان کی ٹوہ میں کیوں رہے ہو.....؟ جبکہ تم پہلے ہی کسی سے محبت کا چکر چار رہے ہو۔“

”ارے یار..... یہ بات نہیں ہے۔“ سدو نے

”مجھے تو واقعی اپنی ستارہ کے علاوہ کوئی لڑکی اچھی لگتی۔ تم بانویانہ مانو..... لیکن میری ستارہ کی فکر نہیں ہے۔“

”اچھا.....؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں.....“ وہ مسکرایا۔

”لیکن میرے لئے ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں محبت دکھائی نہ دے، لیکن میں نے تو محبت کی ہے۔“

”سدو تو دراصل محبت میں ہوتی ہے۔ کسی انسان کو.....“

”قلبی ہو سکتے ہو۔“

”یہ بھی محبت کا کمال ہے.....“ ورنہ میں تو یہ کہتا ہوں..... محبت کسی کو بنا دیتی ہے اور کسی کو بڑھتی ہے۔“

”تم بات کو ل کر گئے۔“ میں نے یاد دلایا۔

”نہیں..... بات تو خود ہی گھوم گئی۔ بات یہ کہ ان ہی خانہ بدوشوں میں سے کچھ لڑکے اپنے

”میں آتے ہیں۔“

”کیوں.....؟“

”بھئی وہ بھی کھیلتے ہیں.....“ اس نے بتایا۔

”ان ہی میں سے دیان نامی ایک لڑکے سے اپنی اچھی باتیں پہلو ہو گئی ہے اس کے ذریعے مجھے معلومات حاصل ہوئی ہیں۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے.....!“

”ہاں.....“ سدو بولا۔

”وہ ذرا مختلف قسم کا ذہن رکھتا ہے۔ عام خانہ بدوشوں سے کافی مختلف ہے۔ وہ اپنی طرز زندگی کو بدلنے کا ہے..... وہ کچھ کرنا چاہتا ہے..... اس کا زیادہ

”اس نے علاقے میں ہی گزرتا ہے۔“

”اچھا..... اس سے مجھے ملوانا۔“

”منرو.....“ سدو بولا۔

”لو بھئی..... یہاں تو کافی لڑکیاں موجود

ہیں..... تم اپنی والی کو ڈھونڈو۔“

میں نے بھی وہیں رک کر ایک درخت کی آڑ سے جھانکا، ذرا سی فاصلے پر چشمہ موجود تھا، اور کئی لڑکیاں ہاتھوں میں گھڑے اور مٹکے لئے ہوئے دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ پانی بھرنے کے ساتھ ساتھ آپس میں خوش گپیوں میں بھی مصروف تھیں۔

مجھے ان میں شالا دکھائی نہیں دی، البتہ دوسری لڑکی چندا ضرور موجود تھی، میری بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔

میں نے خالی خالی آنکھوں سے سدو کی طرف دیکھا۔

”کیا ہوا.....؟“

”وہ..... ان میں نہیں ہے.....“ میرے منہ سے نکلا۔

”ہمت تیرے کی.....“ وہ جھلا کر بولا۔

”قسمت ہی خراب ہے.....“ بولو..... اب کیا کرنا ہے.....؟“

”میں کیا بتاؤں.....!“

”تو پھر کس سے پوچھوں.....؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ان لڑکیوں سے.....؟“

”تم تو بات پکڑ لیتے ہو.....“ میں جھلا گیا۔

”ارے میرا یہ مطلب ہے کہ اب میں کیا کروں.....؟ جب وہی نہیں ہے تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔“

”ویسے میرا آئیڈیا اچھا ہے.....“ سدو نے کچھ سوچ کر کہا۔

”نہیں سنا.....؟“ میں چونکا۔

”آؤ..... ان لڑکیوں سے پوچھتے ہیں۔“

یہ کہہ کر سدو نے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر جھٹ سے ان لڑکیوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

لڑکیوں نے حیرت سے ہمیں دیکھا..... پانی بھرنے والے ہاتھ رک گئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک

لڑکی نے لڑک دھڑاوا میں پوچھا۔

”کون ہو تم دونوں؟“

”انسان“..... سدو نے پرسکون انداز میں جواب

دیا۔

”جنگل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں انسانوں کا

داخلہ منع ہے۔“

”وہ تو ہم بھی ہیں.....“ لڑکی نے منہ بنایا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو.....؟“

میں نے غور کیا کہ چندا مجھے گھور رہی تھی، ادھر سدو

کی زبان کو لگا مہی نہیں لگ رہی تھی۔

”ہم کسی کو تلاش کر رہے ہیں.....؟“

”کسے؟“..... لڑکی نے اسے گھورا۔

”کیا نام ہے بھئی اس کا.....؟“ سدو نے میرے

کندھے پر ہاتھ مارا۔

”بتا دوں.....؟“ میں نے انسا سوال کیا۔

”ہاں بھئی.....“ اس نے سر ہلایا۔

”میں سوچ رہی ہوں.....“

”دیکھو.....؟“ اسی لڑکی نے سخت لہجے میں کہا۔

”اگر تم لوگ کسی غلط ارادے سے آئے ہو تو کسی

خام خیالی میں مبتلا رہنا..... ہم سب مل کر تم دونوں کی چٹنی

بنادیں گے۔“

”اور میں چٹنی ہرگز نہیں کھا سکتا.....“ سدو نے

سر ہلایا۔

”کیونکہ مجھے چٹنی سے نفرت ہے۔ گھر میں فنی

ہے تو میں گھر سے باہر ہوتا ہوں..... خیر بات یہ ہے کہ

ہمارا کوئی بھی غلط ارادہ ہرگز نہیں ہے..... میں تو بہت نیک

کام کے ارادے سے یہاں آیا ہوں.....“

”کون سا کام.....؟“ لڑکی پوچھ بیٹھی۔

”میرے اس دوست کا دل جنگل میں کہیں

گھوم گیا ہے.....“ سدو نے میری طرف اشارہ کیا۔

”میں وہ ڈھونڈنے آیا ہوں.....“

”کیا مطلب ہوا.....؟“ لڑکی نے اسے گھورا۔

”تم کیا میرا انتظار پوچھ کر مجھے لوگرنی دینے والی

ہو.....؟“ سدو جھلا گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، میں بول پڑا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ میں شالا سے دوستی کرنا

چاہتا ہوں.....“

”شالا.....؟“ لڑکی حیرت سے بولی۔

”کون شالا.....؟“

”وہ جانتی ہے.....“ میں نے چندا کی طرف

اشارہ کیا۔

”ایک دن میں یہاں آیا تھا، تو وہ اس کے ساتھ

تھی۔“

”میرے ساتھ کبھی تھی.....“ چندا خود ہی بول

اٹھی۔

”تم وہی ہونا جو اس دن.....“

”ہاں.....“ میں نے جلدی سے اس کی

بات کاٹی۔

”میں بالکل وہی ہوں..... اور تم چندا

ہونا.....؟“

”ہاں.....“ چندا نے مجھے غور سے دیکھا۔

”تمہیں میرا نام بھی یاد ہے.....؟“

”ہاں.....“ میں نے کہا۔

”کیونکہ شالا نے تمہیں اسی نام سے پکارا تھا۔“

”لیکن میں تو اس دن لڑکی کے ساتھ تھی۔“ چندا

نے جواب دیا۔

”اور نہ ہی میں کسی شالا سے واقف ہوں.....“

”اچھا..... لیکن کون ہے.....؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ رہی.....“ اس نے فوراً ایک لڑکی کی طرف

اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا، یہ ایک موٹی سی کالی رنگت والی

لڑکی تھی، جو کسی بھی صورت میں شالا نہیں ہو سکتی تھی۔

”تمہیں.....“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ کبھی نہیں بلکہ شالا تھی۔“

”لیکن اس نام کی کوئی لڑکی ہماری بستی میں نہیں

.....“ اس لڑکی نے دخل دیا، جو پہلے سدو سے مخاطب تھی۔

”تمہیں ضرور کوئی دھوکا ہوا ہے.....“

”یہ سن کر میں حیران رہ گیا۔“

ان دونوں کے لہجوں میں جو سچائی تھی اس نے مجھے

ابھمن میں ڈال دیا تھا..... ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ

صحت نہیں بول رہیں۔

تو پھر.....؟ کیا میں نے وہ خواب دیکھا تھا.....؟

لیکن جانتے میں خواب کون دیکھ سکتا ہے..... میں سوچ

میں ڈوب گیا۔

سدو نے مجھے ٹھوکا دے کر چو لگا دیا تھا۔

”اب کیا کریں.....؟“ وہ آہستہ سے بولا۔

”یہ تو معاملہ ہی الٹا دکھائی دے رہا ہے۔“

میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی اور چندا سے

مخاطب ہو گیا۔

”تمہیں یاد ہے نا کہ میری تم سے ملاقات ہو چکی

ہے.....؟“

”ہاں بابو.....“ وہ قدرے شرماتے ہوئے

مسکرائی۔

”تم طے ہی اس طرح تھے کہ بھلائے نہیں

.....؟“

یہ سن کر لڑکی نامی لڑکی نے اپنا دوپٹہ منہ پر ڈال لیا،

اپنا دیدہ اپنی نمی کو روکنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی تھی۔

میری ابھمن میں اضافہ ہو گیا..... چندا کے بیان

کے مطابق اس کے ساتھ اس دن یہ لڑکی تھی..... جبکہ

میں نے لڑکی کے بجائے شالا کو دیکھا تھا۔

چندا نے تو باقاعدہ شالا کو نام لے کر مخاطب کیا تھا،

مہمات یاد آتے ہی میں چونک اٹھا اور بولا۔

”لیکن چندا..... تم نے تو اسے شالا کہہ

کر پکارا تھا..... مجھے ابھی طرح یاد ہے۔“

چندا ہنسی اور بولی۔ ”میں نے کوئی نشہ کیا ہوگا، میں

بھری ہوئی سکرپٹ چٹتی ہوں.....“

ساری لڑکیاں ہنس پڑیں سدو سے رہنا نہ گیا۔

”میرے..... تم لوگ کیوں میرے دوست کا مذاق

الٹا رہی ہو..... یہ بے چارہ بہت پریشان ہے۔“

”تمہارا دوست بات ہی ایسی کر رہا ہے.....“

”چندابولی۔“

”ہم کیا کریں.....؟ ایسی کوئی لڑکی ہماری بستی

میں ہرگز نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنا منہکا بھرنے میں مصروف

ہو گئی، دوسری لڑکیوں نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔

سدو نے مجھے کندھے سے پکڑا اور دوسری طرف

گھوم گیا..... چندا دم چلنے کے بعد اس نے کہا۔

”کیوں مذاق کا نشانہ بن رہے ہو.....؟ اور وہ بھی

ان جہاں بھیت لڑکیوں سے.....؟“

”ارے یا رسدو..... سمجھنے کی کوشش کرو..... میں

شالا سے ملا ہوں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ حسین

ذخیر چہرہ اور اس کا سراپا دیکھا ہے۔“

”میں مانتا ہوں..... لیکن بستی کی یہ لڑکیاں

توصاف منع کر رہی ہیں.....“

”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”تھمرو.....“ سدو کچھ سوچ کر بولا۔

”ایک ترکیب میرے ذہن میں آ رہی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”ابھی تم یہاں سے چلو.....“ سدو نے مجھے

سمجھایا۔

”میں آج شام میں تمہیں دیان سے

ملوا دیتا ہوں..... ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری کوئی مدد کر سکے۔“

”اچھا.....“ میرے منہ سے نکلا۔

”ہاں.....!“ سدو نے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ اسے شالا نامی لڑکی کا علم ہو.....“

اور..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکیاں ہمیں بے وقوف

بننا رہی ہوں۔“

میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا، بولا کچھ نہیں۔

☆.....☆.....☆

دعائے کے مطابق سدو نے کالے لہجہ حلوہ

پوری سے میری ”توضیح“ کی تھی، لیکن میں زیادہ نہ

کھاسکا..... خانہ بدوش لڑکیوں نے مجھے شدید ابھمن میں

ڈال دیا تھا۔

سرد نے میری کیفیت بھانپ لی تھی، چنانچہ وہ بول اٹھا۔

”ارے میری جان..... کیوں فکر کرتے ہو.....؟ میں تمہیں تمہاری مثال سے ملوا کر ہی دم لوں گا..... تم پریشان نہ ہو.....“

”یار میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“
”تم حلوہ پوری کھاؤ..... ابھی سے اسنے پریشان ہو جاؤ گے تو آگے کیا کرو گے۔ عشق کی منزل تو بہت کھن ہوتی ہے..... یہ کاوشیں اور الجھنیں تو محبت کی معراج ہیں۔ اگر یہ آسانی سے حاصل ہو جائے تو کیا خاک مزہ.....؟“

”تم پھر فلسفہ بگھارنے لگے.....“ میں نے اسے گھورا۔
”یہ فلسفہ نہیں بلکہ حقیقت ہے.....“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”میں ایک آوارہ اور ادبаш انسان تھا، لیکن جب مجھے محبت ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو یکسر بدل ڈالا میں اب بھی اپنے دوستوں سے ملتا ہوں، لیکن کسی غلط افکاشی دلی میں ہرگز نہیں ہوں..... اب میں یہ برائی سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں..... تو کیا یہ سب اتنا آسان ہے..... ہرگز نہیں..... کیونکہ خود کو بدلنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔“

”ہاں..... یہ تو ہے۔“ میں نے شخص کی سانس بھری۔

”بس..... تو پھر خود کو مضبوط کرو..... اور اس مشکل راستے پر چلنے کے لئے کمر باندھ لو..... کیا تمہیں اس لڑکی سے واقعی محبت ہوئی ہے.....؟“

”ہاں..... کاش تم نے بھی مثالا کو دیکھا ہوتا.....“
”دیکھ لوں گا.....“ اس نے سر ہلایا۔

”مزدور دیکھوں گا..... ابھی تو تم پیٹ بھر کر ناشتہ کرو..... چلو.....“

☆.....☆.....☆

گھر میں داخل ہوا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی، اماں جی کافی پریشان دکھائی دیں۔

”کیا ہوا ماں جی.....؟“ مجھ سے رہانہ گیا۔
”کیا بات ہے.....؟“

”کرائے دار جا رہے ہیں.....؟“ انہوں نے بتایا۔

”جا رہے ہیں.....؟ کہاں.....؟“ میں نے پوچھا۔

”گھر خالی کر کے جا رہے ہیں.....“ اماں جی بولیں۔

”فرامت علی آئے تھے، اور مجھے پیغام سنائے ہیں کہ وہ اسی مہینے میں مکان خالی کر دیں گے کیونکہ یہاں رہنا ان کے بس کی بات نہیں ہے..... انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بیٹیوں والے ہیں..... خدا نہ کرے کوئی مسئلہ ہو گیا تو کون ذمہ دار ہوگا۔“

”آخر ہوا کیا ہے ماں جی.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ ایسا کیوں بول رہے ہیں.....؟“
کرائے دار کا نام فرامت علی تھا، اور میں سرسری طور پر ہی ان سے ملا تھا..... مجھے یہ تو بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کے ساتھ اور کتنے افراد ہیں۔
اماں جی نے ایک محلے کی عورت کے توسط سے خود ہی سارے معاملات نٹائے تھے۔

میں نے پوچھا تھا۔ ماں جی نے کہا۔ ”لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا..... بس یہ کہہ گئے کہ ان باتوں کو رہنے دیں..... ہمیں ہر صورت میں یہ مکان خالی کرنا ہے۔“

”کمال ہے.....“ میں بڑبڑایا۔
”اسی کون سی بات ہے جو وہ بتانا نہیں چاہتے کیا آپ ان کے گھر کی شخص.....؟“

”جہیں.....“
”آپ کو وہاں جانا چاہئے.....“ میں نے کہا۔

”گھر میں اور لوگ بھی ہوں گے..... آپ ان

سے معلوم کریں کہ وہ لوگ کیوں یہ گھر چھوڑنا چاہتے ہیں.....؟“

”بات یہ ہے کہ میں ابھی تک ان کے یہاں نہیں گئی ہوں.....“ اماں جی بولیں۔

”اور اب جاؤں گی تو وہ لوگ سوچیں گے کہ میں مطلب سے آئی ہوں۔“

”تو کیا ہوا..... بات تو واضح ہو جائے گی.....“ میں نے جواب دیا۔

”نہیں..... میں وہاں نہیں جاؤں گی، البتہ مجھے اس سلسلے میں روتی سے بات کرنی پڑے گی۔“

”یہ روتی کون ہے.....؟“
”جس نے انہیں ہمارا گھر دلوا دیا تھا.....“ وہ بولیں۔

”میں اس کے گھر جاؤں گی اور پھر وہی ان لوگوں سے اگھوئے گی۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے.....“ میں نے سر ہلایا۔
”آپ ان سے بھی مل لیں.....“

”ہاں..... ذرا کھانا بنالوں..... پھر جاتی ہوں.....“

یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئیں..... میرا ذہن ایک بار پھر مثالا کی طرف چلا گیا..... چند ہی لمحوں کی وہ ملاقات میرے لئے گویا سوہان روح بن گئی تھی..... کیونکہ اس کے ساتھ جولا کی دکھائی دی تھی..... وہ خود اس بات سے انکاری تھی کہ وہ مثالا نامی کسی لڑکی سے واقف نہیں ہے۔

حد تو یہ تھی کہ کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا..... مجھ کو خود چندا اس سے باتیں کر رہی تھی..... آخر یہ کیا تھا..... اگر چندا کی مثالا کو نہیں جانتی تھی تو پھر اس نے مثالا کا نام کیوں پکارا تھا.....؟

میں اس معاملے میں جتنا سوچ رہا تھا..... اتنا ہی اکتا جا رہا تھا..... آخر کار میں نے گھبرا کر اپنے سر کو جھٹک لیا..... فی الحال اس بارے میں سوچنا فضول تھا..... دیان

ہے ملنے کے بعد ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکلنے کی امید تھی..... اسی سلسلے میں مجھے اب سدا کا انتظار کرنا تھا۔

کیونکہ وہی میری ملاقات دیان سے کروانا۔
دوہرے کھانے کے بعد اماں جی روتی کے پاس چلی گئی تھیں..... میں اس وقت گھر میں اکیلا تھا۔
میں نے وقت گزاری کے لئے ایک موٹا سا ناول اپنی شیلیٹ سے نکال لیا کتابیں پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہی تھا، اور اس شوق کو اسکول والوں نے بیدار کیا تھا..... اسکول کی لائبریری سے ہمیں ہر طرح کی کتابیں پڑھنے اور گھر لے جانے کی اجازت تھی..... لیکن گھر لے جا کر پڑھنے کی صورت میں اس کتاب کی انٹری کروانی پڑتی تھی..... بہر حال میں اپنے ساتھ ہی کتابیں لے کر آ جایا کرتا تھا۔

یوں یہ شوق پروان چڑھتا گیا..... اب میں اکثر اچھے اور معیاری ناؤز خرید لیتا تھا..... میں نے کتاب کھولی اور کہانی میں گھو گیا۔
تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی، یوں لگا جیسے کوئی دروازے کے قریب آ کر کھڑا ہو۔

میں نے کتاب سے نظریں ہٹائیں اور دروازے کی طرف دیکھا، لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔
میں نے اسے اٹھا دیا، وہم خیال کیا اور دوبارہ کتاب پر میری توجہ مرکوز ہو گئی..... لیکن تھوڑی دیر بعد یہ تسلسل پھر ٹوٹ گیا۔
اس بار کسی نے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔

مجھے یاد تھا کہ اماں جی کے جانے کے فوراً بعد ہی میں نے بیرونی دروازہ اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا۔
پھر حوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اندر داخل ہو کر اس کمرے تک پہنچ سکے۔
لیکن اس دستک کی آواز نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کہیں صدر دروازہ کھلا نہ رہ گیا ہو..... ممکن تھا کہ میں بے ہوشی میں ایسا کر بیٹھا ہوں۔
ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ پھر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اس بار میں اٹھ کھڑا ہوا کتاب میں نے

بستر پر رکھ دی تھی۔

”کون ہے؟“ میں نے قریب جا کر پوچھا۔
کوئی جواب نہیں ملا، البتہ پھر سے دستک دی گئی تھی، اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا، میں نے بلند آواز میں کہا۔

”کون ہو؟ منہ سے تو بولو۔“
”تم دوڑو گے تو نہیں۔؟“ ایک انجانا بھرائی ہوئی سی آواز میرے کانوں سے لگرائی۔

نہ جانے کیوں میرے رونقٹے کھڑے ہو گئے۔ اس بھرائی سی آواز میں ایسا ہی کچھا اثر تھا۔
میں نے اپنی ہمت جمع کی اور کہا۔
”نہیں۔۔۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔“ آواز آئی۔
”مجھے یقین ہے کہ تم ڈر جاؤ گے۔“
”مجھے چھوڑو۔ تم اپنا نام بتاؤ۔“ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”میں وہی ہوں۔۔۔“ کہا گیا۔

”جو برس بائیس برس سے تمہارے باپ دادا سے جنگ لڑتا ہوا آ رہا ہے۔ میں وہی ہوں۔ جس نے تمہارے ان آباد اجداد کو شکست دی اور انہیں اپنے انجام سے دوچار کیا۔۔۔ میں۔۔۔ میں جان لیوا ہوں۔۔۔“

”جان۔۔۔ لیوا۔۔۔؟“ میرے منہ سے نکلا۔
پھر میں نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے وہی کالے لہاؤ والا بڑا موجود تھا، جو مجھے جنگل میں دکھائی دیتا تھا۔

اب بھی اس کے چہرے پر چادر پھیلی ہوئی تھی اور میں اس کی شکل دیکھنے سے غمزدگ تھا۔
اچانک ہی کالے لہاؤ سے دو ہاتھ برآمد ہوئے اور انہوں نے میری گردن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

خوف کے مارے میرے حلق سے ایک زوردار چیخ بلند ہو گئی۔
”کیا ہوا۔؟ کیا ہوا کھیل پینا۔؟“ اماں جی

کی آواز میرے کانوں سے لگرائی تھی۔ انہوں نے میرے جسم کو چھو کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نیند سے جاگا ہوں۔ اور اس نیند کے ٹوٹنے کی وجہ بھی اماں جی تھیں جو مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔

”کیا ہوا میرے بچے۔؟ تم میری بری طرح چلا رہے تھے۔ کیا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔؟“
کوئی ڈراؤنا خواب۔۔۔؟

”خواب۔۔۔؟“ میں بڑبڑایا۔
پھر میں نے ادھر ادھر دیکھا، میں اس وقت بستر پر تھا۔
”خواب ہی دیکھا ہوگا۔۔۔“ اماں جی میرے قریب بیٹھ گئیں۔

”اچھا ہوا کہ میں واپس آ گئی اور تمہیں نیند سے جگا دیا۔“
میں نے ایک طویل سانس لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔
”جی اماں۔۔۔ شاید میں خواب ہی دیکھ رہا تھا۔“
”تم دوپہر میں تو سوئے تھیں ہو، پھر آج کیسے بستر پر لیٹ گئے۔ اور آج تو دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔۔۔“

گھر میں کوئی چور چاکھس آتا تو کیا ہوتا۔۔۔؟“
”ہمارے گھر میں آنے کے بعد وہ بے چارہ بھی پریشان ہی ہو جاتا۔۔۔“ میں طنز پر انداز میں مسکرایا۔
”جیسے ہمارے کرائے دار مکان چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“

”تو کیا ہمارا گھر آسب زدہ ہے۔۔۔؟“ اماں جی نے مجھے گھورا۔
”ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔۔۔؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔۔۔ اماں جی۔۔۔“
”میں نے طویل سانس لی۔“
”خیر چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ کہ اس عورت نے کیا کہا۔۔۔؟“

”وہ آج ان لوگوں کے پاس جائے گی اور پھر کل مجھے بتا دے گی۔“ انہوں نے کہا۔
پھر انہوں نے غور سے مجھے دیکھا اور بولیں۔ ”تم

کے گھر کو برا کیوں کہہ رہے ہو۔۔۔؟“

”اماں جی۔۔۔ یہاں اس کا راج ہے۔۔۔“
”خود کو جوان لیوا کہتا ہے۔“ میرے منہ سے نکل گیا۔
”جان لیوا۔۔۔؟“ انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”یہ کون ہے بھلا۔۔۔؟“
”یہ وہی ہے جس کی کہانیاں آپ نے بھی مجھے سنائی تھیں۔۔۔ اس خاندان کے لوگوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے والا خود کو جان لیوا کہتا ہے۔ اور اب وہ میری کمک میں ہے۔“

یہ سن کر اماں جی خوف زدہ ہو گئیں۔ انہوں نے کہا۔
”یہ تو کیا کہہ رہا ہے میرے بچے۔۔۔ خدا کے لئے ایسی باتیں مت کر۔۔۔“

اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میری آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی۔ اب مجھے آنسوؤں کا پتہ تھا کہ میں نے اپنی زبان کیوں کھولی۔ بقول رحیم اس کے وہ ناپید ہستی بعض اوقات اماں جی پر مسلط رہا کرتی تھی۔ لیکن درحقیقت تو وہ میری ماں تھی۔ مجھ سے محبت کرنے والی۔ مجھ پر اپنی جان نچھاور کرنے والی مہربان ہستی۔ اسے ہرگز علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہیں اور کیا کہہ رہی ہیں۔

اس لئے بہتر تو یہ تھا کہ میں ان معاملات کو اماں جی سے چھپائے رکھنے کی کوشش کروں۔
بہر حال آج اس خواب نے مجھ پر ظاہر کر دیا تھا کہ میرے باپ دادا کا دشمن اب میری تاک میں ہے۔۔۔

وہ مجھ سے کھیل کیوں رہا ہے۔ اگر وہ اب مجھے کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے کیا مسئلہ ہے۔ وہ ان کی آن میں میرا مقابلہ کر سکتا ہے۔ پھر وہ اس کی کوکھوں کیوں دے رہا ہے۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور اماں جی کو اپنے سے لگا کر بولا۔

”اماں جی۔۔۔ آپ فکرنہ کریں۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔“

☆ ☆ ☆
شام کے وقت دیان سے ملاقات ہو گئی، قد کاٹھ میں لمبا چوڑا اور تھکے نقوش والا بے لڑکا شکل و صورت سے کافی بڑا اور بخیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے کافی لہک کر ملا تھا۔

تینوں جانے کے ہوٹل میں جا پہنچے، ایک میز کے گرد گھیراؤ لے کے بعد سدو نے فوراً ہی دودھ پتی چائے کا آرڈر دے ڈالا، پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔
”ہاں بھی ٹھیک صاب۔۔۔ اب تم دیان سے اپنا مدعا بیان کرو۔“

”کوئی خاص بات ہے۔؟“ دیان نے میری طرف دیکھا۔

اس کا انداز ان پائیت بھرا تھا۔
”میرے لئے تو بہت ہی خاص ہے۔۔۔“ میں نے ایک طویل سانس لی۔

”کیونکہ زندگی میں پہلی بار یہ موقع مجھے ملا ہے۔“
”دکھ کر بتاؤ دوست۔۔۔ دیان نے سر ہلایا۔“
”اگر میرے لائق کوئی کام ہوا تو میں ضرور کروں گا۔“

”میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کا تعلق تمہاری بستی سے ہے۔“
”اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ تو پھر بتاؤ۔۔۔“

اتنی دیر میں جانے آ گئی۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک بھر پور چٹکی لی اور بولا۔
”تمہاری بستی میں شالا نامی ایک لڑکی ہے۔۔۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔“

”شالا۔۔۔؟“ دیان نے آہستہ سے دہرایا۔
پھر یوں لگا جیسے وہ اپنے ذہن پر زور دے رہا ہو۔۔۔ تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”نہیں۔۔۔ میرے علم میں تو ہرگز اس نام کی کوئی

لڑکی نہیں ہے۔“

”اچھا۔۔۔ میرے منہ سے نکلا۔“

مجھے چندا کی بات یاد آگئی۔۔۔ اس نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔“

”اور اگر میرے علم میں نہیں ہے تو پھر یہ لڑکی وہاں ہو بھی نہیں سکتی۔۔۔ کیونکہ میں بہتی میں ہرول عزیز شخصیت رکھتا ہوں۔۔۔ خاص طور پر لڑکیاں تو مجھ پر جان بھڑکا کر رکتی ہیں۔۔۔ سب ہی مجھ سے واقف ہیں اور میں خود بھی سب کو جانتا ہوں۔۔۔ لیکن یہ نام میرے لئے اچھی ہے۔“

”مجھے حیرت ہے۔“ میں بڑبڑایا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ میں اس لڑکی سے مل چکا ہوں۔۔۔ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔“

”اور اسے اپنا دل دے بیٹھا ہوں۔“

”اوہ۔۔۔ تو یہ بات ہے۔“ دیان نے سر ہلایا۔

”ہاں بھائی۔۔۔“ سدو نے غل دیا۔

”یہ مسئلہ تو حاتم طائی کے سوال کی طرح ہے یعنی ایک بار دیکھا ہے۔۔۔ اور بار بار دیکھنے کی چاہت میں خون خشک ہوا جا رہا ہے۔“

میں نے سدو کو گھور کر دیکھا تو فوراً ہی اس نے اپنے دانتوں کی نمائش کر دی اور عاجز انداز میں بولا۔

”ارے میرے یار۔۔۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔۔۔ پہلی نظر کی ہونے والی محبت کے بارے میں مجھ سے زیادہ

اور کون جانے گا۔۔۔ میں تو خود ہی اس مرض میں مبتلا ہوں۔۔۔“

”خیر۔۔۔“ دیان بولا۔

”میں دیکھتا ہوں۔۔۔ ویسے میری معلومات کے مطابق اس نام کی کوئی لڑکی بہتی میں موجود نہیں ہے۔“

”لیکن میں اس سے مل چکا ہوں۔۔۔ اور اس وقت چندا اس کے ساتھ تھی۔“ میں نے بتایا۔

چندا کے نام پر وہ چونک اٹھا۔

”اوہ۔۔۔ وہ تو بہت ٹٹ کھٹ لڑکی ہے۔۔۔ اس نے ضرور کوئی شرارت کی ہوگی میرا خیال ہے کہ اس لڑکی کا کچھ اور نام ہوگا۔۔۔ اور اس وقت چندا نے تم سے غلط بیانی کی ہوگی۔“

”لیکن اس نے تو باقاعدہ نام سے پکارا تھا۔۔۔ میں نے اعتراض کیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ دیان نے سر ہلایا۔

”اگر یہ بات ہے تو اس کا بھی حل موجود ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے اسے امید بھری نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور اسے ہونٹوں سے لگا کر ایک چمکی بھرنے کے بعد بولا۔

”میں تمہیں بہتی میں لے چلوں گا۔۔۔ تم خود اسے ڈھونڈ لیتا۔۔۔ کیا خیال ہے؟“

اندھا کیا چاہے۔۔۔ دو آنکھیں۔۔۔ چنانچہ میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلادیا۔

اسی وقت سدو بول اٹھا۔

”کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھیک کو کوئی پریشانی ہو۔ وہاں نہ جانے کیا ہو۔۔۔ وہ بہتی تو اس کے لئے بالکل ہی جگہ ہوگی۔“

”کوئی بال بھی بیکان نہیں کر سکتا۔“ دیان نے کہا۔

”کیونکہ میں بہتی کے سردار کا بھانجا ہوں۔۔۔ وہ میرے ماموں ہیں۔“

”اوہ۔۔۔“

”ہاں۔۔۔“

”میں بھی ساتھ چل سکتا ہوں۔“ سدو نے پوچھا۔

”نی الحال میں ٹھیک کو ساتھ لے جاؤں گا۔“ دیان نے جواب دیا۔

”تمہارے ساتھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن اکیلے میں ٹھیک ذرا توجہ سے اپنا کام کر سکتا ہے۔۔۔ اگر تم چلنا چاہو تو بعد میں کسی وقت ساتھ چل سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے حامی بھری۔

”میں ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔“

☆ ☆ ☆

واپسی میں سدو کا منہ بھولا ہوا تھا۔۔۔ اس بات کو دیان نے بھی محسوس کر لیا تھا چنانچہ اس نے کہا۔

”کیا تم بھی ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہو۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“ سدو فوراً بولا۔

”لیکن تم دونوں نے ہی مجھے کاٹ دیا ہے۔“

”اب میں کیا کروں۔۔۔؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ دیان بولا۔

”دراصل وہاں غیر کرنا ممنوع ہے۔۔۔ بہتی کے لوگوں کے علاوہ کوئی اور وہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں بہتی والے فوراً ہی پوچھ گچھا اور پھر مار کٹائی

بھارت آتے ہیں۔“

”ہوں۔۔۔ تو پھر تم ٹھیک کو کیسے لے کر جاؤ گے۔“

سدو نے پوچھا۔

”میں ایک بندے کا معاملہ سنبھال سکتا ہوں۔۔۔“

”دیان بولا۔“

”ٹھیک کو وہاں لے جانا اور پھر خیریت کے ساتھ وہاں سے واپس لے کر تا میرا کام ہے۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ وہاں ٹھیک کو لے جانے سے پہلے میں ساری بات

سمجھا دوں گا۔۔۔ اور تم بالکل غرمت کرنا۔۔۔ جیسے یہ تمہارا گھر کی دوست ہے، بالکل اسی طرح یہ اب مجھے بھی اتنا ہی عزیز ہے۔ کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ یہ میرا

بھروسہ ہے۔“

یہ کن کر سدو نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔۔۔“

”روشنہ میں اس بات کے حق میں نہیں تھا کہ یہ اکیلا

ہل جائے۔“

”بے فکر ہو۔“ دیان نے اسے تسلی دی۔

پھر وہ میری طرف گھوما اور بولا۔

”تم مجھے اپنا گھر دکھا دو۔۔۔ کل صبح نوبے میں

میں اپنے آؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلنا۔ ویسے

میں تمہیں بھی وہاں جا کر شالا کا کھوج لگا تا ہوں۔۔۔“

میری محبت کا شاخسانہ ابھی اہل جی سے قطعی پوشیدہ تھا چنانچہ مجھے کالج کا کھانا نہ کر کے صبح سویرے نکلتا ہوں۔

دیان وقت اور صبر کے پابند ثابت ہوا، ٹھیک نوبے کے وہ گلی کے کونے پر میرا انتظار تھا۔

عادت کے مطابق وہ مجھ سے گلے ملا اور پھر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”تمہیں صاحب۔۔۔ شالا نامی کوئی لڑکی ہماری بہتی میں موجود نہیں ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”کمال ہے۔۔۔“

”میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔۔۔“ دیان نے سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے کہ چندا نے اس لڑکی کا غلط نام لیا ہوگا۔“

”لیکن اس نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟“ میں نے کہا۔

”وہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی کچھ ہی دیر کی تھی۔۔۔ چندا کو کیا پتا کہ شالا میرے دل میں بس جائے گی۔“

”کچھ مجھ میں نہیں آ رہا۔“ دیان نے ماتھے پر ہاتھ مارا پھر اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم ساتھ تو چلو۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو سامنے آ جائے گا۔۔۔ ویسے کیا تم بتا سکتے ہو کہ شالا کے نقش و نگار کیسے تھے۔؟“

”بہت حسین۔۔۔ بہت خوب صورت تھی وہ۔۔۔“

”میں نے جواب دیا۔“

”لہذا۔۔۔ چاند جیسی رنکھت۔۔۔ لمبے اور قدرے سنہرے بال۔۔۔ بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔ اس کے داہنے گال پر سرخ رنگ کا تل بھی تھا۔“

یہ حلیہ کن کر نہ جانے کیوں دیان بے ساختہ مسکرایا میں اس سکراہٹ کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔

”یہ تو تم۔“ دیان بولتے بولتے رک گیا۔

”ہاں کو۔“ میں نے ٹوکا۔

”کیا کہہ رہے تھے۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔۔۔“ دیان بولا۔

آکھوں دیکھی، ایسی مافوق الفطرت چچی کہانی سناؤں گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے اور آپ جب یہ کہانی اپنے بڑے والوں کے لئے لکھیں گے تو وہ اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔

میں نے اس سفیدی والے سے کہا تھا۔ ”تم کسی اتوار کے روز میرے گھر آ کر مجھے اپنی آپ بیتی سنانا۔“ اس نے حای بھر لی تھی اور پھر وہ ایک اتوار صبح کے وقت میرے گھر آیا تھا۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے اپنی کہانی یوں بیان کی تھی۔

میرا نام تمیز الدین ہے لیکن یہ بگڑ کر جھجا پڑ گیا ہے، ہم جلدی پستی سفیدی کرنے والے پیشے سے وابستہ ہیں۔ میرے مرحوم باپ کا نام شہرانی تھا وہ اپنے زمانے کا بڑا مشہور چونا مسٹرینی سفید کرنے والا تھا۔ وہ لوگوں کے گھروں میں جا کر سفیدی کیا کرتا تھا بعض دفعہ اس کے بہت سے گاہک اپنے گھروں، کوشیوں میں سفیدی، چونا کے ساتھ رنگ وغیرہ اکٹھا کروالیا کرتے تھے۔ اس لئے میرے باپ نے ایک ہندو رنگ ساز جس کا نام تلواری رام تھا، کو اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا یہ نو جوان اپنے کام میں بڑا یکساں اور تیز کام کرنے والا مشہور تھا۔ خاص طور پر اس کی یہ بات بڑی قابل تعریف تھی کہ اس کے ہاتھ کے کئے گئے رنگ میں صفائی کے علاوہ چمک بہت اچھی ہوتی تھی یہ مختلف رنگوں میں صفائی کے تال میل سے ایسے ایسے ڈیزائن بنایا کرتا تھا کہ دیکھنے والے بے اختیار اس کی تعریف ضرور کیا کرتے تھے۔

میرے باپ نے شاہ جہاں پور کی ایک مارکیٹ میں چھوٹی سی دکان کھولی ہوئی تھی جس کے بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ یہاں قلعی کرنے والے، رنگ ساز اور لپا پوتی کرنے والے کی سہولت موجود ہے۔ ماشاء اللہ دکان اچھی چلا کرتی تھی میرے باپ نے مجھے تلواری رام کے ساتھ رنگ وروغن کا کام سیکھے اور اس کی مدد کے لئے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا، میری عمر اسی وقت بہ مشکل سولہ سال ہوئی۔ اس زمانے میں سفیدی کرنے والے مزدور

کوڑھائی روپے روز ملا کرتے تھے۔

ایک دن ہماری دکان میں ایک لڑکا، ہانپتا بوڑھا شخص پرانی سی سائیکل پر آیا اور اس نے ابا کے بارے میں پوچھا، میں نے اسے بتایا کہ وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے ہیں آتے ہی ہوں گے..... اس نے کہا چلو میں تھوڑی دیر انتظار کر لیتا ہوں۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے کہا۔ ”بیٹا، میری مالکن نے اپنے گھر کی سفیدی اور گھر کے دروازوں اور کمر کیوں کو پینٹ کروانا ہے۔ تم ذرا ہمارے ساتھ چل کر کام دیکھ لو کہ چونا اور رنگ پر کتنا خرچہ آئے گا اور کام میں کتنے دن لگیں گے؟“

ابھی وہ مجھ سے باتیں کر رہی رہا تھا کہ اس دوران ابا نماز پڑھ کر آ گئے۔ اس بوڑھے کو وہ اتفاق سے جانتے بھی تھے علیک سلیک کے بعد انہوں نے اس بوڑھے سے کہا۔

”تمہاری مالکن بہت عرصہ بعد اپنے مکان میں سفیدی اور پینٹ کروا رہی ہیں، خیریت تو ہے؟“ اس پر اس بوڑھے نے بتایا کہ ”بیمنی سے مالکن کی بڑی بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آ رہی ہیں، گھر کی حالت بہت خراب ہے، اس کے دروازے بہت میلے اور پیاسے ہیں۔“

ابا نے مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے اس بوڑھے کو کہا۔ ”تم اپنی سائیکل پر گھر پہنچو ہم پیچھے آتے ہیں۔“ ہم جب تانکے پر بیٹھ کر اپنی منزل پر پہنچے تو لہائی میں تین منزلہ اونچا ایک حویلی نما مکان ہمارے سامنے تھا جبکہ دروازہ انتہائی بے رونق، بے رنگ تھے۔ جگہ جگہ سے پلستر جھڑا ہوا تھا۔ بہر حال جب ہم اس گھر میں داخل ہوئے تو وہاں عجیب سی نحوست، سلین اور براسراریت کا ماحول پایا۔ چچی منزل جہاں سے ڈیوڑھی شروع ہوتی تھی وہ بالکل ویران، آدم بینہ رخالی تھی۔ اسے پار کیا تو ہمارے سامنے اوپری منزل کی جانب جاتی میڑھیوں کا طویل سلسلہ تھا، ہم اس پر قدم بہ قدم چڑھتے ہوئے دوسری منزل کے پہلے کمرے تک پہنچے تو وہ خالی تھا۔

”لگتا ہے کہ یہاں لوگ نہیں رہتے؟“ ابا نے اس بوڑھے سے خود ہی سوال کیا۔

”ہاں اس اس گھر کی مکانیت صرف دو افراد مالکن اور مجھ پر مشتمل ہے۔“

”تو کوئی کرایہ دار کیوں نہیں رکھ لیتے؟“

”وہ جی کئی دفعہ اسے کرایہ پر چڑھانے کی کوشش کی لیکن پتا نہیں کوئی اس مکان میں کوئی کرایہ دار نہیں آنے کو تیار نہیں ہوتی، میرا خیال ہے کہ اس مکان کی ہوا نکل جاتی ہے۔“ اس بوڑھے نے بڑا چونکا دینے والا جواب دیا تھا۔

”یہ بری ہوا سے تمہارا کیا مراد ہے؟“ ابا نے اس سے حیرانگی سے پوچھا لیکن وہ چپ رہا تھا۔

پھر ایک کمرہ آیا تھا، وہ بھی خالی تھا۔

جب ہم تیسرے بڑے کمرے میں پہنچے تھے تو وہاں خاصا اندھیرا تھا اور کونے میں لگی چار پائی پر ایک اچھی خاصی عمر کی بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی ہم نے اسے غور دیکھا یقیناً اس کی عمر اس وقت 90 برس کے لپیٹ میں ہوگی۔ برف جیسے سفید بال اور اس پر بھریوں زدہ چہرے پر پلٹیں بھی اچلی روئی کی مانند تھیں۔

”مالکن، یہ سفیدی کرنے والے شہرانی ماسٹر آ گئے ہیں۔“ اس بوڑھے نے معمول کے لہجے سے ہٹ کر کہا۔

”اچھا منوں بابا، ذرا باورچی خانے سے موسم بتی لے آؤ، وہ لائن چلی گئی ہے پھر ان سے بات کرنی ہوں۔“ اس بوڑھی عورت نے آہستگی سے کہا۔ (لائن وہ حقیقت ہندوستان میں بجلی کو کہتے ہیں)

وہ بوڑھا موسم بتی لے آیا، اسے جلایا تو اس کی روشنی میں اور بھی پراسرار لگنے لگی تھی۔ جب میں دروازہ پر اس کا سایہ دیکھا تو چچی بات ہے، مجھے خوف آئے لگا تھا۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد بجلی آ گئی تھی۔ سب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔

میں اور ابا سارے گھر کے کام اخراجات اور کام کی مدت تکمیل کا حساب لگانا چاہتے تھے۔

”آپ نے گھر کی حالت تو دیکھ لی ہے۔ کتنی گندی ہے۔ برسوں ہو گئے ہیں اس کی چھت، دیواروں، کھڑکیوں، دروازوں کو چونا اور رنگ وروغن کو دیکھتے ہوئے۔“

”ہاں بیگم صاحبہ انظر آ رہا ہے۔ لیکن میں نے گھر کی حالت سرسری دیکھ لی ہے۔ یہ بابا جی مجھے اوپر نیچے سے صحیح معنوں میں آپ کو بتلا سکوں..... کہ اس کی سفیدی اور پینٹ میں کتنا عرصہ لگے گا اور یہ بات مزدوری کی تو وہ آپ جو چاہیں گی، لے لوں گا۔“

”نہیں بھائی! ہم کسی کا حق نہیں مارتے۔“ اس بڑھیا نے فوراً ہی ابا کی بات کا ٹیٹھی۔

”تم اس کی پرواہ نہ کرو ہم تمہیں تمہارا پورا حق دیں گے۔“

ابا نے مجھے کہا۔ ”بیٹا تم بیگم صاحبہ کے پاس ٹھہرو، میں ذرا کام دیکھتا ہوں۔“

حالانکہ میں ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا لیکن کیونکہ یہ ابا کا حکم تھا میں نے اس کی تعمیل کی تھی درحقیقت میرے ابا بہت سخت مزاج کے تھے وہ ہمیں جو حکم دیتے تھے اس کی تعمیل ہمارے لئے اولین فریضہ ہوتی تھی۔

میں اس بڑھیا کے پاس بیٹھا رہا تھا اور میں نے اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھنے سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ اخلاق کی بہت اچھی ہونے کے ساتھ اتنی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس کی قوت گوہائی اور سماعت اچھی حالت میں تھی اور پھر رفتہ رفتہ میرا خوف کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ابا اس بوڑھے کے ساتھ کام دیکھ کر آ گئے تو انہوں نے اس بوڑھی عورت کو کہا۔

”بیگم صاحبہ! گھر کے دروازے کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے اس کی سفیدی اور پینٹ کے کام میں کم از کم مہینہ بھر لگے گا لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ پہلے دیواروں وغیرہ پر جو جگہ جگہ سے پلستر اکڑا ہوا ہے، اسے ٹھیک کروائیں اس سے سفیدی اور پینٹ اچھا ہوگا۔ ویسے

آپ کی مرضی، جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی کروں گا۔۔۔۔۔ اور ہاں، یہ منوں بھائی کی ٹانگیں چلتے ہوئے لرزتی ہیں، کون پلستر وغیرہ کے لئے مستزی مزدور لائے گا کون ان سے کام لے گا۔۔۔؟ آپ ایسا کریں مجھے مستزی کی دیہاڑی علیحدہ دے دیں، میں اپنی نگرانی میں آپ کا یہ کام کروا دوں گا۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتبار ہو تو۔۔۔؟“ ابا نے انہیں اپنا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

”ارے بیٹا اعتبار کی بات نہ کرنا، تم میرے بیٹے کی طرح ہو، روپے پیسے کی کون سی بات ہے، ایسا کرو، منوں بھائی نے راج مزدوری کے لئے جتنے پیسے لینا چاہو، لے لو اور میرا یہ کام کروا دو۔ یہ مجھ بڑھیا پر تمہارا احسان ہوگا۔“

”کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ! آپ ہماری ماں کی جگہ ہیں، میں آپ کا یہ کام کروا دوں گا، ویسے میں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ پلستر صرف نیچے زیادہ اکھڑا ہوا ہے، ایک دودن کا کام ہے۔“

ابا جی نے پلستر والا کام بہت اچھا اور سستا کروایا تھا۔۔۔۔۔ اور پھر جو پیسے اس بڑیا اماں جی سے بوڑھے منوں بابا کے ذریعے گھر کی مرمت پلستر وغیرہ کے واسطے لئے تھے اس میں سے آدھے سے زیادہ بچا کر جب واپس گئے تھے تو اماں جی بہت خوش ہوئی تھیں۔

ابا نے تیسرے دن مجھے اور تلواری رام کو اپنے ساتھ کام میں لگا لیا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ ٹنگی منزل سے سفیدی اور پینٹ کا کام شروع کیا جائے، میں پہلے پوٹین بھرتا اور دیواروں کو صاف کرتا، پھر ابا دیواروں پر سفیدی کرتے اور سب سے آخر میں تلواری رام پینٹ کرتا۔

کام بڑی تیزی سے جاری تھا کہ۔۔۔۔۔ ایک روز اچانک کام کے دوران ابا میزمری پھسل جانے سے گر گئے تھے، ان کی کمر میں کچھ ایسی چوٹ آئی تھی کہ وہ کام کے قابل نہیں رہے تھے اور انہوں نے اپنی جگہ ایک ہندو کام کرنے کے لئے بلا لیا تھا جو چونے کی کوچی بھیرنے لگا تھا۔

ایک روز کام کے دوران مدھونکھ نے مجھ سے کہا تھا۔ ”یار مجھے کچھ نہیں آتی کہ۔۔۔۔۔ اتنے بڑے گھر میں صرف دو بوڑھے رہتے ہیں یہ گھر بڑا پر اسرار ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے اس مکان کی اوپر والی خالی منزل میں بھی کوئی رہتا ہے۔“

”تو یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہا ہے؟“ میں نے سوال کیا تھا۔

اس نے جواباً کہا تھا کہ ”میں نے خود اپنے کانوں سے آج صبح اوپر کسی کے چلنے کی آہٹ سنی ہے۔“

”اوہ یہ تیرا دم ہوگا، اچھا خیر اگر ایسا ہی ہے تو میں یہ راز منوں بابا سے جاننے کی کوشش کروں گا۔“ میں تلواری رام کے جواب میں یہ کہتا تھا۔

شام ہوئی یہ تو ہم نے دیہاڑی کا کام ختم کیا تھا اور اپنے گھر کے کپڑے پہننے کے علاوہ رنگ اور چونے سے سے برش اور کوچیوں کو صاف کیا اسی دوران میں جب منوں بابا میرے پاس آئے تو میں باتوں باتوں میں ان سے پوچھا۔

”آپ یہاں اتنے بڑے گھر میں دو ہی انسان رہتے ہیں یا کوئی تیسرا بھی ہے؟“ انہوں نے خف سا غصہ اپنے ماتھے کے ٹکٹوں میں نمایاں کیا۔۔۔۔۔ اور مجھے قدرے ڈانٹتے ہوئے بولے۔ ”بیٹا، اپنے کام سے کام رکھو تمہیں ہماری ذاتی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ میں اپنا سامنے لے کر رہ گیا پھر انہوں نے مجھے یہ تاکید بھی کی کہ تم نے بھی کسی قیمت پر اوپر کی منزل کی چھت پر نہیں جانا اور ہاں، جب پہلی دو منزلوں کا کام ختم ہو جائے تو تمہیں کم از کم دودن پہلے مجھے اس کے بارے میں بتلانا ہوگا۔

مجھے ان کی منطق بالکل بھی سمجھ میں نہ آئی تھی۔۔۔۔۔ اور میں جب کام سے فارغ ہو کر گھر گیا تو وہاں میں نے چار پانی پر لیٹے، چوٹوں سے کراہتے ابا کو کہا۔ ”مجھے اس گھر میں خوف آتا ہے لہذا میں آئندہ ادھر کام کرنے نہیں جاؤں گا۔“

ابا نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔ ”ارے کم

بھٹ، میں نے اس مکان کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے زبان دی ہوئی ہے، بے وقوف عقل کے کہے، میں نے یہ کام تلواری رام سے ٹھیکے پر کر دیا ہے اگرچہ کہ وہ دیہاڑی پر کام کر رہا ہے لیکن میں اس سے اپنا حساب مکا چکا ہوں اور نہیں کیا کہ وہاں کوئی اوپری سایہ ہے یا وہاں کوئی گھبراہٹ ہے بس تو اپنی بچکانہ فطرت اور ڈر کو پرے ڈال اور کل صبح اپنے دودن ساتھیوں کے ساتھ کام پر جاؤ اور ہاں یہ بات بھول کر آئندہ ان کے سامنے نہ کرنا ورنہ دودنوں بدک کے بھاگ جائیں گے۔“

دودن بعد میں نے منوں بابا سے کہا تھا کہ مجھے گھر نہ گھولنے کے لئے بڑا ڈرم چاہئے اسی دن اتفاق سے ابا جہاں پور کے بازاروں میں کسی وجہ سے تمام دکائیں بند تھیں۔

منوں بابا نے کہا۔۔۔۔۔ ”بڑا ڈرم ہمارے پاس موجود ہے لیکن وہ سب سے اوپر والی چھت کے اسٹور میں ہے اور وہ اتنا ڈرنی اور سامان میں پھنسا ہے کہ اسے نکالنے کے لئے کم از کم چار آدمی درکار ہوں گے کیونکہ گھر کے گودام سے دوسرا سامان نکالنا پڑے گا۔“

”تو پھر کیا پروگرام ہے؟“ میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیں خود ہی یہ کہا تھا کہ اوپری منزل میں کسی قیمت پر انہیں تھلائے بغیر نہیں جانا۔

منوں بابا نے ایک لمحے کچھ سوچا اور پھر گھبراہٹ سے اپنے اندر بچنے ہوئے بولے۔ ”تم تینوں میری مدد کے لئے اوپر آؤ۔“

وہ آگے آگے اور ہم ڈرتے ڈرتے ان کے گھر کے بیڑھیاں چڑھ رہے تھے جب ہم اوپری منزل کی درودی آخری میزمری پر پہنچے تو ہمیں انہوں نے ایک ٹکے سے روکتے ہوئے کہا۔ ”اوپر ڈر احتیاط سے آنا وہ اصل چھت پر چھوٹی بی بی رہتی ہیں۔“

”وہ چھت پر ہی رہتی ہیں؟“ تلواری رام کے سامنے بے ساختگی سے سوال نکلا تھا۔

”تم یہاں مزدوری کرنے نہیں، شاید ہمیں

کھوجنے آئے ہو؟“

”معافی چاہتا ہوں بزرگوار“ تلواری نے فوراً معافی مانگی تھی۔

جب ہم تینوں چھت پر پہنچے تھے تو وہاں یہ منظر دیکھا۔۔۔۔۔ کہ ایک دہلی پٹلی عورت جو کہ شکل و صورت سے حسین ناک نقشہ کی مالک تھی اس کا قد بھی بڑا اچھا تھا وہ بڑی خاموشی سے لیکن بے چینی کے عالم میں چھت پر ٹپکتے والے انداز میں مسلسل یوں چکر لگاتے جارہی تھی جیسے کوئی پھری والی موٹر اس کے پاؤں میں لگی ہوئی ہو اس کی آنکھیں مسلسل اس طرح گھوم رہی تھیں جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ ہم نے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی تھی اور منوں بابا کے ساتھ اسٹور کے اندر گھس گئے تھے اور وہاں سے پہلے وہ سامان نکالنا شروع کیا تھا جس میں ڈرم پھنسا ہوا تھا۔

منوں بابا، تلواری رام اور مدھونکھ اسٹور کے اندر تھے جبکہ میں باہر تھا اور پرہانے بھانے سے اس عورت کی جانب دیکھ رہا تھا وہ یقیناً بڑی پر اسرار لگ رہی تھی وہ ایسی کیوں تھی یہ سوال میرے لئے تجسس کا باعث بن رہا تھا۔ لیکن سچی بات ہے میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں منوں بابا سے اس پر اسرار عورت کے بارے میں پوچھوں۔۔۔۔۔ اور پھر مجھے بعد میں بھی ایسا موقع نہیں ملا تھا۔

مدھونکھ، ابا کی جگہ سارا کام اور حساب کتاب دیکھ رہا تھا، وہ کیونکہ ابا کا کم عمر اور پرانا دوست تھا اس لئے جیسا وہ کہتا ویسا ہی مجھے اور تلواری رام کو ماننا پڑتا تھا دوسری جانب منوں بابا بھی جو ہماری مزدوری بن رہی تھی وہ بغیر جھجکے ہمیں دے رہے تھے جب کے ابا کی کمر میں خلاف توقع زخم ہو گئے تھے اور پھر ایک دن بوڑھی مالکن اماں نے مجھے خصوصی طور پر دوسری منزل پر اپنے پاس بلا کر کہا تھا

”بیٹا تمیز الدین! مجھے تو آج ہی تلواری رام نے بتلایا ہے کہ تمہارے ابا جو میزمری پھسلنے کی وجہ سے گرے تھے اب ان کی حالت بہت بری ہو گئی ہے اس

سلسلہ کامیابیوں کا تیسواں سال

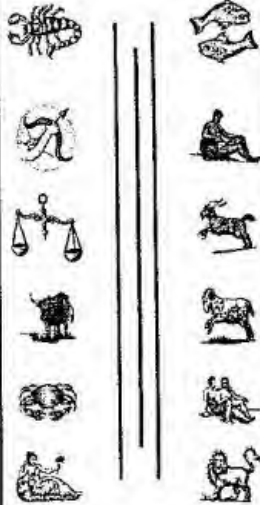
شمع جنتری روحانی

2018

مؤلف۔ اقبال احمدی

شمع جوگنی ہے
قریبی بک اشال سے طلب کریں

قیمت - 150/- روپے



پاکستان کی واحد منفرد اور مستند جنتری جس میں دیئے گئے مستقبل اور نئے عنوانات آپ کو ہر وقت چمکا دیے ہیں اور جسے پڑھ کر آپ پر حیرت طاری ہو جاتی ہے کہ پاکستان میں جیسے والی جنتریوں اور تقویم میں سارے مسلمان یکجا نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو بھی اس سے کارکن مکمل استفادہ حاصل نہیں کر سکتے ان کے علم کی پیاس نہیں بجھتی۔ اس سال کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔ جنتری اولیات، (بہری رئیس کا نقشہ) مذہبی تقریبات و تعلیمات، خواتین کے مزاج پر چاند کے اثرات، اثرات قمر، قوا رباع، آج کا دن کیسا گزرے گا، ہر کام میں کامیابی یا ناکامی کے لئے سعد اور خسر تاریخیں، قمر و عترت اوقات داخلہ کی جدول، 2018ء میں یہ کام کریں یا نہ کریں، نقشہ حروف و اعداد تاریخی سے دن معلوم کرنے کا طریقہ، تاریخ جہزی سے دن معلوم کرنے کا طریقہ، 176 سالہ شمسی جہزی کیلنڈر، ٹھہرت عرس ہائے بزرگان وین، تسویت الطوبت، تسویت الخیر، تسویت الطوبت پاکستان، تعارف رتار سیارگان، یونانی رتار سیارگان کو ہندی رتار سیارگان میں تبدیل کرنا، جدول نظرات سیارگان، انعامی یا طاری انعامی اسکیموں سے لگہ بھٹی یا کروڑ پتی بنے گا کون، 2018ء علم اعداد کی روشنی میں، نوروز عالم افروز (عالمی پیشگوئیاں) نوروز جہزی کا پھل، نوروز عددی کا پھل، نورانیہ کا پھل، نوروز کا پھل، نوروز جہزی کا پھل، جہزی سال کیسا رہے گا۔ آیات قرآنی سے مشکلات کا حل، خواب اور تعبیر خواب، دانش ایپ اپنے موبائل نمبر کے بغیر استعمال کریں، ٹرڈ کا لڑا پہلی کیشن کیسے کام کرتی ہے، اسات فون کے لئے کچھ جاننے کی چیزیں، کچھ مہوہ جات کے تین راز جو آپ نہیں جانتے ہیں۔ رجعت سیارگان کے اثرات، نقشہ یا تھویمات کو اکب، آپ کامیابی کیسے حاصل کریں، اپنے اسم اور اسات نبوی کے حروف باطن معلوم کیجئے، سات دن میں مہر و کوتا کو کرنے کا کل، شرف و مہر و سیارگان، شرف و مہر و قمر و رجعت و استقامت سیارگان، صحت مند بننے کے لئے کیجئے 13 مضمعی می تبدیلیاں، عالم اسباب، اسات فون اور ٹیبلٹ کے لئے 360 سیکورٹی ایپ، ہر شے میں ہے جلوہ گر ہے نام محمد، چاند کے طلوع و غروب کے اوقات 2018ء، بارہ برجوں کے حالات 2018، مجھے امید ہے کہ اتنے سارے عنوانات سے آپ کے علم کی پیاس یقیناً بجھ جائے اور آپ مزید منفی مشوروں سے مجھے نوازیں گے تاکہ جنتری کو بہتر سے بہتر خطوط پر استوار استوار کیا جائے اور آپ کے استفادوں کا کارواں یونانی رواں دواں رہے۔

دعا گو

اقبال احمدی

شمع بک ایجنسی
نوید اسکوانو گراپی
اردو بازار

021:32773302

نہیں صرف موت کا انتظار ہے لہذا میں صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کے لئے دردمش دو انہیں تجویز کروں۔“

ڈاکٹر کی اس بات سے مجھے بڑی ذہنی اذیت ہوئی تھی اور پھر اپنے گھر کا کام ختم ہونے، ہمارا تعلق ختم ہو جانے کے باوجود مالکن اماں نے صرف میرے دل کی تسلی کے لئے شہر در شہر اچھے ڈاکٹر و جیکسوں سے ابابا کا مہنگا ترین علاج کروایا لیکن ڈاکٹر و مفلزل کا کھانچ ثابت ہوا کہ..... ابابا کا علاج صرف موت ہی تھی۔

ابا مر گئے..... ان کے مرتے ہی ایسا لگا جیسے ہماری زندگی کے سمندر میں مدوجز آ گیا ہو، میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا، ساری ذمہ داری مجھ پر آ گئی تھی۔

زندگی میں آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ پریشانی وقتی ثابت ہوئی..... ہوا یوں کہ ابا کی فونگی کے چند روز بعد اماں مالکن صاحبہ! منوں بابا کے ساتھ موٹر گاڑی میں بیٹھ کر ہمارے گھر آئیں ہمیں اور ہماری بہت سی زیادہ والی مدد کی تھی وہ جانے سے پہلے میری ماں سے معافی مانگتے ہوئے بولی تھیں۔ ”ہم تمہارے خاندان کے قاتل ہیں۔ کاش ہم ماسٹر شربانی کو اپنے گھر چرنے اور پینٹ کے لئے نہ بلواتے۔“ انہوں نے بار بار روتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی تھی۔

”بیٹا مجھ دیکھی بڑھیا کو معاف کر دینا کہ ہمارے گھر میں تمہارے ٹیک باپ کی بلا وہ موت ہوئی۔“

”نہیں اماں! اس میں آپ کا کیا دوش ہے۔ ان کی موت آئی ہوئی تھی آگئی اور وہ بچے بھی ان کی موت تو حادثاتی طور پر میری سے بچنے کی وجہ سے ہوئی۔“

”نہیں بیٹا! بچ پوچھو تو تمہارے باپ کو ایک نادیہ خلوق نے ہم سے دشمنی میں دھکا دیا ہوگا۔“

”اماں جی! یہ جو آپ کافی دنوں سے عجیب سی باتیں کر رہی ہیں، میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی کیا

نگوڑے منوں بابا نے مجھے کچھ بتلایا تک نہیں۔ بیٹا ہمیں معاف کرنا ہم تو پہلے ہی اپنی زندگی کے ایک عذاب جیسے امتحان میں مبتلا ہیں۔ خدا ہمیں موت بھی آسانی سے نہیں دیتا۔“

”جی آپ تو بہت محبت کرنے والی بزرگ خاتون ہیں، اللہ آپ کو طویل زندگی دے۔“ میں نے کہا۔

”زندگی کی خوشیاں سمیٹنے کی عورت تمہاری ہے بیٹا، خدا تمہیں لمبی اور صحت والی زندگی دے، میرا کیا ہے بیٹا برسوں سے اس گھر کے اس کونے میں پڑی بیٹی کی صحت اور اپنی موت کی دعا مانگ رہی ہوں۔ خدا میری بیٹی پر رحم فرمائے دعا کرو اس بے قصور کی سزا کی طرح ختم ہو جائے۔“

انہوں نے جب اپنے منہ سے یہ الفاظ ادا کئے تھے کہ..... ”خدا میری بے قصور بیٹی کی سزا ختم کر دے۔“ تو میرے کان کھڑے ہو گئے تھے اور پھر میں نے ہمت کر کے پوچھا تھا۔ ”آپ کی بے قصور بیٹی کی سزا والی بات سے کیا مراد ہے؟“

میرے سوال پر اماں نے تو پہلے چپ لگالی تھی..... اور پھر انہوں نے بات ٹالتے ہوئے مجھے کہا تھا۔ ”تم ابابا کا علاج صحیح طریقے سے اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے کرواؤ اور تم اس کے لئے خرچے کی فکر نہ کرنا بلکہ تم ایسا کرو کہ مشہور گورے ڈاکٹر و مفلزل سے ابابا کا علاج کراؤ وہ بدر پور میں بیٹھتا ہے وہاں جانے کے لئے موٹر گاڑی کا بندوبست ہم کروا دیں گے۔“

اور پھر انہوں نے منوں بابا کو حکم دیا تھا کہ وہ میرے ابا کے اچھے علاج کے لئے فوری اقدامات کریں اور ان کے حکم کے مطابق منوں بابا نے ابابا کو خصوصی طور پر کرائے کی موٹر گاڑی میں بدر پور لے جا کر ڈاکٹر و مفلزل کو دیکھا تھا جو بڑا تجربہ کار اور وچ گوتھا، اس نے مجھے اور منوں بابا کو ایک طرف لے جا کر صاف صاف بتلادیا تھا کہ میری سب سے گرنے کی وجہ سے بابا کی کمر کے دوسرے مکمل طور پر ٹوٹ چکے ہیں اب ان کا علاج کوئی

آپ کے گھر میں کوئی اوپری مخلوق ہے؟ اور آپ یہ کیوں کہتی ہیں کہ خدا ہمیں موت دے دے اور میں نے آپ کے گھر کی تیسری منزل پر ایک پریشان حال، بے چین عورت دیکھی ہے آخر ماجرہ کیا ہے؟

مالکن اماں میرا سوال سن کر ایک ٹھنڈی سانس لینے کے بعد بولیں۔ ”بیٹا تمیز الدین دراصل ہمارے گھر کی خوشیوں کا قاتل کوئی ایک نہیں کئی کردار ہیں لیکن میں تمہیں اس گھر کی بربادی کی کہانی اپنی زبانی نہیں سناسکتی، اس کی کچھ وجوہات ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”ایسی کون سی وجوہات ہیں جو آپ اپنے گھر کی کہانی سنانے سے گریز کرتی ہیں؟“

”بس بیٹا کچھ عموں اور ناطوں کا فرق اور تقدس والی مجبوری ہے جو تمہیں تمہارے دل کے اندر اٹھنے والے سوالات کا جواب نہیں دے سکتی، تم ایسا کرو میرے گھر کی کہانی اور اپنے باپ کی موت کا کارن منوں بابا سے سن لیتا۔“

”منوں بابا نے مجھے ایک بار ایسا سوال کرنے پر ڈانٹ دیا تھا وہ تو مجھے کچھ نہیں بتلا سیں گے۔“ میں نے فوراً ہی کہا۔

”بیٹا میں منوں بابا سے کہوں گی کہ تمہارے تجسس کو ختم کر دے کیونکہ اب وقت کا تقاضہ کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ تمہیں اس گھر کی حقیقت بتادی جائے کیونکہ میرا تعمیر طوارا نہیں کرتا کہ تمہیں اس گھر کی بھانک کہانی نہ سنانی جائے جہاں تمہارے ابا کی موت ہوئی تم کل صبح آنا منوں بابا تمہارے دل میں اٹھنے والے سوالات کا جواب ایک کہانی کی صورت میں دیں گے۔“

دوسری دن صبح کے وقت میں مالکن اماں کے گھر پہنچ گیا تھا انہوں نے مجھے بیٹھا کر منوں بابا کو آواز دی تھی وہ آئے تو انہوں نے مجھے کہا۔

”تمیز الدین تم ایسا کرو میرے ساتھ چھت پر آؤ لیکن پہلے تم مالکن کے ساتھ چائے پانی کرلو۔“

چائے پینے کے بعد منوں بابا نے مجھے اوپر سیز جیوں کی جانب آ جانے کا اشارہ کیا تھا اور میں جب

ان کے ساتھ چھت پر پہنچا تو وہاں اس عورت کو اسی طرح بے چین، مسلسل ٹھٹھکے دیکھا تھا۔ اس کے چلنے قدموں میں ایک لمحے کے لئے بھی توقف نہ تھا۔ میری نگاہیں اس عورت کے خط الحواس سراپے کا طواف کر رہی تھیں کہ منوں بابا نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کروانے ہوئے کہا تھا۔

”پہلے تو میں تم سے اس گزشتہ رویے کی معافی مانگتا ہوں جب میں نے تمہیں ڈانٹا تھا..... کہ تم ہماری ذاتی زندگی میں دخل نہ دو۔“

میں نے کہا۔ ”منوں بابا آپ میرے لئے قابل احترام ہیں، آپ اس بات پر پشیمان نہ ہوں۔“

منوں بابا کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولے۔ ”میں کبھی، کسی قیمت پر اس گھر کے تاریک گوشوں سے پردہ نہ اٹھاتا لیکن مالکن کے حکم نے مجھے اپنی زبان کھولنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بیٹا! تم جو یہ سناتے سے بھرا پراسرار گھر اور اس ٹھٹھکی خاموش لڑکی کو دیکھ رہے ہو بخدا پہلے ایسی نہ تھی یہ تو بہت شوخ چٹپلا، ایم اے پاس پڑھی لکھی ہاشعور لڑکی تھی اور اس گھر میں تو خوشیاں رقص کرتی تھیں اس لڑکی کا نام رانی ہے یہ اپنی بڑی بہن پروین کے بعد دوسرے نمبر پر اس ان دونوں سے پہلے ان کے باپ سیٹھ اسماعیل اولاد میں پیدا ہو کر جوانی کی حدود کو چھونے سے پہلے ہی راہ عدم ہو گئی تھیں۔ بہر حال اس گھر میں تین بھائی رہا کرتے تھے ان تین بھائیوں میں اس کا باپ سیٹھ اسماعیل سب سے بڑا تھا دوسرا چھوٹا بھائی مختار کے بیٹے طفیل سے اور رانی کی لکھی حکیم الدین کے بیٹے رؤف سے ہوئی تھی تینوں بھائیوں اور بھادجوں میں اتفاق بہت تھا یہی وجہ تھی کہ تینوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کی شادیاں آپس میں کر لیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

پروین نے جب ایف اے کیا تو اس کی شادی طفیل سے ہو گئی جبکہ رانی کی شادی اس لئے رکی ہوئی تھی کہ اس کا منگیتر رؤف انگلینڈ میں پڑھ رہا تھا..... اسی دوران مختار یعنی پروین کے سرکوبہمی میں اچھا مکان مل

ایسا تھا لہذا پروین کو وہاں جانا پڑا تھا۔ ادھر رانی نے بھی تعلیم کو جاری رکھا تھا وہ ایم اے کرنے کے بعد کسی دن میں کچھ لکچرار بننا چاہتی تھی رؤف اس سے بہت محبت کرتا تھا وہ دیگر (انگلینڈ) سے اس کو نہ صرف محبت دے بلکہ تحائف بھی بھیجتا تھا۔ رانی اپنے چچاؤں سراپ کی چچی اور سرکرنگ تھی۔

اس گھر کے تمام باسی انتہائی سکمی اور خوشگوار گلیاں گزرا رہے تھے اور پھر اس خاندان کی بربادی کا لہجہ اس طرح ہوا تھا..... کہ ایک دن رانی کی بہن ان کا خط بہمنی سے آیا کہ وہ شاہ جہاں پور آنا چاہتی دراصل اس کے ہاں اولاد نہیں ہو رہی تھی اس نے تین سالوں میں بہت سے ٹوٹکے ڈاکٹری، جسمی کے کئے تھے لیکن سب سے بے فائدہ رہا تھا اولاد آنے کی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی دوسری جانب اس کی اور خاوند طعنے تشے دے رہے تھے پروین نے بطور پرکھے اس خط میں لکھا تھا کہ ”میرا خاوند میری اولاد کے باعث سون لانا چاہتا ہے مجھے کسی نے دیا ہے کہ شاہ جہاں پور میں ایک کرچن تصویر بنے کرنے والا ہے میں اس سے ملوں وہ اولاد کے لئے بارے میں بہت مشہور ہے، اس کے علاج رانی کو لوگوں کو فائدہ حاصل ہوا ہے میں اس غرض سے آنا چاہتی ہوں۔“

پروین جب شاہ جہاں پور اپنے گھر آئی تو اس کے والدین نے ابتدائی طور پر اس کرچن عامل کے لئے میں معلومات حاصل کیں تو انہیں پتہ چلا کہ اس کے عمل کے باعث بے اولاد جوڑوں کے ہاں

پروین نے اپنی بیٹی کو اجازت دی تھی کہ وہ مذکورہ کرچن عامل کے پاس چلی گئے یہ ہوا تھا کہ پروین کے ساتھ اماں جائیں گی اس روز اتفاق سے اماں بیمار ہو گئی تھیں سوان کی پروین نے رانی کو کہا تھا کہ تم میرے ساتھ چلو۔

پروین اور رانی جب اس کرچن عامل کے پاس پہنچی تھیں تو وہاں بتول پروین کے..... ان کی نگاہوں کے سامنے اللہ معاف کرے بد شکل چمک زدہ کالی سیاہ رنگت والا ادھیڑ عمر کا آدمی موجود تھا وہ شکل و صورت سے عورت پرست جسم کا لگ رہا تھا اس نے پروین کو کہا کہ..... وہ اسے ایسا موثر ٹوکتا ہے گا جس کی بدولت اس کے ہاں اولاد ضرور پیدا ہوگی اور وہ بھی جڑواں لیکن اس کی قیمت اسے پیسے میں نہیں کسی اور صورت میں دینی ہوگی۔

پروین نے پریشانی کے عالم میں پوچھا تھا کیا قیمت؟

اس بد شکل کرچن عامل نے رانی کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اولاد ہونے کی صورت میں اس لڑکی کی شادی مجھ سے کر دی جائے۔“

پروین اس وقت اپنی غرض میں اتنی توجہی کہ اس نے عامل کی اس بات کا دھیان نہ دیا تھا دوسری جانب رانی نے اس بات کو عامل کا مذاق سمجھتے ہوئے کہا تھا۔ ”ہاں میں تم سے شادی کر لوں گی تو بس میری بہن کی ماں بننے کی تمنا پوری کر دے۔“

عامل نے پروین کو ٹوکا بتاتے ہوئے کہا تھا۔ ”میری اس شرط کی کسی کوکالوں کا خبر نہ ہو، اس سال خداوند نے چاہا تو تیری کوکھ سے دو خوبصورت لڑکے پیدا ہوں گے یہ میری طرف سے گارنٹی ہے۔“

اس کی یہ بات سن کر پروین نے اپنے پرس سے اس زمانے کا لحاظ سے سو روپے جب کرچن عامل کو دیئے تو اس نے اسے واپس کر دیئے اور پھر رانی کی طرف عاشقانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھ سے شادی والے اپنے وعدے پر قائم رہنا۔“ پروین جو ٹوکا لینے کے بعد عامل کی جانب سے دو بیٹوں کی خوش خبری سن کر پاگل ہو رہی تھی اس نے عامل کے منہ سے نکلے ہوئے رانی کے بارے میں الفاظ پر ذرا برابر بھی غور نہ کیا۔

اور پھر ٹھیک دس ماہ بعد واقعی پروین کے ہاں دو خوبصورت جڑواں بیٹوں نے جنم لیا..... اور وہ

پاس پہنچی تھیں تو وہاں بتول پروین کے..... ان کی نگاہوں کے سامنے اللہ معاف کرے بد شکل چمک زدہ کالی سیاہ رنگت والا ادھیڑ عمر کا آدمی موجود تھا وہ شکل و صورت سے عورت پرست جسم کا لگ رہا تھا اس نے پروین کو کہا کہ..... وہ اسے ایسا موثر ٹوکتا ہے گا جس کی بدولت اس کے ہاں اولاد ضرور پیدا ہوگی اور وہ بھی جڑواں لیکن اس کی قیمت اسے پیسے میں نہیں کسی اور صورت میں دینی ہوگی۔

پروین نے پریشانی کے عالم میں پوچھا تھا کیا قیمت؟

اس بد شکل کرچن عامل نے رانی کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اولاد ہونے کی صورت میں اس لڑکی کی شادی مجھ سے کر دی جائے۔“

پروین اس وقت اپنی غرض میں اتنی توجہی کہ اس نے عامل کی اس بات کا دھیان نہ دیا تھا دوسری جانب رانی نے اس بات کو عامل کا مذاق سمجھتے ہوئے کہا تھا۔ ”ہاں میں تم سے شادی کر لوں گی تو بس میری بہن کی ماں بننے کی تمنا پوری کر دے۔“

عامل نے پروین کو ٹوکا بتاتے ہوئے کہا تھا۔ ”میری اس شرط کی کسی کوکالوں کا خبر نہ ہو، اس سال خداوند نے چاہا تو تیری کوکھ سے دو خوبصورت لڑکے پیدا ہوں گے یہ میری طرف سے گارنٹی ہے۔“

اس کی یہ بات سن کر پروین نے اپنے پرس سے اس زمانے کا لحاظ سے سو روپے جب کرچن عامل کو دیئے تو اس نے اسے واپس کر دیئے اور پھر رانی کی طرف عاشقانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھ سے شادی والے اپنے وعدے پر قائم رہنا۔“ پروین جو ٹوکا لینے کے بعد عامل کی جانب سے دو بیٹوں کی خوش خبری سن کر پاگل ہو رہی تھی اس نے عامل کے منہ سے نکلے ہوئے رانی کے بارے میں الفاظ پر ذرا برابر بھی غور نہ کیا۔

اور پھر ٹھیک دس ماہ بعد واقعی پروین کے ہاں دو خوبصورت جڑواں بیٹوں نے جنم لیا..... اور وہ

اپنے سسرال، خاوند اور خاندان میں سرخرو ہو گئی تھی۔ وہ جب اپنے دونوں نومولود لڑکوں کو لے کر شاہ جہاں پور آئی تھی تو سیٹھ اسماعیل اور پردین نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس کرچن عامل کو اس وقت کے لحاظ سے ہزار روپے اور کچھ تحائف دیں گے اس کام کے لئے وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے ہم جب اس کرچن عامل کے گھر پہنچے تھے تو وہاں اس نے بڑے دلیرانہ انداز میں کہا تھا۔

”مجھے یہ سب نہیں چاہئے مجھے تو رانی سے شادی کرنی ہے وہ تو مجھ سے وعدہ کر کے گئی تھی۔“

سیٹھ صاحب، پردین اور مجھے اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر شدید غصہ آیا تھا۔

”منہ سفیال کر بات کر بے غیرت۔“ سیٹھ صاحب نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اس نے بڑے آرام سے جواباً کہا۔ ”آپ مجھے یہ الفاظ نہ کہیں، میں نے تو اپنے کام کا معاوضہ مانگا ہے اور ویسے بھی تمہاری بیٹی نے تو مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا پوچھ لو یہ سانسے مڑی ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ پردین نے اسے لٹاؤتے ہوئے کہا۔ ”ذلیل انسان، میری بہن کی بچا کے بیٹے سے متعلق ہو گئی ہے۔“ اور پھر پردین نے اپنی برداشت کے دائرے سے ٹپکتے ہوئے اس کے منہ پر ایک زوردار چھڑر سید کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اور اسماعیل صاحب نے اس کو بہت مار لگائی۔

”تمہیں میری بے عزتی بہت مہنگی پڑے گی، دیکھنا میں تم لوگوں کا کیا حال کرتا ہوں۔“ کرچن عامل نے اپنا خون آلودہ چہرہ صاف کرتے ہوئے ہمیں یہ دھمکی دی تھی۔ ہم نے پولیس میں رپورٹ بھی کی تھی لیکن تھانے والوں نے اپنی مٹھی گرم کر کے اسے قارغ کر دیا تھا۔

وہ عامل بہت جونی انسان تھا۔ اس نے پھر یہ کیا کہ ایک روز بھرے بازار میں رانی کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔ ”تو مجھ سے وعدے کے مطابق شادی

کر لے تو میرے دل کو بھائی ہے اور اگر تو نے مجھ سے شادی نہ کی تو یاد رکھ میں تجھے کسی مرد کے قابل نہ چھوڑوں گا دنیا تجھ پر حقوے کی۔“ وہاں موج، دکا نداریوں نے اس کی خوب پٹائی کی تھی وہ چلا گیا تھا۔ ادھر رانی کی بہت بدنامی ہو گئی تھی۔ اس نے انگلیں ڈرؤف کو خط لکھا تھا کہ ”خدا کے لئے سب کچھ تھا: کے فوراً آؤ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آ گیا ہے۔“

رؤف فوراً ہی انگلیڈ سے آ گیا تھا۔ وہ بڑے دل والا، پڑھا لکھا اور شریف انسان تھا۔ اس نے تمام حالات جاننے کے باوجود رانی اور رؤف کے گھر والوں نے طے کیا تھا کہ شادی کے فوراً بعد رانی انگلیڈ چلی جائے گی ان کے اس اقدام سے رانی اس منحوس کرچن سے دور ہو جائے گی۔

رانی کی شادی بڑی صوم و دعام سے ہوئی تھی لیکن رؤف جب رات کو دلہن کے کمرے میں گیا تو اس نے کھوکھٹ اٹھاتے ہی اسے بوسہ محبت دینے لے بجائے اپنی ناک پر رومال رکھ لیا تھا۔

رانی نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“ کیا میں دلہن نہیں کوئی بیگن ہوں جو آپ نے اس طرح اہلی ناک پر رومال رکھ لیا ہے؟“

رؤف خاموشی سے اسے دیکھتا رہا لیکن زہاں سے کچھ نہ بولا۔

رانی نے تنگ آ کر اسے چھوڑتے ہوئے پوچھا تھا۔ ”کیا بات ہے تم یکدم جھگڑے میرے دل سے علیحدہ کیوں ہو گئے ہو؟“

اب رؤف نے آہستہ سے لب کھولتے ہوئے کہا تھا۔ ”مجھے تمہارے وجود سے عجیب سی بدبو آ رہی ہے۔“

”یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟“ رانی نے رد ہوئے سوال کیا تھا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں رانی تمہارے دل سے.....“ رانی تو جیسے جنوں میں آ گئی تھی اس نے رانا

کوڑا اور چلاتے ہوئے کہا تھا۔ ”دیکھو میں گلاب ان جیسی خوشبوؤں سے نہائی ہوں تم کیسی باگلوں جیسی کر رہے ہو؟“ وہ بری طرح چیختے چلاتے لگی تھی۔ رانی کیونکہ اسی کمر میں بیاہ کر اسی کمر کے کمرے پرورش میں آ گئی تھی اس لئے اس کی سچ و پکار رانی اور رؤف دونوں کے گھر والوں کو ہلا کر رکھ گیا تھا۔

سب لوگ جلد عروسی کے دروازے پر بہت شان کن انداز میں پہنچے تھے۔ جہاں عذاب پڑا تھا۔ بڑی نیگم اور سیٹھ اسماعیل نے گھبرا کر رؤف سے کہا تھا کہ ”آج تمہاری خوشیوں والی سہاگ رات گھر یہ کیا اجر ہے؟“

اس پر رؤف نے بہت مایوس کن انداز میں کہا ”رانی کے جسم سے بہت بری بدبو آ رہی ہے۔“ ”بیٹا تم کتنی بھونڈی اور عجیب بات کر رہے ہو؟“ انے ہوئے ہو گیا؟“ رؤف کی ماں نے اسے غصے سے ٹپکتے ہوئے کہا تھا۔

”میں کوئی دیوانہ نہیں ہوں، میں یہ بات بے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ رانی کے وجود سے آ رہی ہے۔“

رؤف کی یہ بات سن کر بڑی مالکن نے جنونی انداز میں سب کو دھکا دیا تھا اور آگے بڑھ کر پاگلوں طرح رانی کے جسم کو اپنی ناک لگا کر سونگھتے ہوئے کہیں۔

”ارے بے وقوف..... اس کے جسم سے تو حنا، گلاب اور دیگر چیزوں کی خوشبو آ رہی ہے رؤف.....! تم نے کیوں اپنی سہاگ رات کو تماشہ نہ کیا ہے؟“

”نہیں، نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ رؤف اپنی بات پر قائم تھا۔

”اچھا بیٹی تم ایسا کرو کہ میرے کمرے میں تیل جلاؤ اور رؤف مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم بیمار ہو تم بھی کات علیحدہ سو جاؤ صبح کچھ فیصلہ کریں گے۔“

صبح ہوئی تو ویسے والے دن گھر کے تمام افراد یعنی سسرال اور میکے والے افسردگی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

اس رات رؤف کو بزرگوں نے سمجھا بجا کر رانی کے کمرے میں بھیجا۔ رانی کے جسم پر کتنی قیمتی خوشبو اور عطریات کی بوتلیں انڈیا ٹی کیس پورا کر کر دیکش خوشبوؤں سے جھک گیا تھا سب کو امید تھی کہ بگڑی بات بن جائے گی لیکن اس بار بھی رؤف کو رانی بدبو سے بھرا کمر لگی تھی۔ اس نے بہت مجبوری والی کیفیت میں رانی سے رخ موڑ کر کہا تھا۔

”میں تمہیں دل سے اپنی بیوی مانتا ہوں، یہ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اس کے باوجود مجھے تم سے محبت ہے لیکن میں تمہیں زوجیت کا حق نہیں دے سکتا اور نہ تمہارے ماتھے پر طلاق کا ٹکٹ لگاؤں گا۔“ یہ کہہ کر رؤف کمرے سے یوں نکلا تھا جیسے رانی کے دل سے نکلا ہو۔

رانی تو یہاں ہی، ان بیانی سی ہو گئی تھی۔ ارد گرد کی غورتیں اور باتیں بناتے والے اسے آدمی دلہن کا طعنہ دیا کرتے تھے۔ ان حالات کے باعث سیٹھ اسماعیل اور عبدالحکیم کی لڑائی ہو گئی رؤف واپس انگلیڈ چلا گیا۔ خوشیوں بھرے گھر میں اداسی نے ڈیرے ڈال لئے۔

پردین اور اس کے شوہر نے رانی کو جگہ جگہ ڈاکٹروں، حکیموں اور مولویوں تعویذ گنڈے والوں کو دکھایا سب نے مشترکہ طور پر یہ ہی جواب دیا تھا کہ رؤف کے دماغ میں شاید کوئی جادو کر دیا ہے ورنہ تو رانی بظاہر میڈیکل طور پر ٹھیک ہے البتہ ایک کالے علم کرنے والے نے یہ بتایا تھا کہ رانی پر اس کرچن عامل نے کچھ ایسا عمل کر دیا ہے کہ جو بھی مرد اس کے قریب جائے گا وہ اس کے جسم سے ٹپکتے والی بو سے نفرت کرے گا اور یہ بدبو صرف اس کے قریب جانے والے مرد کو ہی محسوس ہوگی۔

رانی اب سارا وقت اس دن کو کوستی اور پردین سے لڑتی رہتی کہ ”کاش میں تمہارے ساتھ اس حرام



نیا گھر

نینا خان - کراچی

رات کے بارہ بجے جب خوب صورت لڑکی کی نظر سامنے اسٹور پر پڑی تو وہ انتہائی خوفزدہ انداز میں چیخنے لگی مگر اس وقت اس کی آواز دوسروں کو سنائی نہ دی اس کی سانسیں رک گئیں اور پھر.....

کیا تھلند لوگوں کا کہنا ٹھیک ہے کہ نیا گھر دیکھ بھال کر لیں، حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

ہو۔ آج کل کے ماحول سے مطابقت نہ رکھنا اب کافی مشکل ہے۔ بہر حال ماموں کی مرضی کے عین مطابق لڑکی پسند آئی گئی اور فوراً ہی رشتہ بھی طے ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ماموں کو گھر میں کونسا کمرہ دیا جائے۔ کیونکہ سب ہی ماموں کی شادی ہو چکی تھی اور گھر کے تمام کمرے پورشن سمیت ماموں ممانی کے پاس تھے جن میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ مقیم تھے۔

بات آج سے چھ سال پرانی ہے۔ جب سب سے چھوٹے ماموں واحد خان کی شادی لڑکیاں تلاش کی جانے لگیں اور کافی لڑکیوں کے بعد آخر کار ایک مناسب لڑکی پسند آئی سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے کچھ دیر مائٹز میں ماموں کی کہ لڑکی آج کے ماحول سے فائدہ رکھتی ہو۔ شریف خاندان کی پریمی لکھی لڑکی

اس کے ساتھ ہی میٹھ اسماعیل بیٹی کے صدمے میں مر گئے تھے رانی کو عدالت نے عامل کے چال چلن میں خراب سے واقف ہونے کے بعد اس کے گن کے جرم میں سزائے موت کے بجائے دس سال کی سزا سنائی تھی وہ جیل کی سزائیں ہی پاگل ہو گئی تھی چچا حکیم اور ان کا کنبہ اس محوں مکان سے چلے گئے تھے۔

اب اس گھر میں بڑی مالکن اور رانی بی بی ہیں اور بیٹا..... ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا ہم اگرچہ تمہارے باپا کی بے وقت موت کے ذمہ دار تو نہیں ہیں لیکن بد قسمتی سے یہ گھر اس کا باعث بنا۔ وہ غیبت عامل تو مر گیا لیکن اس کی روح اب بھی اس گھر کے درود پوار میں ہمارا سکون اور خوشیوں کو برباد کرنے کے لئے ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اس کی بھگتی روح جب بھی کسی نظر آتی ہے کہ اس گھر کو چھایا جا رہا ہے یا اس کی خوشیوں کا کوئی سامان ہو رہا ہے تو وہ کسی خیلے بہانے اسے پامال کر دیتی ہے اس روز جب تمہارے ابا تم اور نواری رام چلے اور پیٹ کا کام کر رہے تھے تو میں بڑی مالکن کے کمرے میں موجود ان کی معمول کی دوائی بنا رہا تھا تو اچانک میرے ہاتھ سے دوائی کی شیشی بے اختیار گر کر ٹوٹ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے درود پوار میں جو اسرار و اس ہوا تھا یہ سب کچھ بس میں محسوس کرتا ہوں اور کچھ جانتا ہوں کہ..... اس غیبت عامل کی روح کوئی شیطانی حرکت کرنا چاہ رہی ہے بس اسی لئے مجھے سے تمہارے ابا کی سیر می کرنے کی آواز آئی تھی۔ ظالم کرچن عامل کی روح اپنا کام کر چکی تھی۔

منوں بابا نے یہ کہانی مکمل کرنے کے بعد مجھ سے کہا تھا..... ”بیٹا..... میری تم سے اس دعا ہے کہ تم پہلے از کراب کہیں رکنا نہیں سیدھے اپنے گھر جانا..... اور کسی اس طرف لوٹ کر نہ آنا۔“ میں نے اس گھر سے لڑنے ہوئے جب آخری بار بے چین ٹھٹھتے رانی کو دیکھا تو وہ اپنے بازوؤں کو مسلسل سونگھے جا رہی تھی۔

زادے عورت پرست عامل کے پاس نہ جاتی اور اس سے مذاق میں یہ نہ کہتی کہ میں تجھ سے شادی کروں گی کاش، میں اس کے منہ پر اسی لئے پھیر سید کر دیتی۔“ رانی کے حالات دن بدن بدتر ہونے لگے تھے۔ روف اپنی تعلیم وغیرہ مکمل کر کے مکمل طور پر انگنڈ میں سیٹ ہو گیا تھا لیکن اس نے رانی کو نہ تو طلاق دی تھی نہ ہی اپنے پاس بلا یا تھا۔ اب رانی تقریباً روز انداز سے خط لکھتی تھی کہ ”روف مجھے تم سے شدید محبت ہے دیکھو میرے وجود سے اب بدبو نہیں آتی۔ خدا کے لئے لوٹ آؤ لیکن اسے دیاں سے کوئی جواب نہ آتا تھا۔ بلا آخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گئی تھی۔

اور پھر ایک روز رانی نے شدید مایوسی اور پریشانی کے عالم میں یہ شرمناک حرکت کی تھی کہ ”اس نے مجھے کے ایک بچے کو بلا کر اپنا جسم چپک کرنے کی خاطر اسے اپنا وجود دکھایا اور سنگھایا تھا..... لیکن اس بچے نے بھی شدید گھبراہٹ کے عالم میں یہ کیا تھا۔

”بابی..... مجھے تمہارے بدن سے مرے ہوئے چوہوں کی بو آ رہی ہے۔“

پھر ایک دن یہ ہوا کہ رانی گھر سے غائب ہو گئی، اسے بہت تلاش کیا اور پولیس میں رپورٹ درج کروائی تو پتا چلا کہ وہ اس کرچن عامل کے گھر چلی گئی تھی اور اس کو قتل کرنے کے لئے تیز چھری سے اس پر وار کئے تھے رانی کو پولیس نے عامل پر حملہ کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا جبکہ شدید زخمی عامل نے چوتھے روز یہ کہہ کر دم توڑ دیا تھا کہ ”رانی..... تو نے مجھ سے شادی نہیں کی تو وعدہ خلاف ہے دیکھ تو اب ساری زندگی کسی مرد کی قربت کو ترسے گی جو بھی مرد تیرے قریب آئے گا وہ تجھے دھکا دے گا تو اور تیرے گھر والے ساری زندگی مصائب کا شکار رہیں گے تم موت مانگو گے تو وہ بھی تمہارا مذاق اڑا کر چلی جائے گی اور میں مرنے کے بعد بھی تمہارے گھر کے درود پواروں میں بس کر بدروح کی شکل میں تمہیں بے سکون کرتا رہوں گا۔“

”بس بیٹا یہ سب کہہ کر وہ عیسائی عامل مر گیا

اور فیملی بھی دن بدن بڑھتی ہی جارہی تھی اس لئے چھوٹے ماموں کے لئے الگ سے پورشن بنانا مشکل ہو گیا تھا۔ گراؤنڈ فلور میں ڈرائنگ روم تھا اور ساتھ والا کمرہ نانی کا تھا۔ امی کیونکہ نانی کی اکلوتی بیٹی اور چھ بھائیوں کی اکلوتی بڑی بہن تھیں جس کی وجہ ہم سب بہن بھائی نانی ماموں سے بہت گور تھے اور دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ تمام ممانیوں کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات ہیں۔ اس لئے نانی کے گھر کے ہر پروگرام میں ہم پہلے سے ہی رکنے چلے جاتے اور خوب انجوائے کرتے ماموں ممانیوں اور کزن کے ساتھ۔

جب ماموں کی شادی کے دن نزدیک آئے تو بڑے ماموں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نا وہ ایک بڑا گھر خرید لیں جس میں تمام بھائی آرام سے مل کر رہیں۔ لیکن نانی پرانا گھر چھوڑ کر نئے گھر میں جانے کے لئے قطعی راضی نہیں تھیں۔ کیونکہ اس گھر سے نانا کی یادیں بڑی تھیں وہ شادی ہو کر اسی گھر میں آئی تھیں تمام ماموں نانی کو راضی کرنا چاہتے تھے مگر نانی کسی بھی قیمت پر راضی ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں دوسری طرف واحد ماموں کی شادی ایک مسئلہ بن کر رہ گئی تھی پہلے بڑی بڑی مشکل سے ملی اب گھر کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔

آخر کار امی کی مدد سے بڑے ماموں نے نانی کو راضی کر لی لیا۔ بات یوں طے ہوئی کہ تین ماموں نانی کے ساتھ پرانے گھر میں رہیں گے اور تین بھائی الگ گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔ ادراسی گھر میں واحد ماموں کی شادی بھی کریں گے بڑے ماموں ایک بزنس مین ہیں اپنے بزنس کے سلسلے میں کبھی ملک سے باہر تو کبھی شہر سے باہر جاتے آتے رہتے ہیں۔ کام کے سلسلے میں لاہور گئے ہوتے تھے وہاں اپنے دوستوں سے گھر خریدنے کی بات کی کہ اپنے ایریا کے قریب کے ایریا میں ہی کوئی گھر خریدنا چاہتے ہیں۔ تو ان کے ایک دوست نے جھٹ سے کہا۔

”یا ر میں بھی تو اپنا گھر فروخت کر رہا ہوں اور میرے گھر کا ایریا تمہارے گھر سے قریب ہے۔ یہ پیدل بھی آیا جاسکتا ہے پھر تو تم سب بھائیوں نے پاس بائیک ہے گاڑی ہے کیا پروہم ہے کراچی چل کر میرا گھر دیکھ لو اور اگر پسند آجائے تو لے ہو۔“

دوست کی بات سنتے ہی ماموں نے اس اسٹاپ نزدیک ہونے کی وجہ سے گھر کی لوکیشن کا پوچھ کر ٹوکن مٹی اسی وقت دوست کو دے دی اور گھر نے پیچھے اپنے نام کروانے کا بھی کہہ دیا ساتھ ہی چھوٹے ماموں کو کال کر کے دوست کے گھر سے چائی لے کر کہہ کا کھر کروانے کا کہہ دیا۔ بڑے ماموں کے آنے پہلے ہی چھوٹے ماموں اس نئے گھر میں کلر کر دیا تھا۔

بڑے ماموں کے آتے ہی بڑے ماموں کی فیملی کے ساتھ ہی دوسرے نمبر کے ماموں سعید خاں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ نئے گھر کے سیکنڈ فلور پر شفٹ ہو گئے تھے جبکہ فرسٹ فلور پر بڑے ماموں اور واحد ماموں کے کمرے تھے۔ گراؤنڈ فلور پر بھائی لاؤنچ ڈرائنگ روم اور ڈرائنگ روم کے ساتھ والا روم بڑے ماموں کے بڑے بچے حسن کا تھا۔ گھر والی طرز کا بنا ہوا تھا انٹرنس ایک پتلی سی کچی نمائی اسی ساتھ ہی فرنیچ رکھا ہوا تھا۔ لاؤنچ میں ہی بیشک بنارکھی تھی درمی چادر بچھا کر وہاں کھانا کھاتے تھے سامنے ہی پکین اور پکین کے ساتھ انچھڑا ہوا تھا۔ بیشک کے ساتھ دو کمرے ایک ڈرائنگ روم اور دوسرا حسن کا روم تھا روم کے ساتھ ہی بیڑہاں تھیں بیڑہیوں کے پہلے اسٹپس کے ساتھ ہی ساٹھ ایک اسٹور بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا اسٹپس تھے پھر دو کمرے جس میں ایک بڑے ماموں اور دوسرے میں واحد ماموں رہتے تھے اسٹور ساتھ ہی انچھڑا ہوا تھا بھی بنا ہوا تھا۔

اب اس نئے گھر میں شفٹ ہوتے ہی واحد ماموں کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور ساتھ ہی

ماموں نے سیٹ ہونے کے بعد ہماری اور نانی کی دعوت کی تاکہ ہم سب گھر بھی دیکھ لیں ماموں کی شادی کی تیاری بھی مل کر ممانیوں کے ساتھ کریں۔ دعوت کا سن کر کہہ گئے گھر میں دعوت دانی اور میں مارکیٹ سے نئے گھر میں جانے کے لالٹ کے طور پر وال کلاک لے کر آئے۔ امی بہن ہیں جس کی وجہ سے تمام بھائی بہت اہمیت ہیں اور ہر پروگرام میں پہلے سے انہیں بلایا جاتا ہے اور بہت سے کاموں کی ذمہ داریاں بھی اٹھانی ہیں۔

بہر حال جب ہم سب ماموں کے نئے گھر میں گراؤنڈ فلور کے ساتھ مل کر گھر دیکھنے لگے بڑے ماموں نے نمبر کے ماموں کے بچوں سے بہت دوستی ہے اب جب گراؤنڈ فلور دیکھنے کے بعد اوپر میں جانے کے لئے بیڑہیوں کے پہلے اسٹپس پر گئے ہی اوپر اسٹور جس کا لہجہ کا گیت تھا جب فلور پر میری نظر پڑی تو مجھے عجیب سا خوف محسوس ہوا میں نے اس خوف کو انور کر دیا اور ہم سب کسی مذاق سے ہوئے فرسٹ اور سیکنڈ فلور پر گئے۔ سیکنڈ فلور پر ایک کھانا کھانا تھا اور پکین ایک کمرے میں نمبر کے ماموں ان کی بیوی اور چھوٹا بیٹا قاسم کے ساتھ دوسرے کمرے میں بڑی بیٹی اقراء کا تھا ہم میں ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہمیں میں مصروف ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی نہانے کیوں اس اسٹور سے عجیب سے احساس کا خیال آ رہا تھا اسے بہت کمر میں جب اپنی چھوٹی بہن سے کہا۔

”عظمیٰ پتا نہیں کیوں مجھے اس اسٹور سے خوف ہوا بار بار اس کا خیال آ رہا ہے۔“

میری بات سن کر ہنستے ہوئے اس نے کہا۔

”آئی یہ سب تمہارا وہم ہے۔ تم خیالوں میں ہی چیزیں لاؤ۔ ایسی ہی چیزوں کے بارے میں اس۔“

بہن کی بات سن کر میں مسکرا کر چپ ہو گئی کیونکہ بار بار ہم سب بھی اوپر جاتے تو کبھی نیچے آتے اور پتا نہیں کیوں میری نظریں اس اسٹور کے گیٹ پر ٹھہر رہی تھیں اور اس کے سامنے سے گزرنے پر میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ میں گراؤنڈ فلور میں بیٹھی تھی کہ عظمیٰ میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

”آئی تم ٹھیک کہہ رہی تھیں بار بار اوپر پورشن میں آنا جانا کرنے پر جب میں نے بھی غور کیا تو اسٹور کا گیٹ دیکھ کر مجھے بھی خوف محسوس ہوا عجیب سی وحشت آ رہی ہے گیٹ دیکھ کر۔“

میں نے اسے فوراً کہا۔ ”عظمیٰ ہم تو یہاں سے چلے جائیں گے بس اس بات کا ذکر کسی کزن سے مت کرنا۔ ان لوگوں کو توڑ رہا ہے یہاں فضول میں ڈرنہ جائیں اور حسن تو خوب مذاق بنائے گا چپ رہنا۔“

میری بات سن کر عظمیٰ نے اشارت میں سر ہلا دیا۔ ہم سب بھی بہن بھائی اور ایوانی نماز پڑھنے کے پابند ہیں۔ اور گھر میں ذکر وغیرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے چھٹی حس تیز ہو گئی ہو۔ بہر حال رات میں دعوت کا کھانا کھا کر ہم اپنے گھر واپس آ گئے۔ لیکن اکثر ماموں کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں جانا آنا لگا ہی رہتا تھا۔ اب وہ دن آئی گیا جب ماموں کی شادی کے دن قریب آ گئے اور ہم سب وہاں رکنے کے لئے چلے گئے۔

جس دن ہم اس گھر میں پہنچے تو رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بڑی ممانی اپنے پورشن میں سب کو شادی کے سوٹ وغیرہ دکھانے لگیں۔

بڑے ماموں نے کہا۔ ”بھینا بیٹا آج جائے تم بناؤ۔“ وہاں سب چائے کے حد درجہ شوقین ہیں بیٹوں ٹائم کھانے کے بعد چائے لازمی پنی جاتی شام میں الگ اور اس کے علاوہ بھی آنے جانے والوں کے ساتھ چائے پینے کا سلسلہ چلتا رہتا۔

اب میں بڑے ماموں کی بات سن کر اوکے کر کے گراؤنڈ فلور پر آ گئی۔ گزرتا مجھے اسٹور کے

سامنے سے ہی قصاب تو اوپر پورشن میں تھے اور مجھے اکیلے نیچے چائے بنانے آتا تھا۔ میں چند اسٹپس اتر کر اسٹور کے سامنے کھڑی ہو گئی اسے دیکھنے لگی تو میرے روکنے کھڑے ہونے لگے، خوف محسوس ہوا، میں فوراً ہی دوسرے اسٹپس سے اتر کر نیچے کچن میں آ کر چائے بنانے لگی اور انتظار کرنے لگی کہ جلدی سے چائے بن جائے۔

اللہ اللہ کر کے چائے تیار ہوئی تو میں سب کے لئے چائے ٹرے میں سجا کر اوپر جانے لگی پہلے میری کے اسٹپ پر قدم رکھتے ہی میری نظر سامنے اسٹور پر گئی اور میں وہیں ساکت کھڑی اسے دیکھنے لگی پھر بہت ہمت کر کے چائے لے کر روم میں پہنچی تو کچھ جان میں جان آئی۔

اس وقت رات کے تقریباً 12 بجے ہوں گے اور ہم سب چائے پی رہے تھے کہ سب کو چینی کم لگی اور مجھے پھر سے سب کے ٹیپے پر چینی لینے بھیجا گیا۔ میں بھی اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں ہوں۔ ڈر محسوس ہوتا ایک فطری عمل ہے مگر ایک اشرف مخلوقات میں سے ہونے کی وجہ سے ڈر کا پورا پانا ہی غلبہ نہیں ہے۔ میں ڈر کو خود پر حاوی نہیں کرتی۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ میں خوف محسوس کر رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظر اس اسٹور کے بند گیٹ پر پڑ رہی تھی اور میرے روکنے کھڑے ہو رہے تھے۔

چینی لینے کی غرض سے میں کچن میں آ کر واپس اوپر جانے کے لئے پہلے اسٹپ پر قدم رکھا تو میری نظر پھر سے اسٹور کے بند گیٹ پر پڑ گئی میں اوپر جانے کے لئے قدم بڑھانا ہی چاہتی تھی کہ میرے قدم آگے نہ بڑھے میں پسینے سے شرابور ہو چکی تھی اور میری نظر اب بھی اسٹور کے گیٹ پر ساکت تھی۔ میری ہارٹ بیٹ تیز ہو چکی تھی میں پورے قہور پراکتی تھی۔

میرے پیٹ میں اچانک ایک عجیب سا درد اٹھا اس درد کی نوعیت کو سمجھ پانا بہت مشکل تھا۔ اچانک میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا اور میں چکرا

کر گئی۔ میں گری میز میوں پر تھی جب مجھے اذان آیا تو میں کمرے میں تھی اور میرے ارد گرد ای ماں ممانیاں کزنز وغیرہ موجود تھیں۔ جب سب نے مجھ کو پوچھا کہ کیا ہوا تھا مجھیں تم بے ہوش کیسے ہو گئیں۔ میں نے بس اتنا کہا۔ ”پیٹ میں درد اٹھا۔“ چکر آیا تو میں بے ہوش ہو کر گر گئی۔

امی نے کہا۔ ”اندرونی کمزوری سے کبھی بھلا ایسا ہو جاتا ہے۔“ اور اس طرح بات آتی گئی ہوئی۔ پھر تو مجھے بھی ایک خدس ہو گئی تھی کہ میں ضرورت سے زیادہ اب اس اسٹور کے سامنے گزروں گی اور اسے گھروں کی پھر شادی کی تیار ہوں تو چل ہی رہی تھیں مایوں مہندی بارات دیکھ کر انہیں ہم نے خوب انجوائے کی۔ نئی ممانی کے ساتھ بھی اگلے دوستی ہو گئی تھی تمام رسوں سے فارغ ہو کر ہم اچانک گھر آ گئے۔ مجھے بہت حیرانی تھی اس بات پر کہ کسی سے کزنز وغیرہ نے ایسی کوئی بات ڈسکس نہیں کی اس لئے میں نے بھی کبھی کسی سے کچھ ڈسکس نہیں کیا۔ وقت گزر رہا تھا ہم سب آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ حسن تو اس اسٹور سے سامان نکالنا اور رکھنا رہتا تھا ایک قرآن حافظ لڑکا ہے شاید جب ہی اسے نول محسوس نہ ہوتا ہو۔

دوسرے نمبر کے سعید ماموں نے اچانک چھوٹے بیٹے قاسم کا حقیقہ کیا تو ہم ایک دن پہلے ہی گئے کافی رات گئے گائے گائے اور انجوائے کیا۔ بھی وہیں تھیں میں اور عظمیٰ اقراء کے ساتھ اس کے میں سونا چاہتے تھے۔

نانی نے کہا۔ ”تم سب میرے ساتھ یہاں گراؤ ڈھکھڑو میں سو جاؤ۔“

اب مجبوراً نانی کی بات ماننی پڑی، امی تو ماموں کے روم میں چھوٹی بہنوں کے ساتھ سو گئیں اور عظمیٰ کچن کے ساتھ جہاں درزی چادر پھیکی تھی لیٹ گئی پھر نانی بھی وہیں لیٹ گئیں، پھر نانی ان کے برابر میں عظمیٰ لیٹ گئی لیٹ تاعث ہم سونے کے

قریباً تیسرا پھر تھا کہ ابھی آنکھیں بشکل بند تھیں کہ کچن کی چھت سے موٹے موٹے پتھر

میں چھت سے کھڑی ہوئی اور لائٹ آن کی اور نانی سے میں نے کہا۔ ”اتنے موٹے پتھر کون پھینک رہا ہے گرنے اور بھینکنے ہوتا ہے نانی۔“

نانی نے کہیں لگیں۔ ”اوپر ڈک بنا ہوا ہے کچن کی کچن کچن پتھر پھینکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”نانی کچن پتھر رات کو جگانے اتنے موٹے بڑے پتھر ان کے بچوں میں کیا

کھینکتے کہیں گے۔“ ”بھئی میں یہاں نہیں سوؤں گی مجھے پاس امی کے کمرے میں جا رہی ہوں۔“ ”رہ گئی میں بے چاری تو نانی نے ڈانٹ کر اپنے کمرے میں لایا اور میں اسی جگہ کچن کے ساتھ ہی لیٹی رہے پتھر گر رہے تھے۔ میں ساری رات نہ اب عقیقے کا پروگرام قصاب اگلے دن اسی کی میں مصروف تھے۔ میں شاور لینے کے لئے پورشن کے انچھڈ ہاتھ میں جانے کے لئے رہی تھی جیسے ہی نانی شاور لے کر نکلیں تو میں نے تو تیسرے نمبر کے ماموں کی بیٹی نے آ کر کہا۔

”آئی آپ فرسٹ فلور کے ہاتھ روم میں چلی مجھے یہاں نہانے دیں۔“

میں نے کہا۔ ”معتطفہ تم جاؤ وہاں میں کب سے

رہی تھی میں تو جا رہی ہوں شاور لینے۔“ ”معتطفہ نے مجھے بتایا کہ ”سب سے نیچے گراؤ ڈھکھڑو ہاتھ روم خالی ہوتا تو میں وہاں چلی جاتی

تھی فلور کے ہاتھ روم میں نہیں جاؤں گی مجھے

بات سننے کو نہیں ملی پہلی بار ایسی بات سن کر میں حیران رہ گئی معتطفہ چونکہ تیسرے نمبر کے ماموں کی بیٹی تھی وہ لوگ تو پرانے گھر میں ہی رہتے تھے۔ میں نے اس سے فوراً پوچھا۔

”معتطفہ تمہیں ڈر کیوں لگتا ہے فرسٹ فلور کے ہاتھ روم میں شاور لینے سے۔ کچھ بات ہے کیا؟“

میرے پوچھنے پر معتطفہ نے بتایا۔ ”آئی میں یہاں رکنے کے لئے آئی ہوئی تھی تو شاور لینے کے لئے فرسٹ فلور کے ہاتھ روم میں چلی گئی میں شاور لے رہی تھی کہ میں نے صابن یوز کر کے صابن دانی میں رکھا جب مجھے دوبارہ صابن کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے دیکھا صابن تو صابن دانی میں ہے ہی نہیں میں نے ہر طرف صابن دیکھا مگر صابن مل کر نہ دیا اور میں تو خوف زدہ ہی ہو گئی میں ابھی اسی سوچ میں تھی کہ ابھی تو میں نے صابن رکھا ہے اچانک سے صابن کہاں غائب ہو گیا۔

میں پریشان ہو رہی تھی کہ کسی نے میرا نام لیا۔ معتطفہ یہ رہا صابن اور زور سے کسی نے صابن میری طرف پھینکا۔ میں انجھائی ڈر گئی جلدی سے کپڑے پہن کر باہر آ گئی میں نے اقراء آئی کو بتایا یہاں تو کوئی یقین نہیں کر رہا اور سب مذاق اڑا رہے ہیں۔

”آئی پلیز! آپ وہاں چلی جائیں میں یہاں جا رہی ہوں نہانے۔“

معتطفہ تو چلی گئی نہانے کے لئے اور پھر مجھ پر ڈانٹ پڑی کہ باہر ٹینٹ بج گیا ہے اور کچھ مہمان بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ جلدی جاؤ نہانے اور تیار ہو جاؤ۔“ ”کیونکہ ایک دن ہی ہاتھ روم تھا اداراسی اسٹور کے برابر میں تھا معتطفہ مجھے پوری طرح سے ڈرا چکی تھی۔

مگر اپنی عادت سے مجبور میں بھی تھی اسی لئے اسی ہاتھ روم میں شاور لینے چلی گئی اور خوف کو خود پر حاوی ہونے نہیں دیا پھر بھی خوف تھا کہ آئی رہا تھا عقیقے کے پروگرام کے بعد ہم اپنے گھر آ گئے

دوسرے دن۔

وقت گزرتا رہا ہم سب اسٹڈی میں مصروف ہو گئے بس کبھی کبھی ملنے ملانے کا سلسلہ رہتا۔ اسٹڈی کی وجہ سے رکے بھی نہیں گئے تھے ہم لوگ۔ وہاں اس گھر میں تینوں ماموں کی فیملیز بخوشی رہ رہی تھیں میرے بی ایڈ کے امتحانات قریب تھے اور میرا بورڈ سرسید گریڈ کالج ناظم آباد میں تھا۔ جو کہ بڑے ماموں کے گھر سے بہت قریب تھا پیدل کا راستہ تھا تو بڑی ممانی نے کہا۔

”شاء فیصل سے آنے جانے میں بہت ناظم ضائع ہوگا امتحانات ہمارے گھر سے دے دو حسن چھین ناظم پر لانا لے جانا کر لے گا۔“

میں بھی وقت کی بچت کی وجہ سے وہاں چلی گئی اور امتحانات دینے لگی آخری پیر والے دن ہم سب نے پلان کیا کہ آج رات خوب بلا گا کریں گے کراؤنڈ فلور کے ڈرائنگ روم میں۔ سو میں گے اور بس رات بھر ہنسی مذاق کریں گے اور آنکھیں بھی می کھانے چلیں گے۔

جب میں آخری پیر دے کر آئی تو رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم سب آنکھیں می کھانے گئے رات سب اپنے اپنے پورٹن میں چلے گئے۔ بڑے ماموں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اس لئے حسن بھی اپنی ای کے ساتھ فرسٹ فلور پر روم میں سو گیا ہم سب کزنز ڈرائنگ روم میں ہنسی مذاق کر رہے تھے ڈرائنگ روم کے دروازے کے اوپر خوب صورت سی گرل لگی ہوئی تھی اس گرل سے اس اسٹور کا گیٹ نظر آتا تھا اور میری نظر اس گیٹ پر لازمی پڑھتی جاتی تھی۔

میں بار بار اسی گیٹ کو دیکھ رہی تھی ہنسی مذاق سے فارغ ہو کر ہم تینوں اب لیٹ چکے تھے اور لیٹ کر باتیں کر رہے تھے رات کے تقریباً ڈھائی بجے ہوں گے ڈرائنگ روم میں زبرد کا بلب آن تھا پھر بیڑیوں پر بھی بلب آن تھا کافی روشنی تھی میں ابھی ڈرائنگ روم کا گیٹ کھولا اور ٹوائلٹ گئی۔

جیسے ہی میں ٹوائلٹ سے نکلی تو وہ قدم سے ناسلے پر فریج رکھا ہوا تھا اس کے ساتھ کوئی چیز کھڑی تھی جو کہ سیاہ لباس میں بلبوس تھی اس کے جسم پر سر موجود نہیں تھا باقی پورا جسم سیاہ لباس میں موجود تھا اور سر کی جگہ سے خون ٹپک رہا تھا مسلسل۔

بیڑیوں پر لگے بلب سے ابھی خاصی روشنی آرہی تھی ساتھ ہی مین گیٹ انٹرنس پر بھی بلب آگیا ہوا تھا وہاں سے بھی روشنی آرہی تھی اور ڈرائنگ روم کی گرل سے بھی۔ اتنی روشنی تھی میں اسے بخور دیکھ رہی تھی اور وہ سرکٹ حقوق کا رخ بھی میری ہی جانب تھا میں ساکت واٹس روم کا گیٹ پکڑے کھڑی اسی حلقوں کو دیکھنے جا رہی تھی وہ حلقوں بس دو قدم کی دوری پر کھڑی تھی۔ میں انتہائی خوف زدہ تھی کہ یہ کیا چیز ہے اتنا کالا سیاہ لباس اور اس حلقوں کے وجود پر سر نہیں ہے اور سر کی جگہ سے خون ٹپک رہا ہے۔

میں انتہائی خوف زدہ اور ریٹان تھی سینے سے نہا تھی حلق سے آواز نہیں آرہی تھی سانسیں رک گئی تھیں میں نے اسی حلقوں کو دیکھتے ہوئے ہی گیٹ بند کیا واٹس مین سے ہاتھ دھوئے اور اسی کو دیکھتے ہوئے میں جلدی سے ڈرائنگ روم کا گیٹ کھول کر اندر گئی اور اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ سب کزنز نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ میں نے بات کو ٹال کر آنکھیں بند کر لیں سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

مگر ساری رات سونہ سکی۔ صبح ناشی آگئیں ملنے، میں نے سب سے چپ کرنا ہی کو بتایا رات کا واقعہ تو انہوں نے مجھے سب کو بتانے سے منع کیا کہ یہاں رہنے سے ڈرنہ جائیں۔

میں بری طرح خوف زدہ تھی بھائی کا دیٹ کر رہی تھی بھائی کے آتے ہی میں اپنے گھر آگئی۔ کافی دن تک اس حلقوں کے خیال سے اپنے وجود کو بھاری پایا۔ اور بار بار وہ شے میری آنکھوں کے سامنے آرہی تھی۔ بہر حال میں اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں

بھی لانا نمازیں میں نہیں چھوڑتی۔ بہت جلد خود لال کیا کہ اللہ نے ان تمام چیزوں سے طاقتور ہم کو بنایا ہے۔

لیکن جب بھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو وہ منظر ہوں میں آ جاتا ہے وہ شے آنکھوں کے منظر سے نکلتی۔

تین سال رہنے کے بعد مجبوراً ماموں کو وہ بچہ پڑا کیونکہ وہاں سب ہی کے ساتھ کچھ نہ کچھ بات ہوتے ہی رہتے تھے لڑکی نے ان واقعات کو بھیدہ نہیں لیا تھا۔

ایک حادثہ ایسا ہوا کہ اس نے سب کی زندگی بدل دی۔

اس گھر کی روشنی بڑی ممانی جو کہ ایک خوش بچہ ہنسنے ہنسانے والی خاتون تھیں بہت ہی دوستانہ تھیں تھا ان کا سب سے۔ وہ ایک ہر دل عزیز خاتون تھیں کوئی بھی پوچھیں ہوتا تھا۔ ان کی موجودگی 40 سالہ نوجوان خاتون جنہیں کوئی بیماری بھی نہ تھی بہت اکیلے تھیں بس یہ سوچا کہ اس سال اپنے بیٹے بڑا میلاد کروں گی اسی سلسلے میں بڑے ماموں کہنے لگیں۔

”آپ صدر جانے سے پہلے مجھے پرانے محلے میں وہاں میلاد پڑھنے والی ایک خاتون ہیں بہت میلاد پڑھتی ہیں میں واپسی پر رفیق کے ساتھ گئی۔“ (رفیق ماموں ان کے دیور ہیں) ممانی کو والی خاتون سے بات کرنے لگیں تو انہوں نے گرو دیا کہ ان کے پاس ٹائم نہیں لہذا وہ میلاد کے ٹائم دے سکیں۔

بڑی ممانی بو جھل قدموں سے ناشی کے گھر چلی جھوٹے ماموں نے کہا۔ ”بھابھی میں لچ کر کے آؤں گا آپ کچھ برک جائیں۔“

بڑی ممانی اداس سی ہوئی تھیں کہ وہ میلاد کا کام نہیں کروا سکیں گی بس کہنے لگیں کہ ”رفیق میں جاتی ہوں ماموں کا ایک کزن آ گیا تھا اس کے

ساتھ بائیک پر آرہی تھیں جیسے ہی گلی سے نکل کر روڈ پر آئے وہ روڈ کافی تنگ بنا ہوا تھا۔ ایک رکشہ والے نے ایک دم رکشہ چلا کر ان کی بائیک کو ٹکرایا جس کی وجہ سے وہ روڈ پر گر گئیں۔ اور سامنے سے اسپید میں بس آرہی تھی اور وہ بس بڑی ممانی کا سر پکائی ہوئی چلی گئی۔ ان کا سر ختم ہو چکا تھا یہ خبر ایسی تھی کہ ہم سب کے لئے قیامت سے کم نہ تھی اتنے خطرناک ایکسیڈنٹ سے ہم سب لرز کر رہ گئے ان کے انتقال نے سب کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

کافی وقت لگا سب کو سنہلنے میں بہر حال کافی روحانی عالموں نے اس گھر کی وجہ بتائی اس حادثے کے پیچھے وہ گھر بڑی ممانی نے بڑے پیار سے بچایا تھا اس گھر کے مالک بڑے ماموں اور بڑی ممانی ہی تھیں۔ اس طرح کا حادثہ کبھی نہیں آیا۔ کیونکہ مجھے اس گھر میں بناسر کے سیاہ لباس میں ایک حلقوں نظر آئی تھی۔ پھر بڑی ممانی کا ایکسیڈنٹ بھی ایسا ہوا کہ ان کا سر چل گیا چہرہ بری طرح ختم ہو چکا تھا۔

ان دونوں باتوں میں کوئی کنکشن ضرور ہے مگر کیا..... یہ میں نہیں جانتی۔

خیر ایک وقت آیا کہ ماموں نے وہ مکان فروخت کر دیا اور دوسرا مکان خرید کر اس میں شفٹ ہو گئے تھے۔

میری اپنے تمام قارئین سے گزارش ہے کہ جب بھی کوئی نیا گھر لیں تو استعارہ ضرور کر لیں اور کسی اچھے روحانی عالم سے چیک ضرور کروائیں اور شفٹ ہونے سے پہلے قرآن خوانی یا پھر میلاد کی محفل بھی لازمی کروائیں۔

آج بھی اس حلقوں کا ذکر مجھے خوف کی دنیا میں لے جاتا ہے آنکھوں کے پردے پر اس کا وجود سامنے آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تمام ایسی مخلوقات سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)



اندھیرے سے اجالا

ملک نسیم ارشاد۔ ڈی جی کوٹ فیصل آباد

چوتھی قسط

خوف کی وادی میں اٹکھیلیاں کرتی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی، جسم و جان کے رونگٹے کھڑے کرتی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش پل پل لمحہ لمحہ اچنبھے میں ذاتی خیر و شر کی کھانی

حقیقت سے دشمناس کرانی اپنی نوعیت کی عجیب و غریب دماغ سے محو نہ ہونے والی روداد

سر بلایا۔

”جب اللہ تعالیٰ نے دنیا بنائی انسان بنا۔ دھرم، مذہب ایک ہی تھا، صرف اللہ کو اپنا خالق و مالک ماننا لیکن پھر آبادی بڑھی کچھ جاہل انسانوں نے اللہ کے ساتھ شرک کرنا شروع کر دیا پھر کے بت بنا کر انہیں پوجنا شروع کر دیا اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے بتوں کی پوجا کرنا بھلا یہ کہاں کی عقلمندی ہے جانوروں، سور، چاند، ستاروں کو پوجنا شروع کر دیا پھر اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے اپنے نبی اور رسول بھیجے جنہوں نے لوگوں کو سمجھایا اور اصل حقیقت کی طرف بلایا جو رسولوں کے راستوں پر چلے وہ کامیاب و کامران ہو گئے آج بھی دنیا ان لوگوں کا احترام کرتی ہے لیکن جو اللہ نے بھیجے ہوئے پیغام پر نہ چلے وہ بھی ایک عذابوں کی نظر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ سب انسان اسی کی عبادت کریں اس کو ایک مائیں، ہر مشکل کو آسان کرنے والا بھی اللہ ہی ہے۔

کئی لوگ وہاں موجود تھے کہ اچانک ایک ڈاکٹر بولا۔ ”تمہارے ذریعے انسان کا چہرہ اور دماغ تر و تازہ رہتا ہے نماز کے ذریعے ہی خون انسان کے دماغ تک پہنچتا ہے۔“ کرکچن ڈاکٹر نے کہا۔

”وہ اب ٹھیک ہے ایک جبرائیل کی بات سنو کاویری اور ربیر کا بیاہ ہوگا۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ربیر بہت اچھا لڑکا ہے۔ دونوں خوب صورت بھی ہیں جوڑی خوب چنے گی۔“ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جیسا حادثہ کاویری کے ساتھ ہوا ہے ہمارے سماج میں کوئی اس کا ہاتھ نہ تھامتا، میں نے دیال انکل سے بات کی تو وہ مان گئے ربیر سے بات کی تو وہ چھپا رستم نکلا وہ امن ہی امن میں کاویری سے بے انتہا پریم کرتا تھا مگر کبھی کہہ نہیں پایا اس حادثے نے خودی اس کا کام آسان کر دیا۔ ویسے میں نے ربیر سے کہا کہ اچھا ہی ہوا تم نے جی کے جیون میں کاویری سے اظہار پریم نہیں کیا ورنہ بھی دیا کی طرح اس کی ہتھیار بھی کر دیتا۔“ سنتوش نے کہا تو عبداللہ بے اختیار ہنس پڑا۔

”ویسے بھی اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔“ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”عبداللہ تم نماز اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے پڑھتے ہو نا۔“ سنتوش نے بظاہر ہوجھا۔

”ہاں بالکل۔“ عبداللہ نے اثبات میں

”وہ کیسے.....“ ایک اور بولا۔

”مثال کے طور پر ایک تین منزل بلڈنگ ہے آپ کو شش کے ذریعے دوسری منزل تک تو پانی پہنچا سکتے ہیں لیکن تیسری منزل تک پانی بمشکل پہنچے گا اسی طرح انسانی جسم میں دل پمپ کی طرح کام کرتا ہے وہ جسم کے تمام حصوں تک تو خون پہنچا دیتا ہے لیکن دماغ تک چھوڑا بہت پہنچتا ہے لیکن جب انسان جدے میں جاتا ہے تو اس کے دماغ تک بھی خون پہنچ جاتا ہے اسی لئے نمازیوں کے چہرے تر و تازہ رہتے ہیں باقی صحیح معنوں میں تو چہرہ اس لئے خوب صورت ہوتا ہے کیونکہ انسان اللہ کا شکر جھکتے ہوئے کرتا ہے کیونکہ وہی ذات ہے جس کے آگے جھکا جاتا ہے۔“ عبداللہ نے وضاحت کے ساتھ سمجھایا۔

”یہ تو تم نے بڑی اچھی اور حیران کن باتیں بتائیں ہیں۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”صحیح معنوں میں سنتوش انسان اللہ کی پسندیدہ مخلوق ہے اللہ تعالیٰ اپنی بنائی ہر چیز سے محبت کرتا ہے مگر انسان سے اللہ تعالیٰ بہت محبت کرتا ہے انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اور صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے لیکن انسان بھٹکا ہوا ہے مختلف فرقوں میں اور مذاہب میں..... دنیا کا ہر انسان وہ کسی بھی و حرم سے تعلق رکھتا ہو وہ جانتا ہے کہ اصل حقیقت اللہ ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو مسلم ہو یا عیسائی سکھ ہو یا ہندو..... لیکن پھر بھی وہ اللہ کے ساتھ کسی نہ کسی کو شریک سمجھاتا ہے لیکن پھر بھی وہ اتنا غفور و رحیم ذات ہے کہ ہماری غلطیوں کو تا ہیوں کو معاف کرتا رہتا ہے قدم قدم پر ہماری اصلاح کرتا ہے آخری سانس تک ہمیں توبہ کا موقع دیتا ہے لیکن انسان پھر بھی..... سوائے افسوس کے کیا کہا جاسکتا ہے۔“ عبداللہ افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

”کیا اللہ واقعی ہمیں بہت پسند کرتا ہے۔“ سنتوش کے لہجے میں حیرانگی عیاں تھی۔

”ہاں..... بالکل..... دنیا میں جتنی بھی آسائشیں ہیں وہ اللہ نے صرف انسانوں کے لئے پیدا

کی ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔

”پر تو اگر اللہ تعالیٰ سب کے مالک ہیں تو پھر وہ سب کو سیدھی راہ پر لے آئیں۔“ سنتوش کی اس بات پر عبداللہ سکرا دیا۔

”تمہاری بات بالکل درست ہے سنتوش اگر اللہ تعالیٰ سب کے مالک ہیں تو پھر وہ سب انسانوں کو سیدھی راہ پر لے آئیں..... لیکن سنتوش اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے..... اب یہ بات بھی نہیں ہے کہ انسان ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکتا ہے اللہ کی عبادت کے لئے تو فرشتے ہی کافی ہیں وہ دن رات اللہ کا تحم بجالاتے ہیں وہ سوائے اللہ کی عبادت کے کوئی اور کام نہیں کرتے لیکن انسانوں پر اللہ کا یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے انسانوں کو کچھ چھوڑ دے رکھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو دودراہوں کا مسافر بنایا ہے ایک سفر نیکی کا ہے اور ایک سفر بدی کا، فیصلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو چھوڑ دے رکھی ہے۔ یعنی وہ اپنی مرضی سے خود دونوں راستوں سے کسی ایک پر چلے، اب جب انسان نیکی کی راہ پر چلتا ہے تو راستے میں ہر جگہ بدی یوژن چھوڑتی ہے تاکہ انسان نیکی کا راستہ چھوڑ کر بدی کا راستہ اختیار کرے لیکن اللہ تعالیٰ بھی نیکی پر چلنے والے کی ہل ہل رہنمائی کرتا رہتا ہے اور پھر نیکی پر چلنے والا انسان ہر بدی کو روک دیتا ہوا آخر کار اپنی اصل منزل کو پالیتا ہے پھر وہ فرشتوں سے بھی زیادہ مقام پالیتا ہے اور اگر بدی کے راستے پر چل پڑے اور گناہ کی حد کر دے تو وہ گناہوں اور بدی کا بادشاہ شیطان کے مقام سے بھی نیچے گر جاتا ہے باقی اگر انسان نیکیاں کرتا ہے تو اسے اپنی نیکیوں پر غر نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ بات انسان کو لے ڈونگی ہے۔

انسان اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ وہ ہر وقت اسی شش و پنج میں مبتلا رہے ہیں کہ وہ بہت گنہگار آدمی ہے اللہ کے سچے بندوں کی حالت ایسی ہی ہے وہ ہر وقت اسی شش و پنج میں رہتے ہیں کہ شاید اللہ کو ہماری یہ حرکت اچھی نہ لگی ہو، شاید مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی ہے

عبادت کا پلڑا دیکھا جائے تو سب سے بھاری مان کا ہے صرف اپنی ایک نادانی کی وجہ سے شیطان ہمیشہ اب دیکھو نہ اللہ کا غفور و رحیم شیطان کو بھی کھلا کر دیا یعنی اس کے برسوں کی عبادت کا دلہ دے دیا کی لگام کھلی چھوڑ دی اس نے اللہ سے کہا تھا کہ وہ بے عبادت گزار لوگوں کو بھٹکاؤں گا اللہ نے بھی یہی حکم عطا فرمایا تھا اب شیطان عبادت گزاروں کی طرف توجہ دانا ہی نہیں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اگر وہ حضرت محمد کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور اللہ کی عبادت کرتا ہے تو شیطان کے ہر بہترے کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے اور حضور نے اپنی امت کو شیطان کے بہتروں سے آگاہ کر دیا ہے اس لئے شیطان بھٹکے ہوئے لوگوں کو مزید بھٹکاتا ہے اور اللہ تعالیٰ قدم قدم کی اصلاح کرتا ہے یعنی ایسا کوئی واقعہ ہو جاتا ہے اشارہ ہوتا ہے لیکن انسان سمجھنے کے باوجود انجان رہتا ہے۔“ عبداللہ نے بتایا۔

”عبداللہ انسان کسی بھی عمر میں توبہ کر سکتا ہے جو اپنی باوجود حیا ہے۔“ سنتوش نے مزید پوچھا۔ بالکل اور یہ حقیقت ہے کہ انسان عمر کے ہر حصے میں توبہ کرے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے پیدا ہوا ہے یعنی کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔

”ویسے ایک بات کہو سنتوش۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”کیا۔“ سنتوش نے پوچھا۔

”میں نے دیکھا ہے تمہارے چہرے پر ایک سی چمک ہے۔ ایسی چمک کسی عام آدمی کے لئے نظر نہیں آتی۔“ عبداللہ نے سنتوش کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیسی بات میرے گاؤں کے عبداللہ انکل بھی کہتے ہیں۔“ سنتوش نے کہا تو عبداللہ چونکا۔

”عبداللہ.....“ ”ہاں..... تمہارے ہم نام وہ بھی مسلمان ہیں

وہ ہمارے گھر میں چوکیداری کی مزدوری کرتے تھے انہوں نے مجھے ایسا خوب صورت گفت دیا ہے جس نے ہر مشکل سے میری رکشہ اور دھوکے ہے۔“ سنتوش نے بتایا اس سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہوئی سنتوش کے موبائل کی رنگ ٹون جاگ اٹھی۔

☆.....☆.....☆

”سنتوش..... کالج میں ایک نئی لڑکی آئی ہے۔“ رنبیر نے کہا۔

”تو..... میں کیا کروں.....“ سنتوش نے لفظ ”تو“ کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

”تو کیا۔“ میں نے تو ویسے ہی کہہ رہا تھا..... ”رنبیر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں نئی لڑکیوں کی بڑی چٹنا ہے۔“ کاویری نے غصے سے رنبیر کو آنکھیں دیکھا کیں۔

”ارے دیوی جی آپ کو دھت تو کر دھت ہو گئیں ہیں اب تو تم جہنم جہنم کے پجاری ہیں۔“ رنبیر نے کاویری کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو سب ہنسنے لگے۔

”تو پھر تمہیں نئی لڑکی کی چٹنا کیوں کھائے جارہی ہے۔“ کاویری کا غصہ بدستور عروج پر تھا۔

”ارے دیوی جی ہم تو آپ کے پجاری بن گئے ہیں۔“

پرنتوں ہمارے گروپ کے باقی لڑکوں کے لئے تو دیوی کا پرہیز کرنا ہے کہ نہیں۔“ رنبیر نے وضاحتی لہجے میں کہا۔ ”تو اس کی چٹنا مت کر..... اپنا حال دیکھ کر ابھی سے اپنی ہونے والی جتنی سے ڈر رہا ہے۔“ سنتوش نے کہا تو پھر سب ہنس پڑے اور کاویری بھی جو غصے کی حالت میں تھی بے اختیار ہنس پڑی۔

”بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ چلو جیسے تمہاری اچھا۔“ رنبیر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”ویسے کاویری جی نے تو سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہ زیادہ سے ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا پرنتو اس نے کبھی شک نہیں ہونے دیا ایک ہتھیارا لٹکا۔“

سریش نے کہا۔

”ہاں..... حیرانی تو مجھے بھی ہوئی تھی پرنتو۔“ کا دیری نے انتہائی کہا تھا کہ ایک سریلی آواز ان سب کے کانوں میں پڑی۔
”ایک سیڈی۔“

سب نے آواز کی سمت دیکھا تو سنٹوش، سریش اور رنبیر کے دلوں نے دھڑکن شروع کر دیا سانسے ایک بے انتہا خوب صورت حسین و جمیل لڑکی کھڑی تھی اس کے ساتھ ساکشی بھی کھڑی تھی۔

”فریڈ ز یہ ہے انجلی..... اور انجلی میٹ مائی فریڈ سنٹوش، کا دیری، رنبیر اور سہ ماہی برادر سریش ہے اور سنٹوش بھی میرا کزن ہے۔“ ساکشی نے ان سب کا تعارف کر دیا۔

”اور میرا نام ہے عبداللہ..... السلام و علیکم۔“ عبداللہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب آ کر بولا۔

”نوسلم.....“ انجلی نے عبداللہ سے پوچھا۔
”الحمد للہ.....“ عبداللہ خیر لہجے میں بولا۔

”عبداللہ یہ ہے انجلی.....“ ساکشی نے گہری نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کالج میں نئی آئی ہیں۔“ عبداللہ نے پوچھا۔

”ہاں.....“ انجلی نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ساکشی بدستور عبداللہ کی طرف دیکھے جاری تھی۔

”انجلی ویکم مائی فریڈ ز گروپ.....“ ساکشی نے کہا تو انجلی مسکرا دی سنٹوش کو انجلی کے چہرے پر مسکراہٹ بہت بھلی لگی۔ ”اسی شہر کی ہوتم انجلی۔“

سنٹوش نے پوچھا۔
”نہیں..... میرے چاچا کا اس شہر میں ٹرانسفر ہوا ہے۔“ انجلی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”فریڈ ز..... Listen to me“ رنبیر نے تالی بجاتے ہوئے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آج رات کو میری برتھ ڈے ہے اسی کارن

میں سب دوستوں کو انوائٹ کرتا ہوں اسوشلی کا دیری کو۔“ رنبیر نے کہا تو سب ہنس پڑے۔

”تم بھی آنا انجلی..... OK“ انجلی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”آج نیوز پیپر کس کس نے پڑھا۔“ سریش نے ان سب سے پوچھا۔

”ایسی کیا خبر انجلی نیوز پیپر میں۔“ سنٹوش نے حیرانگی سے پوچھا۔

”رات پولیس کو پھر 6 لاشیں ملی ہیں، لاشوں کی حالت کافی خراب تھی، پولیس کا کہنا ہے کہ یہ کسی خون خوار جانور کا کام لگتا ہے۔“ سریش نے بتایا۔

”ویسے اب تو اخبارات میں آئے دن ایسی خبریں آتی ہی رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے شہر میں کوئی درندہ آن گسا ہے۔“ سنٹوش نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

”ویسے..... اس شہر میں جو درندہ تھا وہ تو قہم نہیں ہو گیا.....“ کا دیری دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب؟“ سب نے حیرانگی سے سوال کیا۔

”نشان چھوڑا۔“

”جی درندہ.....“ کا دیری نے کہا تو سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

”ویسے میرے خیال میں یہ ایسا بیٹھڑیے کا کام ہے جس نے اس رات بھی اور اس کے ساتھیوں کی انتہا کی تھی۔“

دیال اکل بتا رہے تھے کہ ہمیں بھی اس بیٹھڑیے کا ہی کام لگتا ہے مگر ابھی تک وہ بیٹھڑیاں ان کے ہاتھ میں نہیں آیا۔“ سنٹوش نے کہا۔

”ہاں..... چاچا کا کہنا تو یہی ہے آئے دن انہیں لاشیں ملتی ہی رہتی ہیں جس دن سے اس بیٹھڑیہ نے جی کی جھٹھکی کی تھی۔“ رنبیر نے بھی سنٹوش کی ہاں میں ہاں ملائی۔

چھوڑوان باتوں کو مجھے تو خوف آئے

لگا ہے..... کوئی اور بات کرو.....“ ساکشی نے منہ ہمارے ہوئے کہا۔

”آئی ہوئی بیگنی ملی۔“ رنبیر نے کہا تو سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

”عبداللہ تم بتاؤ رہائی کے بعد کیا محسوس کر رہے ہو۔“ ساکشی نے رنبیر کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”خود کو فریش محسوس کر رہا ہوں۔“ عبداللہ کے اس جواب پر سب مسکرا دیے۔

”فریڈ ز آپ کا گروپ تو بہت دلچسپ ہے۔“ انجلی نے کہا۔

”میں تو کچھ زیادہ ہی دلچسپ ہوں۔“ رنبیر نے انجلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا کہا تم نے۔“ کا دیری نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔

”وہ..... وہ.....“ کھلاہٹ کے باعث رنبیر کے منہ سے انتہائی نکلا اور رنبیر کو ایک مرتبہ پھر قہقہوں کی بارش نشان پڑی۔

”ویکھو بھی اس گیزڈ کا حال۔ ابھی شادی ہوئی نہیں اور ابھی سے یہ حال ہے شادی کے بعد تو یہ بالکل بیگنی ملی بن جائے گا۔“ سنٹوش نے رنبیر کا مذاق اڑایا جو اب پھر قہقہے کو بجھانے لگے۔

☆ ☆ ☆
برتھ ڈے پارٹی میں اس چٹھری کو بجھانے کے لیے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا ارد گرد پھیلے لوگ اس طرف دیکھنے لگے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے رنبیر اور کا دیری نے ایک کانٹا تھا اور سب علیحدہ علیحدہ گروپس بنا کر اپنی اپنی باتوں میں لگ گئے تھے۔

”پارٹی تو کافی شاندار دی ہے رنبیر نے۔“ انجلی نے ایک کانٹا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں بالکل۔“ دراصل ہونے والی چٹنی پر رعب ہمارا ہے۔“ سنٹوش نے کہا تو انجلی ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”عبداللہ نہیں آیا.....“ ساکشی نے پوچھا۔
”نہیں..... ویسے رنبیر نے اسے انوائٹ تو کیا تھا۔“ سنٹوش نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... تم کیوں پوچھ رہی ہو۔“
”نہیں بس ویسے ہی۔“ ساکشی نے تیز لہجے میں کہا۔

”ویسے آج دونوں کی جوڑی بہت سندرگ رہی ہے۔“ سریش نے ان سب کی توجہ کا دیری اور رنبیر کی طرف کرائی جو مہمانوں میں گھرے ہوئے تھے۔

”ہاں واقعی جوڑی تو لا جواب ہے۔“ ساکشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ویکھو سنٹوش رنبیر سن ی من میں کا دیری سے پریم کرتا تھا پرنتو کہنے کی ہمت نہ کر سکا جی والا حادثہ پیش آیا تم نے دیال اکل سے بات کی اور بات بن گئی۔“ سریش نے کہا۔

”رنبیر ایک اچھا انسان ہے اور اچھے انسانوں کی اوپر والا بغیر کبھی غمی مدد کرتا ہے۔“ جو اب سنٹوش مسکرایا۔

”سنٹوش ہمارا یہ آخری سال ہے اس کے بعد تم کیا کرو گے۔“ ساکشی نے پوچھا۔

”اس کے بعد میں گاؤں میں چلا جاؤں گا ہاتھی کا ہاتھ بناؤں گا۔“ سنٹوش نے کہا۔

”تو بھیا تم شہر میں ہی جاب کرلو۔“ ساکشی نے کہا۔

”نہیں ساکشی اوپر والے کا دیا سب کچھ تو ہے میرے پاس ویسے بھی مجھے شہر کی زندگی سے زیادہ گاؤں کی زندگی پسند ہے۔“ سنٹوش نے اپنے من کی بات کہی۔

”وہ کیوں.....؟ شہر کی زندگی تو زیادہ اچھی ہے۔ یہاں ہر چیز موجود ہے۔“ اس دھوا بجلی نے کہا۔

”یہاں کے لوگوں میں کوئی پریم نہیں ہے کسی کو کسی کی خبر نہیں ہے گاؤں میں جب کسی کا دیہات ہوتا ہے تو پورا گاؤں اس گھر میں جمع ہو جاتا ہے پرنتو شہر

”اب کہاں کی تیاریاں ہیں۔“ سنٹوش نے پوچھا۔

”ہم ذرا باہر گھومنے کے لئے جا رہے ہیں۔“
کاویری رنیر کے بولنے سے پہلے تیزی سے بولی۔

”کیا میں بھی ساتھ جا سکتا ہوں۔“ سنوٹش نے مذاقاً پوچھا۔

”جی نہیں۔“ کاویری نے مصنوعی غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا تو انسپکٹر دیال، رہنبر اور

”ٹھیک ہے بیٹا تم دونوں جاؤ۔“ انسپکٹر نے کہا

”دیکھا تم نے یکدم کیسے ٹھیک ہو گیا رنیر اور
تو وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

اسے کچھ یاد نہیں ہے کہ کیا ہوا ہے۔ "اسپیکٹر دیال نے سنٹوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل.....“ سنتوش نے اثبات میں سر ہلایا۔
رنیر اور کاویری گاڑی میں آ کر بیٹھے رنیر نے

”مجھے حیرانگی اس بات کی ہے کہ رات کو میں

ہے ہوش کیسے ہو گیا.....“ رنجیر پریشان کن لہجہ میں بولا۔

”بھی بھار ایسا ہو جاتا ہے رنیر۔ حیرتم
چھوڑیہ بتاؤ کہ اگر تم مجھ سے پریم کرتے تھے

تو پھر کہا کیوں نہیں۔“ کاویری نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”تم ہر سہی کے ساتھ رہتی تھی اس لئے
میں نے سوچا تم جی سے پریم کرتی ہو اس لئے

”جی مجھے پسند کرتا ہے یہ تو مجھے بھی پسند تھا پرنتو

پھر جب اس کا اندرونی روپ میرے سامنے آیا تو وہ مجھے کسی بھیڑیے سے کم نہ لگا رہی وہ بھیڑیا

.....بب..... بہت خوف ناک تھا۔ بس نے سی لی ہسٹیا
کی تھی میرے اوپر اتنا خوف سوار ہو گیا تھا کہ میں بے

”کوئی باپ ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے وہ بالکل اکیلا ہے۔“
رہبر نے کہا۔

”وہ کہتا ہے کسی بھی دھرم کی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ بھگوان دو ہیں، دنیا کی ہر کتاب میں یہی لکھا ہے

بھگوان ہیں، ہم تو جانوروں تک کی پوجا کرتے ہیں اب
 یہ جانور تو بھگوان نہیں ہو سکتا، بھگوان کی تعریف ان سب

”ایسی باتیں تو مسلم لوگ کرتے ہیں۔“
سکاویری نے کہا۔

”چھوڑو ان باتوں کو وہ دیکھو آسمان پر آج
چاند پورا ہے۔“ کاویری نے ربیر کی توجہ چاند کی طرف

”کک..... کک..... کاویری.....“ زنبیر نے

رہنیر کی طرف دیکھا رہنیر کا چہرہ خون کی طرح سرخ ہو چکا تھا آنکھوں سے پانی بہنے لگا آنکھوں کی حالت

”رن۔ ب۔ پیر۔ ک۔ ک۔“
 ”کیا ہوا تمہیں۔“ کاویری گھبرا کر تیزی سے اس کی طرف

1 April 2018

سے گھورا اور ایک زوردار جھٹکا دیا کاویری چیختی ہوئی کئی فٹ پیچھے جاگری رہنبر کی نظریں چمکتے ہوئے چاند پر لگی

رمبیر نے اسے بڑا حیرت انگیز دھکا دیا تھا اس کے سر کے پچھلے حصے پر ایک اور سر ابھرا آتا تھا جس کی وجہ

حیرانی اس بات کی تھی کہ آخر رنیر کو ہو کیا رہا ہے وہ رنیر کے قریب پہنچی۔

چلایا۔
”رور..... رنیر..... یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے۔“

جاؤ یہاں سے۔“ رنمیر دوبارہ چلایا اچانک اس کے منہ سے غراہٹ کی آواز نکلی ایسی غراہٹ صرف بھیڑیے کی دیکھ سکتے تھے۔

”رن..... پھر.....“ کاویری چلائی اور تیزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

تکلیف کے باعث لرزنی ہوئی آواز میں بولا۔
 ”تت..... تت..... تم چنا مت کرو میں۔ ابھی
 کمرہ قتل۔“

اب بھاتے ہوئے روپی رہی وہ دوڑی دوڑی اس ہوٹل کے قریب پہنچی ہوٹل کے باہر دوڑ کے گاڑی کے

حیرن، شگفتہ کن سہیں۔ ہادیہی ان دو کوں کروں سے

Dar Digest 1

قرب جا کر کانٹے ہوئے ہونٹوں سے بولی وہ دونوں لڑکے کا دیری کی طرف متوجہ ہوئے۔
 ”جی کیسے۔“ ہم آپ کی کیا ہیلپ کر سکتے ہیں۔“ ان میں سے ایک نے کا دیری کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”وہ..... وہ..... مہم..... مر جائے گا۔“ پپ پلیر میرے ساتھ چلیے۔“ کا دیری ٹوٹے پھوٹے لفظوں کے ساتھ بولی۔
 ”دیکھئے شانت رہنے اور بے خوف ہو کر بات کریں ہم آپ کی ضرورت ہیلپ کریں گے آخر پتہ تو چلے بات کیا ہے۔“ دوسرے لڑکے نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

”وہ..... وہ..... مر جائے گا اسے پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے وہ وہاں سڑک پر پڑا ٹرپ رہا ہے۔“ کا دیری بچوں کے انداز میں روتے ہوئے بولی۔
 ”ٹھیک ہے چلئے.....“ کا دیری ان دونوں کے ہاں کرنے پر پیچھے کی جانب بھاگی اور وہ دونوں لڑکے بھی اس کی پیروی میں بھاگے بھاگتے بھاگتے کا دیری اس جگہ پہنچی جہاں وہ رنیر کو چھوڑ کر گئی تھی لیکن وہاں رنیر کہیں بھی موجود نہیں تھا۔
 ”یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ دوسرے لڑکے نے کا دیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ..... وہ..... یہی تو تھا۔“ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔
 ”پر تو یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ پہلے لڑکے نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔ دور دور تک سنسنائی پھیلی ہوئی تھی۔

”ابھی تو رنیر یہیں پڑا ٹرپ رہا تھا۔“ کا دیری نے انگلی کے اشارے سے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں رنیر تھوڑی دیر پہلے ترپ رہا تھا۔

”اور کیا ہوا تھا اسے.....“ دوسرے لڑکے نے پوچھا۔
 ”ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے میں نے اس

کی توجہ چاند کی طرف کروائی تو اس کی حالت بری ہوئی شروع ہوئی اس کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ تکلیف میں ہو اس کے منہ سے جانوروں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔“ کا دیری نے بتاتے ہوئے کہا۔
 ”جانوروں کی آوازیں۔“ پہلے لڑکے نے حیرانگی سے کہا۔

”ہاں جیسے بھڑیے کی غراہٹ ہو، میں اس کی طرف بڑھی اس نے مجھے زوردار دھکا دیا ایسا دھکا جو عام انسان نہیں دے سکتا تھا وہ ترپتے ہوئے زمین پر گر گیا اور میں ہیلپ کے لئے آپ کو لے آئی پر تو وہ اب یہاں کہیں بھی نہیں ہے۔“ کا دیری نے ساری بات بتائی۔

”کیا وہ آپ کا بچہ تھا۔“ پہلے لڑکے نے ہی پوچھا۔ کا دیری نے جواب دینے کی بجائے حیرانگی سے ان دو بچوں کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا جو درخت کی شاخوں کے پیچھے سے ان تینوں کو گھور رہے تھیں۔

”وہ..... وہ..... آنکھیں کس کی ہیں۔“ کا دیری نے دوسرے لڑکے کے پیچھے بڑے سے درخت کی طرف اشارہ کیا دونوں لڑکوں نے حیرت سے گھوم کر پیچھے کی جانب دیکھا اسی وقت فضاء میں ایک غراہٹ کی آواز گونجی درخت پر بیٹھی اس چیز نے ان دونوں لڑکوں پر چلا ٹک لگادی کا دیری کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی یہ وہی کارلے رنگ کا بھیڑیا تھا جسے کا دیری پہلے بھی دیکھ چکی تھی کا دیری حیرتی سے دائیں کے راستے کی طرف بھاگی ڈر کا غلبہ اس پر مسلط ہو چکا تھا اس کے قدم خود بخود تیزی سے اٹھ رہے تھے کافی دیر بھاگنے کے بعد وہ رکی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس کی نظر جہاں تک جاتی تھی وہاں تک سڑک پر سنسنائی پھیلی ہوئی تھی کا دیری کا پورا جسم پسینے میں نہا چکا تھا اور خوف کے باعث جسم کا نپ رہا تھا سر کی سیس پڑی تیزی سے چل رہی تھیں کئی سوالوں نے اس کے گہرے ذہن میں اچانک کہاں سے

”رنیر کہاں گیا وہ بھیڑیا اچانک کہاں سے

آگیا؟ کیا دونوں لڑکے اس بھیڑیا کے خوراک بن گئے۔“ ان سوالوں کو سوچتے ہوئے وہ گھبرا گئی اچانک ایک خوف ناک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی مانند گوندا۔
 ”نن..... نن..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ ڈرتے ڈرتے خود سے ہمکام ہوئی اس کا ذہن کچھ اور ہی

جواب دے رہا تھا اس کے ذہن میں جو خوف ناک خیال آیا تھا وہ یہ تھا کہ کہیں رنیر ہی تو وہ بھیڑیا نہیں ہے لیکن اس کا دل دوسروں میں گر گیا تھا وہ سوچتے ہوئے آگے بڑھی اگر رنیر بھیڑیا نہیں ہے تو پھر رنیر کہاں گیا؟ کہیں اس خوف ناک بھیڑیے نے تو اس کا شکار نہیں کر لیا؟ ایک اور خوف ناک خیال اس کے ذہن میں ابھرا لیکن پیچھے جانے کی اس کی ہمت نہ تھی اس کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں دواں تھے وہ ہونٹ کے کافی قریب آچکی تھی وہ ہونٹ پہنچ کر انیسٹر دیال کو اتھارام کرنا چاہتی تھی۔

اچانک اسے پاس ہی جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سنائی دی وہ ٹھٹک کر رکی اس نے جھاڑیوں کی طرف دیکھا جھاڑیوں میں کوئی چیز موجود تھی اچانک کا دیری کے کانوں میں ایک غراہٹ کی آواز پڑی اچانک جھاڑیوں میں سے وہی بھیڑیا نکلا اس نے وہی سے کا دیری پر چلا ٹک لگائی کا دیری نے ایک زوردار چیخ ماری اور ہونٹ کی طرف بھاگنے لگی غراہٹیں فضاء میں گونجیں کا دیری نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی سنی گم ہوئی خوف میں مزید اضافہ ہو گیا پیچھے تین بھیڑیے تھے جو اس کا پیچھا کر رہے تھے کا دیری نے پرس سے کارکی چابی نکالی جو رنیر نے ہونٹ سے باہر نکلنے وقت اسے پکڑا دی تھی پارکنگ میں کھڑی گاڑی کے قریب پہنچنے پر اس نے ریموٹ سے گاڑی کا لاگ کھولا اور دروازہ کھول کر وہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اس نے پہلے ہی سے گاڑی اشارت کر کے گاڑی ریورس کی اور پھر اسپڈ کے ساتھ گاڑی آگے بڑھادی ان تینوں بھیڑیوں میں سے ایک بھیڑیا اچھلا اور جہان کھڑے ہونٹ کے چوکیدار کو لیتا ہوا ہونٹ کے ہال میں جا کر باقی

دو بھیڑیے کا دیری کی گاڑی کے پیچھے لگ رہے کا دیری نے گاڑی کی ٹیلا پر چھوڑ دی تھی دونوں بھیڑیوں کی رفتار بھی بہت زیادہ تھی وہ لمبی لمبی جست لگا کر کا دیری کی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے گاڑی کے قریب پہنچنے پر ان دونوں بھیڑیوں نے لمبی جست لگائی اور گاڑی کی چھت پر جا کرے کا دیری کے اوسان خطا ہو گئے اسے اپنی موت صاف نظر آنے لگی ان میں سے ایک بھیڑیا گاڑی کی وڈر اسکرین سے ہوتا ہوا گاڑی کے پونٹ پر آیا کا دیری کے منہ سے بے اختیار ایک زوردار چیخ نکلی بھیڑیے نے اپنا سر گاڑی کی وڈر اسکرین پر دے مارا گاڑی کی وڈر اسکرین پر کڑی کا جالا سا بن گیا کا دیری نے زوردار چیخ ماری اور آنکھیں بند کر کے بریکس پر مضبوطی سے تھم رکھ دیئے گاڑی کا جھٹکے سے رکی اور دونوں بھیڑیے غراتے ہوئے سڑک پر جا کرے کا دیری نے آنکھیں کھولیں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل پھیلیاں تو رک رہا ہے آجائے گا۔

اسی وقت کا دیری کے ذہن نے ایک ترکیب کا سہارا لیا اس نے تیزی سے گاڑی کا پہلا گیر لگا کر چیخوڑا گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی گاڑی دونوں بھیڑیوں کو چٹائی ہوئی آگے بڑھ گئی دو خوف ناک غراہٹیں فضاء میں گونجیں کا دیری نے بیک مر سے دیکھا دونوں بھیڑیے ترپ رہے تھے کا دیری نے کھکھ سا سانس لیا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا لیکن اسے رنیر کی فکر ہو رہی تھی وہ پریشان ہی ہو گئی پیچھے جانے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن اس نے رنیر سے جی محبت کی تھی اور اس نے بریکس لگا کر اس اور شش و پنج میں مبتلا ہو گئی کافی دیر وہ سوچ کے سمندر میں ڈوبی رہی بلا غراس نے پیچھے جا کر رنیر کی مدد کرنے کا سوچ لیا اس نے گاڑی تھمائی اور موت کے منہ میں چل پڑی ڈر بھی تھا لیکن محبت کا جوش بھی تھا سڑک پر مردہ بھیڑیوں کو چلی ہوئی وہ آگے بڑھی اچانک کار کی چھت پر کوئی چیز دم سے گری اور کا دیری کے دل کو دھچکا سا لگا۔
 یہ..... لگ..... کیا..... وہ خوف کے باعث ہٹ گئی۔

ایک ایک غراہٹ کی آواز گونجی اور کاویری کے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی وہ سمجھ گئی چھت پر تیسرا بھیڑیا بھی موجود تھا کاویری نے دوبارہ پہلے والا چیترو آزمانے کی سوچی یہ سوچتے ہی اس نے زبردست بریکس لگائیں گاڑی کی چھت پر موجود بھیڑیا غراتا ہوا سڑک پر جا کر کاویری نے تیزی سے وقت ضائع کئے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی بھیڑیا اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا کاویری کا اندازہ تھا کہ یہ بھیڑیا بھی دوسرے بھیڑیوں کی طرح کھلا جائے گا مگر کار کے نزدیک آتے ہی وہ بھیڑیا اچھلا اور گاڑی کے یونٹ پر جا بیٹھا کاویری کو اور تو کچھ نہ سوچا اس نے گاڑی کا اسٹیرنگ دائیں بائیں گھماتا شروع کر دیا لیکن بھیڑیے کے پیچھے مٹیوں سے گاڑی کے یونٹ پر تھے ہوئے تھے بھیڑیے نے مگزی کا جالائی وٹر اسکرین پر اپنا ہاتھ مارا وٹر اسکرین پکنا چور ہوئی بھیڑیے نے پتھروں کے نیچے یونٹ پر لگائے بھیڑیے نے دونوں ہاتھوں سے کاویری کی گردن پکڑ لی اور کاویری اسٹیرنگ پھوڑ کر اپنی گردن چھوڑنے لگی۔ گاڑی اب آؤٹ آف کنٹرول ہوئی تھی تیز رفتاری گاڑی سڑک سے اتر کر جھاڑیوں میں داخل ہوئی اور ایک موٹے درخت سے جا ٹکرائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاویری کا سر اسٹیرنگ سے جا ٹکرایا اور بھیڑیا غراتا ہوا درخت سے جا ٹکرایا کاویری کے سر سے خون فوارے کی مانند ابل بڑا اور بھیڑیا بھری طرح زخمی ہو گیا بھیڑیا کراہتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے چپکے چاند کی طرف..... آؤں..... بھیڑیے کے منہ سے آواز خارج ہوئی بھیڑیے کے ذمہ تیزی سے بھرنے لگے بھیڑیا نے خون میں نہائی کاویری کی طرف دیکھا اور پھر جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی اور جھاڑیوں میں گھس گیا غائب ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

دن کے اچالے نے ہر طرف پھیلنا شروع کر دیا تھا مگر رات کے اندھیرے نے ابھی اپنی حکومت مکمل طور پر نہیں چھوڑی تھی شہر کی زندگی آدمی سے زیادہ ابھی نیند کے مزے لوٹ رہی تھی آسمان پر پرندوں کے

خول نظر آرہے تھے ایسے میں وہ سفید رنگ کی کار اس صاف سڑک پر جا رہی تھی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان لڑکا بیٹھا تھا وہ کئی گھنٹوں سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اب گاڑی اس نے مچی سڑک پر اتاری تھی وہ لڑکا بہت پریشان نظر آ رہا تھا پھر اس لڑکے نے اپنی کار ایک بوسیدہ سے مکان کے سامنے روک دی وہ لڑکا گاڑی سے باہر نکلا اور اس بوسیدہ سے مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا وہ پہلے کمرے سے ہوتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچا تو اس نے دیکھا اس کمرے میں ایک بد صورت بوڑھا فرش پر آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا ہوا تھا اور منہ میں کچھ بڑا بڑا ہاتھ لڑکا ایک طرف فرش پر چھوٹک مار کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر بعد بوڑھے نے آنکھیں کھولیں اور اس لڑکے کی طرف دیکھا۔

”کہو مور کھ کیا خبر لائے ہو.....“ اس بوڑھے نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

”سادھو جی آج..... آج مجھے اپنی آنکھوں پر دھواں نہیں ہو رہا آج میں نے ایسا منظر دیکھ لیا ہے کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید پاگل ہو جاتا۔ پرنتو آپ کے دیئے ہوئے پانی کے کارن میں اسے نظر نہ آیا۔“ وہ لڑکا خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”کیا دیکھا تم نے۔“ سادھو رنگ نے بدستور گرج دار لہجے میں پوچھا۔

”وہ دونوں لڑکا اور لڑکی گھر سے باہر نکل کر کار میں بیٹھے میں نے ان کا تعاقب کیا وہ دونوں تھوڑی دیر بعد ایک ہوٹل میں چلے گئے کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں باہر آئے اور پیدل ایک طرف چلنے لگے میں نے آپ کے دیئے ہوئے پانی کے چھیننے اپنے کپڑوں پر ڈال لئے اب مجھے کچھ ٹھن سی محسوس ہونے لگی تھی میں ڈرتے ڈرتے ان دونوں کے قریب چلا گیا پھر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان دونوں کو میری موجودگی کا بالکل بھی پتہ نہ چلا حالانکہ میں ان دونوں کے بالکل قریب تھا وہ دونوں کچھ سے تک پریم کی باتیں کرتے رہے پھر اس لڑکی نے لڑکے کی توجہ چاند کی

طرف کرائی چاند کو دیکھ کر لڑکے کی حالت غیر ہونے لگی چہرہ سرخ، آنکھیں پھٹنے کو لگی تھیں وہ چوہتے ہوئے زمین پر جا گر لڑکی مدد کے لئے ہوٹل کی طرف بھاگی اسی سے میں ایک دل دہلا دیتے والا منظر دیکھا یہاں تک کہ وہ لڑکا ایک دفعہ پھر خاموش ہو گیا۔

”ہم سن رہے ہیں بولو تم نے کیا اور دیکھا۔“ سادھو نے پوچھا۔

”میں نے دیکھا وہ لڑکا (زنبیر) یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس نے ایک زوردار چیخ ماری اس نے اپنے سر کو تمام اس کی آنکھیں مکمل طور پر سرخ ہونے لگیں اس کے کپڑے اچانک پھٹنا شروع ہو گئے جسم کے بال تیزی سے بڑھنے لگے چہرے کے خدو خال بدلنے لگے چہرے پر بھی بالوں کا اضافہ ہونے لگا اب وہاں اس لڑکے کے بجائے ایک بہت بڑا اور خوف ناک بھیڑیا کھڑا تھا جس کے پیچھے انسانی شریعتا۔ بھیڑیے کے منہ سے آواز خارج ہوئی بھیڑیے نے میری طرف دیکھا میں خوف کے کارن اس سے ایک درخت کے پیچھے چھپا ہوا تھا جب بھیڑیے نے میری طرف دیکھا تو خوف کے کارن میرے پسینے چھوٹ گئے پرنتو پھر بھیڑیے نے سڑک کی دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا میں سمجھ گیا کہ آپ کے دیئے ہوئے پانی کے کارن میں اسے نظر نہیں آ رہا تھا سڑک کے دوسری طرف قدموں کی آواز سنائی دی وہ لڑکی (کاویری) کسی کو مدد کے لئے بلا کر لائی تھی بھیڑیے نے ایک حیران کن لمبی چھلانگ لگائی اور ایک بڑے سے درخت پر چڑھ کر چھپ گیا۔“

وہ لڑکا رنگ کو ساری بات بتاتا رہا اور رنگ بڑے غور سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

”خوب بہت خوب..... تم نے اچھا کام کیا میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوا ہوں۔“ رنگ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”سادھو جی میں حیران ہوں ایسے حیران کن منظر میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے ایک

انسان اتنا خوف ناک درندہ کیسے بن سکتا ہے اور پھر وہ درندہ کسی ککائے توہ بھی اسی کے جیسا بن جائے..... اف میرے بھگوان۔“ وہ لڑکا اپنے سر کو پکڑتے ہوئے بولا۔

”تم ان جھیلوں میں نہ پڑو..... وہ لڑکا زنبیر کہاں ہے۔“ رنگ نے کہتے ہوئے پوچھا۔

”وہ..... وہ میری کار کی ڈیگی میں ہے۔“ لڑکے نے بتایا۔

”تم نے واقعی مجھے خوش کر دیا اب تمہیں اس کام کی قیمت بھی ملنی چاہئے۔“ رنگ نے کہا اور کمرے کی دیواری کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اچانک دیوار پر ایک سایہ سا نمودار ہوا اور تیزی سے حیران پریشان اس لڑکے کی طرف بڑھا اور اپنا گھبرا اس لڑکے کے ارد گرد ڈال لیا اب وہ لڑکا اس سایے میں مکمل طور پر گم ہو گیا تھا تھوڑی دیر بعد وہ سایہ یلحہ ہوا تو ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ زمین پر جا گر۔

”تم اپنا کام تو جانتے ہونا.....“ سائے میں سے آواز خارج ہوئی۔ ”اچھی طرح.....“ رنگ نے سکرآتے ہوئے کہا۔

پورے شہر میں ایک ہی خبر پھیلی ہوئی تھی۔

”ایک خنخوار بھیڑیے نے ہوٹل میں موجود 5 لوگوں کی بڑی بے دردی سے ہتھی کر دی۔“

”تفصیلات کے مطابق رائل ہوٹل میں اچانک ایک خنخوار بھیڑیا آیا اور اس نے وہاں خون کی ہولی مچادی ایک زخمی کے بیان کے مطابق سب لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ ہوٹل کا ہیرونی دروازہ ٹوٹ کر اندر آگرا ہوٹل میں موجود سب لوگ حیرانگی سے اس طرف دیکھنے لگے اچانک ایک کالے رنگ کی چاند چتر اندر داخل ہوئی خدو خال اور شریر کے لحاظ سے وہ بھیڑیا ہی لگتا تھا اس خوف ناک بھیڑیے کو دیکھ کر عورتوں کی چیخیں نکل گئیں وہ ایک بہت خوف ناک بھیڑیا تھا جو عام بھیڑیوں سے شریر کے لحاظ سے بہت بڑا تھا بھیڑیا اٹارہ اگلی آنکھوں سے سب کو گھور رہا تھا۔ بھیڑیے نے

حیران کھڑے ایک آدمی پر چلائگ لگائی اور اپنے نوکیلے نچے اس آدمی کے سینے میں گاڑ دیے جنھوں سے ہوٹل کا نپ اٹھا جو بھی بھڑپے کے سامنے آتا مارا جاتا خون ٹپ ہونی کیلئے کے بعد بیڑیا ہاں سے چلا گیا ہوٹل سے تھوڑی دور آگے نکلتی ہوئی دو آدمیوں کی لاشیں بھی پولیس کو پیش ہیں پولیس نے ان کی پہچان کرنی ہے رنجیت اور ونیش نانی یہ دونوں آدمی بھی ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے اس جائے حادثہ سے تھوڑی دور آگے ایک ڈبیچ کار اور اس میں موجود ایک بے ہوش لڑکی ملی تھی جواب اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے پولیس تحقیقات کر رہی ہے۔“

کریاں تک آنے والے لہجے میں بولا۔
 ”بس اسقدر تم تو انہی سے صحت ہار گئے ابھی
 تو میں نے تمہیں مزید تک کرنا ہے اس چھپر کا بدلہ ابھی
 پورا نہیں ہوا..... ابھی تو میں نے تمہارے سپورٹ کے
 چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہیں۔“ رنگازا ہر یلے لہجے
 میں بولا۔

”کیوں انکسپلر۔ دشواس آیا میری باتوں پر۔“ رنکا نے مسکراتے ہوئے کہا انکسپلر دیال کا دل چاہتا تھا کہ وہ اٹھ کر رنکا کا برا حال کر دے مگر اس کا جسم

بے جان سا کرسی پر بڑا ہوا تھا۔
 ”یہ..... یہ تم نے میرے بیٹے کے ساتھ.....
 کلک..... کیا کیا۔“ تب..... تمہیں تو میں نے تمہیں مارا تھا
 پر تو تم نے میرے بیٹے کو مارا کیوں دی۔“ اسپیڈر دیال
 مہر کی ہوئی آواز میں بولا۔

”پرنس تو دوبارہ بھیڑیا تو نہیں بنے گا ناں۔“
 انپکڑ دیاں نے پوچھا۔
 ”اس کے لئے نہیں رات کے سہے وہاں رکنا
 پڑے گا اسی مکان میں خون سے رنگا ایک غنجر ہے وہ

رنیر کے سینے میں تب مارنا ہے جب وہ بھیڑے کی حالت میں ہوگا یہ کام آج رات تک ہی ہونا چاہئے نہیں تو دوسرے دن کا سورج نکلنے ہی تمہارا بیٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھیڑ پائن جائے گا پھر وہ دوبارہ کسی بھی انسان نہیں بن سکے گا..... یہ کام جلد سے جلد کرو کیونکہ سے بہت کم ہے۔“ رنگا نے کہا اسی وقت کر وہ دوبارہ روشنی میں نہا گیا رنگا غائب ہو گیا اور انسپکٹر دیال کو بھی اپنے بے جان جسم میں دوبارہ طاقت بحال ہوتی ہوئی محسوس ہوتی کرے گا دروازہ کھلا اور سنٹوش اور انجلی کمرے میں داخل ہوئے۔

☆.....☆.....☆

میری نظر میں تم سے بہتر اور کوئی نہیں..... جانا تو میں ہی چاہتا تھا پر رنیر کو نے مجھے آنے سے منع کیا ہے مجھے دھواں ہے تم سے بہتر کوئی اور یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا۔“ انسپکٹر دیال یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا۔ “آپ کے لئے تو اکل میری جان بھی حاضر ہے پر تو حیرانی مجھے اس بات کی ہے کہ وہ رنگا یکدم آپ پر ہیرا مان کیسے ہو گیا وہ تو آپ کو اپنا خاص دشمن سمجھتا تھا۔“ سنٹوش نے پوائنٹ کی بات کی تھی۔

”بیٹا تمہارے پاس رنگا کی بات ماننے کے علاوہ اور کوئی اپائے نہیں ہے سے بہت کم ہے تمہیں جلد سے جلد جانا ہوگا۔“ انسپکٹر دیال کا لہجہ منت آ میر تھا۔

”ٹھیک ہے اکل اگر لوہروالے نے چاہا تو میں ضرور رنیر کو واپس لے کر آؤں گا۔“ سنٹوش پر امید لہجے میں بولا۔

”بھگوان تمہیں کامیاب کرے بیٹا۔“ انسپکٹر دیال نے کہا۔

”ٹھیک ہے اکل میں بھی سنٹوش کے ساتھ جاؤں گی۔“ ایک طرف بیٹھی انجلی نے کہا۔

”نہیں بیٹی تم میری خاطر اپنی جان سنگت میں نہیں ڈالو گی۔“ انسپکٹر دیال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اکل جی سنٹوش بھی تو خطروں سے کھیلنے کے

لئے جا رہا ہے میں اس کے کام آؤں گی آپ نے سنا ہی ہوگا ایک سے بھلے دو۔“ انجلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ “نہیں انجلی تم میرے ساتھ نہیں جاسکتی وہاں بہت خطرہ ہے۔ شاید میں نہ لوں۔“ سنٹوش نے بھی نفی میں سر ہلایا۔

”اگر تم زندہ واپس لوٹے تو مجھے ساری عمر اس بات کا دکھ رہے گا کہ بھگوان نے ایک موقع دیا اپنے کام کرنے کا وہ بھی ہاتھ سے گنوا دیا۔“

”ہم ضرور کامیاب ہوں گے میں ہر حال میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“ انجلی ضدی بچے کی طرح بولی۔

”پر تو تمہارے ماتا پتا کیسے مانیں گے۔“ سنٹوش نے پوچھا۔

”اس کی چھتا تم مجھ پر چھو دو۔“ میں ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد تمہیں یہیں ملوں گی۔ وہ بھی گاڑی سمیت۔“ انجلی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری اچھا.....“ سنٹوش نے ہار مانتے ہوئے کہا اور انجلی مسکراتے ہوئے آفس سے باہر نکل گئی۔

”ٹھیک ہے اکل میں بھی ماما جی اور ماما جی سے کوئی بہانہ بناتا ہوں۔“ سنٹوش نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا مجھے بھی معاف کر دینا میں تمہیں موت کے منہ میں بیچ رہا ہوں۔“

”اکل جی شرمندہ مت کیجیے مصیبت کے سے ایک دوسرے کے کام آنا ہی انسانیت ہے یہ عبد اللہ کا کہنا ہے اور ویسے بھی آپ چننا تمہیں میرے ساتھ دنیا کی سب سے بڑی ہستی ہے۔“ سنٹوش نے کہا اور انسپکٹر دیال کے آفس سے باہر نکل آیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد سنٹوش اور انجلی گاڑی میں بیٹھے آند پر گاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔

”تو مل گئی اجازت۔“ سنٹوش نے پوچھا جو ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا انجلی

کا رڈرائیونگ کر رہی تھی۔

”اجازت ملی ہے تو تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔“ انجلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ویسے سنٹوش مجھے دھواں نہیں ہو رہا کہ ایک انسان رات کے سے بھیڑ پائن جاتا ہے..... اپنی سبیل سے انجلی یقین نہ آنے والے لہجے میں بولی۔

”انجلی دنیا میں ہر چیز پر دھواں کیا جاسکتا ہے ہر انہونی ہوتا ہو جاتی ہے۔ بانی تم جا رہی ہو وہاں بڑے حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملیں گے۔“ سنٹوش نے کہا۔

”تم کیسے جانتے ہو۔“ انجلی حیران ہوئی۔ “میرا دل کہتا ہے.....“ سنٹوش نے کپڑوں کے نیچے چھپا لاکٹ کا ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔

”ویسے میں نے تمہارے بارے میں بھی حیران کن باتیں سنی ہیں۔“ انجلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرے بارے میں۔“ سنٹوش بھی زبردستی مسکرایا۔

”ہاں تمہارے بارے میں۔“ جواباً انجلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا سنا ہے میرے بارے میں۔“ سنٹوش نے بظاہر پوچھا۔

”یہی کہ تم پر بھگوان کی کرپا ہے۔“ انجلی نے بتایا۔

”وہ تو سب پر ہے۔“ سنٹوش مسکرایا۔

”پر تو تم پر کچھ خاص قسم کی ہے۔“ انجلی مسکرائی۔

”وہ کیسے.....“ سنٹوش حیران ہوا۔

”تمہارے کئی قصے سنے ہیں میں نے۔“ انجلی نے کہا۔

”وہ تو بس انو اپن ہیں.....“ سنٹوش نے کہا۔

”انو اہوں کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔“ انجلی مسکرائی۔

”چھوڑو اس موضوع کو یہ بتاؤ کہ تم میرے

ساتھ اس سفر پر کیوں جا رہی ہو۔“ سنٹوش نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

نمبر 1 یہ پلنے کا کام ہے نمبر 2 تمہارے کارن۔“ انجلی نے بتایا۔

”میرے کارن۔“ سنٹوش کے لہجے میں حیرت موجود تھی۔

”ہاں تمہارے کارن، کیونکہ جب یہ جان ہی تمہاری ہے تو تمہارے ساتھ ہی جائے گی۔“ انجلی عجیب سے لہجے میں بولی۔

”میری جان.....“ حیرت ابھی تک سنٹوش کے لہجے میں موجود تھی۔

”میں تمہیں کھل کر بتاتی ہوں۔ کیونکہ ہم دونوں جس مہم پر جا رہے ہیں شاید ہماری واپسی اسی نہ ہو اس لئے میں اپنے دل پر بوجھ نہیں رکھنا چاہتی۔“ انجلی نے کہا۔

”تم کیا کہہ رہی ہو مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی پہیلیاں کیوں بھجوا رہی ہو.....“ سنٹوش اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”مم..... میں..... میں تم سے پریم کرتی ہوں۔“ انجلی نے ہلکاتے ہوئے آخر کہہ ہی دیا اور سنٹوش حیرانگی سے انجلی کا منہ دیکھنے لگا۔

”دیکھو سنٹوش میں نے تو تم سے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے پر تو اگر تمہیں مجھ سے پریم نہیں ہے تو مجھے تم سے کوئی کھا نہیں ہے۔“ انجلی نے سنٹوش کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تم میں تو بڑی ہمت ہے انجلی۔ اتنی بڑی بات اور تم نے اتنی آسانی سے کہہ دی۔“ سنٹوش نے مسکراتے ہوئے انجلی کو داد دی۔

”سنٹوش دل میں جو بات ہو کہہ دینی چاہئے فرض کرو اگر تمہیں کسی سے پریم ہے اور وہ بھی تم سے پریم کرتا ہو صرف ایک دوسرے کو کہہ نہیں پائے اور دونوں کی شادی علیحدہ علیحدہ ہو جاتی ہے پریم ایسی چیز ہے جو آسانی سے دلوں سے نہیں نکلتی ساری زندگی

دونوں مشکل زندگی گزار رہے تھے۔ انجلی نے کہا۔
 ”بڑی بڑی بھی تو ہو سکتا ہے تم دوسرے سے اظہار
 محبت کر دو تم سے پریم کرتا ہی نہ ہو۔“ سنٹوش نے
 سوالیہ نگاہوں سے انجلی کی طرف دیکھا۔
 ”پھر کبھی کہنا چاہئے۔“ انجلی نے کہا۔
 ”اب تمہاری جیسی ہمت ہر کسی میں تو ہے نہیں
 ہر انسان کا مائنڈ پیچ ہوتا ہے بھی تو ہو گا ان کا نظام ہے
 کوئی انسان کافی چیز ہے کوئی سیدھا ہے اور کوئی بے
 وقوف۔۔۔۔۔۔ اب دیکھو نا پریم تو میں بھی تم سے کرتا تھا پر تو
 کہنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں تم میرے چہرے پر تھیں نہ
 بارود۔“ سنٹوش نے کہا تو انجلی ایک زوردار قہقہہ لگا کر
 ہنس پڑی۔
 ”ویسے ایک بات کہوں سنٹوش۔۔۔۔۔۔“ انجلی نے
 بظاہر اجازت چاہی۔
 ”کہو۔۔۔۔۔۔“ سنٹوش نے اجازت دیتے
 ہوئے کہا۔
 ”تم کسی سے بھی اظہار محبت کرو کوئی بھی لڑکی
 ہو وہ تمہیں نہ نہیں کہے گی اور تمہارے گال چھڑ کے لئے
 نہیں ہیں کیونکہ کوئی بھی لڑکی تمہارے خوب صورت
 شہدوں میں گرفتار ہو سکتی ہے کوئی بھی تمہارے چہرے
 سے نفرت نہیں کر سکتا کیونکہ تمہارے چہرے میں ایک
 عجیب سی کشش ہے۔“ انجلی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
 ”بس بس اب اتنی تعریفیں ابھی نہیں
 ۔“ سنٹوش نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا تو انجلی ایک
 مرتبہ پھر ہنس پڑی۔
 ”اب آئندہ پورے لئے کیا پلان ہے۔“ چند
 لمحوں کے بعد انجلی نے پوچھا۔
 ”وہاں جا کر ہمیں خون سے رنگا خنجر ڈھونڈنا
 ہے اور جب رنیر بھیڑیابے گا تو اس خنجر کا دار رنیر کے
 سینے پر کرنا ہوگا۔“ سنٹوش نے بتایا۔
 ”بھئی بے کاروپ میں۔۔۔۔۔۔ یہ تو بہت خطرناک
 کام ہے۔“ انجلی خوف کے باعث بولی۔
 ”کام تو واقعی مشکل ہے ہم دونوں کی جان بھی
 آئے ہیں۔“ سنٹوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جاسکتی ہے اسی کارن تو میں تمہیں منع کر رہا تھا۔“ سنٹوش
 نے کہا۔
 ”اب میں نے اپنی جان تمہارے نام کر دی
 اور اب ہم دونوں کا جینا مرنا ایک ساتھ ہوگا۔“ انجلی نے
 سنجیدہ لہجے میں کہا۔ گاڑی اب آئندہ پور گاؤں کی حدود
 میں داخل ہو چکی تھی جلد ہی انہیں وہ مکان بھی نظر آ گیا
 سورج اب کافی حد تک دن کا ساتھ چھوڑ رہا تھا مکان
 آئندہ پور کی ابتدائی حدود میں ہی تھا مکان کافی پرانا تھا
 اور اس کی حالت کافی خستہ حال تھی انجلی نے گاڑی اس
 مکان کے سامنے روک دی دونوں گاڑی سے نیچے
 اترے۔
 ”یہ تو کافی پرانا مکان لگتا ہے۔“ انجلی نے مکان
 کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس نے آنکھوں پر لگی کالی
 عینک سر پر رکھ دی تھی۔
 ”مکان تو واقعی کافی پرانا ہے۔“ سنٹوش نے
 اثبات میں سر ہلایا۔ مکان کا دروازہ لکڑی کا تھا وہ دونوں
 آگے بڑھے اور مکان کے دروازے کے قریب پہنچے۔
 دروازے پر کوئی بھی تالا نہیں تھا سنٹوش نے دروازے
 کو اندر کی جانب دھکیلا تو گرد و غبار کا ایک بھجھوکا سا
 دونوں کی ناک سے ٹکرایا دونوں کھانسنے لگے گرد و غبار
 ہٹنے کے بعد وہ دونوں آگے بڑھے اور مکان میں داخل
 ہو گئے فرش پر بھی گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی فرش پر چلنے
 سے جوتوں کے نشان واضح ہو رہے تھے پورے کمر میں
 دو کمرے تھے جن میں سے ایک کمرے میں رنیر بے
 ہوش کی حالت میں فرش پر پڑا ہوا تھا رنیر کے ہونٹوں
 پر خون لگا ہوا تھا جو یقیناً انسانی تھا سنٹوش گاڑی سے پانی
 کی بوتل نکال کر لایا اور پانی کے چھینے رنیر کے چہرے
 پر مارے ہوش میں آنے کے بعد رنیر حیرانگی سے ارد گرد
 دیکھنے لگا۔
 ”مم۔۔۔۔۔۔ میں کہاں ہوں سنٹوش۔“ حیرانگی کے
 عالم میں رنیر کے منہ سے نکلا۔
 ”تمہیں کٹنپ کیا گیا تھا ہم تمہیں چھڑانے
 آئے ہیں۔“ سنٹوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کٹنپ۔۔۔۔۔۔ مجھے کسی نے کٹنپ کیا ہے
 اور کیوں کیا ہے۔“ رنیر نے ایک ہی سانس میں کئی
 سوال کر ڈالے۔
 ”ارے۔۔۔۔۔۔ ارے ابھی کچھ حوصلہ کرو اتنے
 سوالوں کے ایک ساتھ جواب نہیں دے
 سکتا میں۔“ سنٹوش نے بولتا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا
 ”میرا سر چکر رہا ہے سنٹوش اور یہ میرے
 ہونٹوں پر کیا لگا ہوا ہے۔“ رنیر اپنے ہونٹوں پر زبان
 لٹکھرتے ہوئے بولا۔
 ”کچھ نہیں تم اٹھ کر بیٹھو میں تمہارے لئے کچھ
 کھانے کو لاتا ہوں۔“ سنٹوش نے کہا۔
 ”نہیں۔۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔۔ مجھے بھوک نہیں ہے
 میں سونا چاہتا ہوں۔“ رنیر نے ہماری ہوتی ہوئی پگلوں
 کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھیک ہے پھر تم سو جاؤ۔“ سنٹوش نے سامنے
 بڑی ٹوٹی پھوٹی چار پائی کی طرف اشارہ کیا رنیر نے
 اپنے کی کوشش کی تو سنٹوش نے اس کا ساتھ دیا چار پائی
 پر لیٹے ہی وہ سو گیا سنٹوش نے کمر میں پڑی ری سے
 رنیر کو مضبوطی سے باندھ دیا۔
 ”یہ تو ایسے سو رہا ہے جیسے کئی دنوں سے نہ سویا
 ہو۔“ انجلی کی ہنسی نکل گئی۔
 ”اس بات کو چھوڑو تم اور خون سے رنگا وہ خنجر
 ڈھونڈو ہمیں جلدی کرنا ہوگی۔“ سنٹوش نے تیز لہجے
 میں کہا۔
 اب دونوں وہ خنجر ڈھونڈنے لگے پورا مکان
 دیکھ کر وہ ہشتل تھا چھت پر جانے کے لئے سیز حیاں
 کی نہیں سیز حیاں کے نیچے چھوٹا سا خلا بھی تھا جس میں
 پوتا چھوٹا سامان پڑا ہوا تھا سنٹوش اور انجلی نے پورا
 کمر جھان مارا مگر وہ خنجر نہ ملا اب سیز حیاں کے نیچے پڑا
 ٹوٹا پھوٹا سامان ہی رہ گیا تھا اسی وقت دونوں کو رنیر
 کے کمرے کی آواز سنائی دی۔
 ”تم ایسا کرو چھت پر جا کر چھپ جاؤ میں یہیں
 بیٹھوں۔“ سنٹوش نے انجلی سے مخاطب ہوئے

ہوئے کہا۔
 ”نہیں۔۔۔۔۔۔ میں بھی یہی رہوں گی۔“ انجلی نفی
 میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔
 ”بے وقوفانہ باتیں مت کرو اور اوپر
 جاؤ۔“ سنٹوش نے سخت لہجے میں کہا تو انجلی بوجھل بوجھل
 قدموں کے ساتھ سیز حیاں کی طرف بڑھی وہ چھت
 پر پہنچی تو آسمان برسنے کے موڈ میں تھا سنٹوش سیز حیاں
 کے نیچے پڑے ٹوٹے پھوٹے سامان میں سے لوہے کی
 ایک سلاخ نکلی اور رنیر کی چار پائی کے پاس آ کر بیٹھ گیا
 سنٹوش نے دیکھا رنیر کی آنکھیں کھلیں ہوئیں نہیں
 جوتوں کی طرح سرخ نہیں اور وہ چھت کو گھور رہا تھا
 پھر وہ یکدم پیچھا اور پھر رنیر کی گرفت سے اپنے آپ
 کو چھڑانے لگا پھر سنٹوش نے ایک حیرت انگیز منظر
 دیکھا۔
 اچانک رنیر کے چہرے کے خدو خال بدلنے
 لگے اور جسم پر پہنے ہوئے کپڑے پھٹنا شروع ہو گئے
 رنیر کے جسم پر بندھیں رسیاں بھی ٹوٹ گئیں رنیر کے
 چہرے اور جسم پر لمبے لمبے بال ہونے لگے تھوڑی دیر بعد
 وہاں ایک خوف ناک بھیڑیا لیٹا ہوا تھا سنٹوش خوف
 کے باعث کانپنے لگا۔
 اچانک سنٹوش کے گلے میں پہنا ہوا لاکٹ گرم
 ہونے لگا بھیڑیا اٹھ کر کھڑا ہوا سنٹوش کو اپنی موت
 صاف نظر آنے لگی اتنا خوف ناک بھیڑیا اس نے زندگی
 میں کبھی نہیں دیکھا دوسرا لہجہ حیران کن تھا وہ بھیڑیا
 سنٹوش کے پاس سے ایسے گزر گیا جیسے اس نے سنٹوش
 کو دیکھا ہی نہ ہو وہ بھیڑیا گھر سے باہر نکل گیا سنٹوش
 نے اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کیا اس کے گلے
 میں پہنا ہوا لاکٹ بھی یکدم شٹنڈا ہو گیا اور سنٹوش سمجھ گیا
 کہ وہ کس وجہ سے بھیڑیے کو نظر نہیں آیا تھا یہ اس لاکٹ
 کا کمال تھا باہر اب بارش نے برساتا شروع کر دیا تھا انجلی
 بھی چھت سے نیچے آ گئی اس کے چہرے پر ہوائیاں
 اڑ رہی تھیں۔
 ”مم۔۔۔۔۔۔ میں نے آج ایسا حیرت انگیز

اور خوف ناک منظر دیکھ لیا ہے کہ مجھے اپنی آنکھوں پر دھواں نہیں ہو رہا۔" انجلی یقین نہ آنے والے لہجے میں بولی۔

"مجھے بھی چند منٹ پہلے ایسا ہی لگا تھا پر توبہ سچ ہے۔" سنتوش نے کہا۔

"بہت بھیاں سچ ہے۔" انجلی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

"ہاں یہ تو ہے۔ ہمارے پاس سے بہت کم ہے۔ اس خون لگے پتھر کو ڈھونڈو....." سنتوش نے انجلی کو اصل مقصد سے آگاہ کیا۔

"ہم نے ہر جگہ تو دیکھ لیا ہے مگر وہ پتھر کہیں نہیں ہے صرف سبز میوں کے نیچے موجود ٹوٹے پھوٹے سامان کو چیک نہیں کیا وہاں دیکھتے ہیں۔" انجلی نے کہا۔ "مجھے دھواں ہے پتھر وہیں ہے۔" سنتوش نے پختہ لہجے میں کہا سبز میوں کے نیچے موجود ٹوٹے پھوٹے سامان میں سے آخر کار انہیں وہ خون سے رنگا پتھر مل ہی گیا۔

☆.....☆.....☆

گرج چمک اور تیز بارش کی بجہ سے وہ لڑکی ڈری بھی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی پیار ماں بار بار کھانسی رہی تھی۔

"سچ..... جاگتی..... بیٹی..... اس کی پیار ماں نے اسے پکارا۔

"سچ..... جی ماما جی....." وہ احترام سے بولی۔

"بیٹی تھوڑا سا پانی تو پلا۔" اس کی ماں نے کہا۔

"ابھی لائی ماں جی۔" جاگتی نے کہا اور کمرے سے باہر نکل کر باہر مین میں آگئی بارش نے یکدم اسے اپنے ٹھہرے میں لے لیا وہ ایک طرف پڑے ٹکڑی کے اسٹینڈ کی طرف بڑھی اس نے گھڑے میں گھاس ڈالا تو گھڑ پانی سے خالی تھا۔

"اف بھگوان....." وہ پریشانی سے بولی ماں کو وہ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ بہت زیادہ پیار تھی

گھر سے تھوڑی دور ہی ایک ٹکڑا تھا جو گاؤں کے سرچھنے لگوا تھا اس نے گھاس پھرا اور گھر سے باہر نکل آئی بارش، غصے سے گرجے پادلوں اور سیاہ رات کا اسے ڈر تو تھا لیکن ماں کی پیاری اور حکم اسے زیادہ عزیز تھی اللہ نے اسے بہت زیادہ حسن سے بھی نوازا تھا گاؤں کے ہر نوجوان لڑکے کی نظر اس پر تھی کیلے کپڑوں نے اس کے جسم کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور بارش کے قطرے اس کے چہرے پر قس کر رہے تھے۔ چلتے چلتے اچانک جاگتی کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پیچھے کوئی بھی نہیں تھا اس نے گردن سیدھی کی اور دوبارہ پل بڑی بارش کی بجہ سے ہر طرف بکھڑی پتھر تھی اس نے نکلے سے پانی کا گلاس بھرا اور واپسی کے لئے پیچھے ہی واپس مڑی تو ڈر کی وجہ سے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا سامنے اس کے گاؤں کے دولہا لڑکے راجیش اور ونیش گھڑے سے جوردانہ آتے جاتے اسے کندھی نظروں سے گھورتے تھے۔

"کیسی ہو جاگتی۔" ونیش نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"و..... و..... دیکھو..... مم..... مجھے جانے دو۔" مم..... میری ماں بہت پیار ہے۔" جاگتی احتجاجیہ لہجے میں بولی۔

"جانے دیں گے پر تو پہلے اپنا کام کریں گے پھر تمہیں جانے دیں گے۔" ونیش نے وحشی نگاہوں سے جاگتی کے جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بھگوان کے لئے مجھ پر رحم کرو، میری ماں کو بہت پیاس لگی ہوئی ہے وہ..... وہ مر جائے گی۔" جاگتی روتے ہوئے بولی۔

"ہم کون سا تمہیں روک رہے ہیں بس ہمارا کام ہونے دو پھر چلی جانا۔" راجیش نے مسکراتے ہوئے کہا اچانک جاگتی تیزی سے گھومی اور اس نے ایک طرف بھاگنا شروع کر دیا اس کے علاوہ وہ اور کبھی کہا کر سکتی تھی اسے اپنے پیچھے راجیش اور ونیش کے قہقہے

لانی دیئے، بھاگتے بھاگتے جب وہ تھک گئی تو اس نے محرم کر دیکھا تو اسے دور دور تک وہ دونوں کہیں بھی لہائی نہ دیئے وہ ایک درخت کے سہارے کھڑی ہو کر اپنی پھولی ہوئی سانس بحال کرنے لگی اچانک وہ لڑکوں درخت کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آئے جاگتی کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی راجیش نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا..... اب کہیں نہیں جاؤں گے۔" راجیش نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو تمہیں بھگوان کی سونگ....." جاگتی روتے ہوئے بولی راجیش نے اسے کندھے پر اٹھالیا اور اچانک انہیں الگ غراہٹ کی آواز سنائی دی اور پھر وہاں ایک خونخواری ٹرین آ گیا۔

☆.....☆.....☆

خنجر قول گیا اب رہبر کو ڈھونڈتے ہیں۔ سنتوش نے انجلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بارش تمہنے دو پھر اسے ڈھونڈنے نکلے ہیں۔" انجلی نے کہا۔

"بارش تمہنے کے ارادے تو صبح تک کے نہیں ہیں اور ہمارے پاس سے بھی صبح تک کا ہے اور اب آدھی رات سے بھی زیادہ کا ہو گیا ہے۔" سنتوش نے کہا۔

"پر تو اس بارش میں رہبر کو ڈھونڈنا خطرناک ہے۔" انجلی پریشان کن لہجے میں بولی۔

"خطرہ تو سہیلنے کے لئے ہی تو ہم یہاں آئے ہیں۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پر تو پھر بھی....." انجلی نے کچھ کہنا چاہا لیکن ونیش نے اسے ٹوک دیا۔

"باتوں کو چھوڑ دو اور باہر نکلو۔"

آخر کار وہ دونوں اس مکان سے باہر نکلے بارش کا بھی پورے جوش کے ساتھ برس رہی تھی مکان سے نکلنے ہی بارش نے تیزی سے انہیں اپنے گھر سے

لے لیا وہ دونوں کانپتے ہوئے آگے بڑھے وہ دونوں کافی دیر اس بھڑے کو ڈھونڈتے رہے مگر وہ انہیں کہیں بھی نہ ملا چلتے چلتے اچانک انجلی کا سر کی چیز سے ٹکرایا اور وہ چیختی ہوئی کچھڑیں جاگتی سنتوش نے انجلی کو سہارا دے کر اٹھایا سنتوش اور انجلی نے اس چیز کی طرف دیکھا جس سے ٹکڑا کر انجلی زمین پر گری تھی اس چیز کو دیکھ کر انجلی کے منہ سے چیخ نکلی وہ ایک لاش تھی جس کی حالت بہت خراب تھی پاس ہی ایک اور لاش تھی اس کی حالت بھی پہلی لاش جیسی ہی تھی سنتوش اور انجلی کو تھوڑی دیر ایک لڑکی بھی ملی جو زندہ تھی وہ بے ہوش تھی اور مکمل طور پر کچھڑ میں ڈوبی ہوئی تھی سنتوش نے اس لڑکی کے گالوں پر ہلکے ہلکے پھیروں کی بارش کی تو وہ لڑکی چیختے ہوئے ہوش میں آگئی جو جاگتی تھی۔

"مم..... مم..... مجھے اس جانور سے بچالو۔" جاگتی ڈرتے ہوئے بولی۔

"دیکھو گھبراؤ مت وہ جانور یہاں سے جا چکا ہے تم اب محفوظ ہو۔" سنتوش نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"مم..... مم..... میری ماں پیار ہے میں اس کے لئے پانی لینے آئی تھی میرے گاؤں کے دولہا لڑکوں نے میری عزت لوٹی چاہی پر تو وہ جانور جو شریر کے لحاظ سے بھی خطرناک تھا اس نے ان دونوں پر حملہ کر دیا میں اسی سے بے ہوش ہو گئی اگر وہ بھیڑیا سے پرہیز آتا تو شاید میں آج بھی کو زندہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔" اتنا کہہ کر جاگتی رونے لگی۔

"وہ بھیڑیا دیے عورتوں کے لئے تو دشمن ہی ثابت ہوا ہے جیسے کا میری کے لئے ثابت ہوا تھا۔" سنتوش نے کہا اور پھر جاگتی کی طرف ہوا۔

"ٹھیک ہے تم اپنی ماما جی کے لئے پانی لے جاؤ۔"

جاگتی ابھی اور ایک طرف چل دی۔ "کانی ڈھونڈ لیا پر تو ہمیں رہبر کہیں بھی نظر نہیں آیا۔" انجلی پریشان کن لہجے میں بولی۔

”ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے اگر تم مانو تو۔“ سنٹوش نے کہا۔

”میں مانوں تو۔۔۔ کیا مطلب۔“ انجلی حیران ہوئی۔

”مطلب یہ کہ وہ بھیڑیا خون کا پیاسا اگر تمہیں دھم لگا یا تو وہ تمہارے خون کی بوسہ کھیتے ہوئے تم تک آئے گا اور میں اس کے سینے میں یہ خنجر گھونپ دوں گا۔“ سنٹوش نے بتایا۔

”یہ ترکیب تو بہت خطرناک ہے۔“ انجلی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا حالانکہ وہ اندر سے ڈری ہوئی تھی۔

”اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی ادا پائے نہیں ہے۔“ سنٹوش نے کہا۔

”اگر میری جان چلی گئی تو۔“ انجلی مسکرائی۔

”ادھر والے پر دوش اس رکھو تو ہٹنے کا کام کرو گی۔ وہ تمہاری رکھنا کرے گا۔“ سنٹوش نے انجلی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر۔۔۔۔۔“ انجلی رضامندی سے بولی۔ سنٹوش نے اسے چاقو سے دھم لگایا اور ایک طرف کھڑے ہو کر بھیڑیے کا انتظار کرنے لگا چند لمحوں بعد ہی انہیں دور سے بھیڑیے کی غراہٹوں کی آوازیں سنائیں دیئے لگیں۔

”تم کسی درخت کے پیچھے چھپ جاؤ۔“ انجلی نے ڈر کے باعث کانپتے ہوئے کہا۔

”تم میری چٹامت کرو وہ مجھے نہیں دیکھ پائے گا۔“ سنٹوش نے پراسحار لہجے میں کہا۔

”وہ کیسے۔۔۔۔۔“ انجلی حیران ہوئی۔

”بس دیکھتی جاؤ۔“ سنٹوش زبردستی مسکرایا

کیونکہ وہ بھی اب ڈر رہا تھا کیونکہ بھیڑیے کی غراہٹوں کی آوازیں اب نزدیک سے آ رہی تھیں چند ہی لمحوں بعد بھیڑیا کسی جسی چھلانگیں لگاتا ہوا ان دونوں کے قریب پہنچ گیا انجلی کا خون سے رنگا بازو دیکھ کر بھیڑیے کی آنکھوں کی چمک مزید دوگنی ہوئی بھیڑیا واقعی سنٹوش

کے پاس سے یوں گزر گیا جیسے اس نے سنٹوش کو دیکھا ہی نہ ہو۔ بھیڑیا اب انجلی کے سامنے کھڑا تھا اور خوف نے باعث انجلی بری طرح کانپ رہی تھی۔

”سس۔۔۔۔۔ سس۔۔۔۔۔ سنٹوش۔۔۔۔۔ سس۔۔۔۔۔“

مجھے بچا لو نہیں تو یہ بھیڑیا۔۔۔۔۔ مجھے مار ڈالے گا۔“ انجلی بھٹاتے ہوئے چلا کر بولی سنٹوش تیزی سے آگے بڑھا اس سے پہلے کہ بھیڑیا اپنے نوکیلے دانت انجلی کی گردن میں گاڑتا سنٹوش نے وہ خنجر بھیڑیے کے سینے میں گاڑ دیا بھیڑیے کے منہ سے اک ٹلک شگاف نکل جس کی آواز اتنی تیز تھی کہ بے اختیار انجلی اور سنٹوش نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے بارش اب عہم چکی تھی رنیر جو کہ اب اپنی اصل حالت میں آ گیا تھا کچھ زدہ زمین پر بے ہوش پڑا ہوا تھا اس کے جسم پر کوئی بھی کپڑا نہیں تھا وہ بالکل برہنہ تھا سنٹوش نے اپنا کوٹ اتارا اور جھک کر رنیر کے اوپر ڈال دیا۔

”انجلی چلو اب یہاں سے۔ ہمارا کام۔۔۔۔۔“ سنٹوش نے حکوم کر انجلی سے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے کیونکہ انجلی کو سامہور کا نے پکڑا ہوا تھا رنگ کے ایک ہاتھ میں ایک خنجر تھا جس کی نوک انجلی کی گردن پر تھی۔

”کیسے ہو مور کھلا کے۔“ رنگا نفرت سے سنٹوش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کون ہو تم اور انجلی کو اس طرح کیوں پکڑ لیا ہے۔“ سنٹوش نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”میں وہی رنگا ہوں جس کو تمہارے کارن ذیل کی ہوا کھانی پڑی اسپیکر دیال کا تھپڑ سہنا یا اور پھر تمہارے کارن ہی اسپیکر دیال کو ٹکلیفوں کے پہا۔ سہنے پڑے تمہارے کارن ہی رنیر انسانی خون چہ والا بھیڑیا بنا اور تمہارے کارن ہی اس معصوم ناری کو تکلیف پہنچا پڑی ہے اور اگر تم چاہتے ہو کہ مزید کشت میں نہ پڑے تو میری بات مان لو ورنہ ناری کی ہتھیا کے کارن بھی تم ہی بنو گے میں۔۔۔۔۔“ کئے بغیر اسے جیون کی ڈور سے آزاد کر دوں گے۔“

رنگا لہجے میں بولا۔

”جیون کی ڈور اوپر والے کے ہاتھ میں ہے ارے ہاتھ میں نہیں اگر اوپر والے کو انجلی کی زندگی بڑھائی تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔“ سنٹوش پر عزم لہجے میں بولا۔

”تم تو واقعی ہمت والے ہو تمہاری پریکاشی کی میرے ہاتھ میں ہے پھر بھی تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔ خیر میرے پاس سے بہت کم ہے اگر تم اپنے گلے میں پہنا ہوا وہ لاکٹ اتار دیا تو میں کا جیون بخش دوں گا۔“ رنگا کہتے ہوئے اصل ہون کی طرف آیا۔

”دل۔۔۔۔۔ لاکٹ۔۔۔۔۔ کیسا لاکٹ۔۔۔۔۔ میرے لاکٹ کی لاکٹ نہیں ہے۔“ سنٹوش نے گھبراتے ہوئے

زیادہ ہنومت ورنہ میں تمہاری اس پہلی آخری پریکاشی کا خون بی پاؤں گا یہ رنیر تو نہیں بی رنگا کہتے ہوئے مسکرایا۔

”یہ تو پھر انسان ہے اصل میں بھیڑیے تو تم خون پی سکتے ہو۔“ سنٹوش نے غصے سے کہا۔

”اپنا یہ بھاشن بند کرو اور ترنت مجھے وہ لاکٹ دو میرے پاس سے بہت کم ہے۔“ رنگا نے خنجر کی نوک کا بازو بڑھاتے ہوئے کہا اور تکلیف کے باعث اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

”رور۔۔۔۔۔“ سنٹوش نے ہاتھ ہوا میں لے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں لاکٹ دیتا ہوں۔“ سنٹوش نے اپنے گلے سے وہ ہار اتار کر رنگا کی طرف پھینکا جسے انجلی نے پکڑ کر لیا۔ رنگا نے انجلی کو ڈرایا۔

”ٹھیکس سنٹوش۔ تم تو جلدی مان گئے ہیں تم نے تو سوا چھتا کانی پاؤں بیٹا پڑیں گے خیر آخر کار پریم کی بی بی ہوئی وہ کہتے ہیں نہ ہوگی پیار کی جیت کا مسکراتے ہوئے بولی۔

رنگا بھی مسکرا رہا تھا اور سنٹوش حیرانگی سے انجلی کا منہ تک رہا تھا۔

”تمہاری حیرانگی میں دور کے دیتی ہوں میں بھی رنگا کی ساتھی ہوں۔“ انجلی نے حیران کن بات کہی۔

”کیا۔۔۔۔۔؟“ سنٹوش چلایا۔

”ہاں سنٹوش بابو تمہارے گلے سے اس ہار کو اتار دینے کے لئے ہمیں پریم کا یہ مایہ جال بننا پڑا اور مجھے انجلی پر گرو ہے یہ کامیاب ہوئی۔“ رنگا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”ان۔۔۔۔۔ جلی۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ مجھے تم سے یہ امید تھی۔“ سنٹوش نے دھکی لہجے میں کہا۔

”پریم تو مجھے بھی تم سے ہو گیا تھا پر تو اس کام کے لئے مجھے جتنی دولت آفر ہوئی تھی وہ پریم کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔“ انجلی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب میں تمہارا کام تمام کر دوں گا۔“ رنگا غصے سے بولا۔

انجلی تم نے بہت اچھا کام کیا ہے اور اب میں تمہیں اس کا انعام دوں گا۔“ اتنا کہہ کر رنگا نے تیزی سے اپنا ہاتھ انجلی کی طرف کیا انجلی کے کپڑوں میں یکدم آگ بھڑک اٹھی وہ چیختے چلانے لگی اور رنگا قہقہے لگانے لگا۔

”یہ کیا کیا تم نے بد بخت۔۔۔۔۔“ سنٹوش دانت پیستے ہوئے بولا۔

”جیسا حال اب تم تمہارا ہونے والا ہے۔“ اتنا کہہ کر رنگا نے اپنا ہاتھ تیزی سے سنٹوش کی طرف کیا مگر سنٹوش اپنی جگہ پر ٹھیک ٹھاک کھڑا ہوا تو رنگا نے پھر اپنے ہاتھ کو جھک دیا مگر بے کار اب حیرانگی کی باری رنگا کی تھی۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا وار خالی جا رہے ہیں۔“ سنٹوش نے لفظ ”کیوں“ کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ آخر ہو کیا رہا ہے۔“ رنگا پریشان کن

لہجے میں کہا۔

”یہ اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ مہمانِ شائق شالی لاکٹ ابھی میرے پاس ہی ہے۔“ سنٹوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا.....؟“ اس مرتبہ چلانے کی باری رنگا کی تھی۔

”بدبخت انسان اگر وہ لاکٹ تمہارے پاس ہوتا تو اس کی شگفتگی سے تم جل کر راکھ ہو جاتے یہ تو علی لاکٹ تھا جسے میں نے اس سے پہنا تھا جب میں نے انجلی کو چھپت پر بھیجا تھا تو گاڑی میں جب انجلی نے مجھ سے اظہارِ پریم کیا تو میرا لاکٹ گرم ہو گیا کیونکہ جب بھی مجھ پر کوئی مشکل آتی ہو یا کوئی مجھ سے جھوٹ بول رہا ہو میرا یہ لاکٹ یکدم گرم ہو جاتا ہے انجلی کے اظہارِ پریم پر جب یہ لاکٹ گرم ہوا تو میں پریشان رہا لاکٹ جب تک گرم رہا جب تک انجلی میرے ساتھ رہی لیکن جب میں نے اسے چھپت پر بھیجا تو لاکٹ یکدم ٹھنڈا ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ انجلی میرے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی ہے میں نے اصل لاکٹ اتار کر جب میں ڈال لیا اور یہ لاکٹ گلے میں ہی رہنے دیا اور اب اسی مہمانِ لاکٹ سے میں تمہارا کام تمام کروں گا۔“ اتنا کہہ سنٹوش نے اللہ والا لاکٹ جیب سے نکالا اور رنگا کی طرف کیا رنگا کے کپڑوں میں بھی یکدم آگ بجڑک اٹھی اور وہ ایک منٹ سے پہلے جل کر خاک ہو گیا۔ سنٹوش نے لاکٹ کو جو ما اور گلے میں بٹھن لیا اس نے ایک طرف پڑی انجلی کی راکھ کو دیکھا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”برائی کا ساتھ دینا برائی ہے۔“

اب وہ بے ہوش پڑے رنیر کی طرف بڑھا۔

☆ ☆ ☆

کچھ مہینوں بعد

آج رات کافی سیاہ تھی آسمان چاند ستاروں سے خالی تھا ایسے میں وہ بس اس صاف اور کبھی ختم نہ ہونے والی سڑک پر جا رہی تھی بس کے تقریباً سبھی

مسافر سیٹوں سے ٹپک لگائے گہری نیند کے مڑ لوٹ رہے تھے سنٹوش بھی اسی بس کا مسافر تھا ڈرائیور کنڈیکٹر کے علاوہ صرف سنٹوش تھا جو اس بس میں جاگ رہا تھا سنٹوش کو بس کے سفر میں کبھی نیند نہیں آئی تھی آج کئی سالوں بعد وہ اپنے گاؤں لوٹ رہا تھا، اداس بھی تھا اور خوش بھی اس لئے کہ وہ اپنے ماں باپ سے ملنے والا تھا اور گاؤں ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا اور اداس اس لئے کہ وہ شہر میں اپنے دوستوں کو پہچان کر جا رہا تھا اس کے سبھی دوستوں کی آنکھوں آنسو نکل رہے تھے جب وہ اسے رخصت کر رہے تھے آنسو کیوں نہ نکلے آخر وہ اپنے دوستوں کے جان تک کی پروا نہیں کرتا تھا انپکڑ دیال بھی کالی افسردہ تھا۔

”سنٹوش بیٹا تم شہر میں ہی رہو یہاں کوئی انہی سی جاگ کرلو۔“ انپکڑ دیال نے سنٹوش کو شور دیا۔ ”نہیں اگل..... گاؤں میں بتا جی کی کالی زمینیں ہیں وہاں کھیتی باڑی کروں گا۔“ سنٹوش نے کہا ”تمہارے جانے کا سب سے زیادہ دکھ ہوگا۔“ انپکڑ دیال نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”دکھ تو مجھے بھی ہوگا اگل کیونکہ آپ جیسے اگل نصیب والوں کو ملتے ہیں۔“ سنٹوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا نصیب والا تو میں ہوں جسے تم ۲۲ دوست ملا جو بے جھجک میری خاطر آگ میں کود پڑا۔“ انپکڑ دیال نے کہا۔

”آپ بھی تو میرے ایک دفعہ کہنے پر ۲۲ پکڑنے چلے جاتے تھے ناں۔“ سنٹوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ میرا فرض تھا پر تو تم فرائض میں نہیں تھے۔“ انپکڑ دیال نے کہا۔

”اگل جب سے آپ سے دوستی ہوئی ۲ تو آپ کے کام بھی ہم پر فرض ہو جاتے ہیں اور یہ اگل انسان کو انسان کے کام آنا چاہئے کیونکہ اوپر والے

اکم بھی ہے وہ انسان کی تکلیف انسان کے ذریعے رکھتا ہے۔“ سنٹوش نے پوائنٹ کی بات کر کر انسان کے دچاں تمہارے جیسے ہو جائیں اسے برائی کا خاتمہ مکمل طور پر ہو جائے۔“ انپکڑ نے کہا۔

”اچھائی اور برائی کا ساتھ تو چلتا ہی رہے گا..... کیونکہ جس طرح دکھ اور کھ زندگی کا حصہ ہیں روح اچھائی اور برائی بھی دنیا میں رہے گی۔“ سنٹو

”باتیں تو تمہاری دل میں گھر بیٹھتی ہیں سے کیجئے ہوائی خوب صورت باتیں۔“ انپکڑ نے پوچھا۔

”عبداللہ اینڈ عبداللہ سے۔“ سنٹوش نے اتے ہوئے بتایا۔

”ایک تو گاؤں کے عبداللہ اگل سے اور دوسرا کے عبداللہ سے۔“ سنٹوش نے ہستے ہوئے بتایا۔

”مسلم سے۔“ انپکڑ دیال حیران ہوا۔

”جی ہاں وہ دونوں مسلمان ہیں اور ایسے بھی بات کوئی بھی محرم کہے نہ لگتی چاہئے یہ بات اپنا نہیں مانتا پر تو مسلم محرم مانتا ہے۔“ سنٹوش نے

”دوسرے محرم کی بات ہم کیسے مان سکتے ہیں سنٹوش۔“ انپکڑ دیال نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”اگل جی محرم تو شروع سے ایک ہی ہے اگلے کو ایک ماننا، محرموں کا بیڑا تو ہم لوگوں کا ہے اور ہم محرم کا بھی یہی کہتا ہے کہ اوپر والا ہے یہ بات ہر محرم مانتا ہے مگر صرف یہ بات کی کتابوں میں ہے ہمارے دلوں میں نہیں دنیا کا دلی، چنڈ، مولوی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے اوپر والا ایک ہے سب محرموں کی کتابوں میں ان ہیں ہم وہ تو مائیں کہ اللہ ایک ہے، بیگوان ہے، گاؤں ایک ہے، دیال اگل اوپر والا ہمارا کتنا

خیال رکھتا ہے کھانے پینے کے لئے دیتا ہے رہنے کے لئے گھر دیتا ہے کھانے کے لئے پھل دیتا ہے عورتوں کو ہمارے لئے بناتا ہے ستان کو پیدا کرتا ہے تاکہ وہ ستان بڑھائے میں ہماری سیوا کر سکے اور بدلہ میں ہم اس کا شکر ادا کرنے کی بجائے اسے کئی حصوں میں بانٹ دیتے ہیں کبھی اور کئی کئی چیزوں میں ڈھونڈتے ہیں بلکہ کبھی چاند ستاروں میں انسان خود سوچے رات کو بنانے والا دن کو بنانے والا چاند ستاروں، سورج کو بنانے والا انسانوں کو بنانے والا، چاند پرند، جانوروں کو بنانے والا بھلا کی کا محتاج کیسے ہو سکتا ہے ہم خود ہی پتھر کے بت بنا کر اسے پوجتے بیٹھ جاتے ہیں مسلم مسجد میں بناتے ہیں پر تو وہ ایک کے بجائے کئی اللہ کو نہیں مانتے مسجدوں کو صرف اپنی جگہ کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں وہ قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھتے ہیں وہ بھی صرف اس لئے کہ اوپر والے کا حکم ہے۔ پر تو ہم مندروں میں بے جان مجسموں کی پوجا کرنے بیٹھ جاتے ہیں انسان اچھا کام کرے تو اسے اعلیٰ کا درجہ دے دیتے ہیں، لیکن انسان کتنا بھی عظیم کام کیوں نہ کرے مگر وہ اوپر والا نہیں بن سکتا۔ انسان کے اس عظیم کام کے پیچھے اوپر والے کا ہی ہاتھ ہوتا ہے کیونکہ اس کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ملتا، جبکہ صرف اوپر والے کے ہی سامنے جاتا۔“ سنٹوش نے کہا۔

”ہوں.....“ انپکڑ دیال نے ایک گہری سانس کھینچی۔

”تمہاری باتیں تو غور طلب ہیں اب میں بھی اپنے پنڈتوں اور مولانا حضرات سے ضرور ملوں گا۔“ انپکڑ دیال نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ضرور اگل..... تاکہ ہمیں دنیا میں آنے کا مقصد پتہ چلے یہی نہیں کہ ہم بے معنی زندگی گزار کر چلے جائیں۔“ سنٹوش نے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا میں ضرور یہ کام کروں گا۔“ انپکڑ دیال نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، رنیر کو بچانے کے لئے تو اس نے اپنی جان داؤ پر لگا دی

تھی وہ بھی اس کا شکر گزار تھا ایک اور حیران کن راز سنتوش پر کھلتا تھا جس نے اسے اپنی عقل سے حل بھی کر لیا تھا وہ ایک سنہری شام تھی جب وہ اور ساسکشی چھت پر بیٹھے تھے۔

”سنتوش میں نے تم جیسا بے وقوف انسان نہیں دیکھا۔“ ساسکشی نے چائے کا کھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”کیوں کیا ہوا۔“ سنتوش مسکرایا۔

”اگر ریزیر کو بچاتے بچاتے تمہاری جان چلی جاتی تو ہم تمہارے پتائی کو کیا منہ دکھاتے۔“ ساسکشی نے منہ ہناتے ہوئے کہا۔

”وہی منہ جو تم سب کے پاس ہے۔“ سنتوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں“ ساسکشی نے بدستور منہ ہناتے ہوئے کہا۔

”تو میں کون سا مذاق کے موڈ میں ہوں۔ اور ویسے بھی صحیح تو کہہ رہا ہوں میں۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میلی بات تو یہ کہ انسان کو انسان کے کام آنا چاہئے دوسری بات وہ میرا دوست ہے اور دوست وہ جو مصیبت میں دوست کے کام آئے ساسکشی کسی کے کام آنا ادھار کی طرح ہوتا ہے کیونکہ آج تم نے مدد کی ہے تو کل وہ تمہارے کام بھی ضرور آئے گا۔“ سنتوش نے ساسکشی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں ایسی سمجھ داری کی باتیں سکھاتا کون ہے۔“ ساسکشی نے پوچھا۔

”عبداللہ ایڈ عبداللہ۔“ سنتوش نے بتایا۔

”عبداللہ ایڈ عبداللہ..... کیا مطلب.....“ ساسکشی حیران ہوئی۔

”ایک تو گاؤں میں ہیں عبداللہ اکل اور دوسرا عبداللہ شہر والا۔“ سنتوش نے بتایا۔

”سنتوش یہ دنیا بھی عجیب ہے ناں۔“ ساسکشی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... دنیا نے تمہیں کیا دیا۔“ سنتوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

”آئی ایم سیریس سنتوش۔“ ساسکشی اٹھ اٹھی۔

”دنیا عجیب نہیں دنیا والے عجیب ہیں سنتوش نے بتایا۔

”چلو جی مان لیتے ہیں۔“ ساسکشی نے.. ہناتے ہوئے کہا۔

”کچھ بتاؤ بھی آخر تمہیں دنیا سے کیا ہے۔“ سنتوش نے پوچھا۔

”یہاں دھرموں کا بازار لگا دیا۔“ ساسکشی نے کھوئے کھوئے لہجے میں بتایا۔

”کیوں..... کیا ہوا۔“ سنتوش چونکا۔

”سب کا دھرم ایک ہی ہوتا تو کتنا مزہ آتا۔ ذات نہ برادری پر تو۔“ ساسکشی نے حسرت زدہ لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

”یہ دھرم ریت روان ہمارے اپنے بنا ہوئے ہیں ساسکشی..... اوپر والے کا تو صرف ایک دھرم ہے اور وہ ہے اوپر والے کو ایک ماننا اس ساتھ کسی دوسرے کو نہ مانو اور انسانوں کے بارے میں اوپر والے کا کہنا ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔“ سنتوش نے بتایا۔

”یہ کیسی عجیب بات کہہ رہے ہو تم، اچھا غلام، کالا گورا کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔“ ساسکشی اپنی ”مالک، اچھوت، غلام، کالا، گورا“ برابر ہوتے ہیں ساسکشی۔ مالک کو دینے والا بھی، والا ہے اور غلام، اچھوت، گورے، کالے کو دینے والا بھی اوپر والا ہی ہے غلام بھی محنت کی کھاتا اور مالک بھی محنت کی کھاتا ہے بس یہ اوپر والا نظام ہے کہ وہ انسان کی ضروریات انسان ذریعے ہی پوری کرتا ہے تو اس میں چھوٹا بڑا کہاں سے آگیا مالک بھی اوپر والے کا دیا کھاتا اور غلام بھی سچا اور حقیقی مالک (اللہ) اگر ہا

”کو مالک اور مالک کو غلام بنادے ماضی میں ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں اب تم انسانوں میں کیا فرق ہے ہاں فرق جب ہوگا وہ اوپر والے کی عبادت دل کھول کر کرے جب اوپر والے اور دنیا کی فطرتوں میں بڑھے گا تو انسان ساسکشی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”پاؤ تمہاری دل کو لگتی ہے۔“ ساسکشی متاثر ہوئے ہوئے۔

”ساسکشی یہ ہم انسانوں کی فطرت ہے کہ ہم دوسرے میں فرق کرتے ہیں ورنہ اوپر والے کی سب برابر ہیں۔“ سنتوش نے ساسکشی کو بتایا۔

”کیا مسلم دھرم بھی اچھا ہے۔“ ساسکشی نے ”بالکل..... کیونکہ اس دھرم کے نبی کی بات میں وہ بالکل سچی ہیں انہوں نے ہی والے کا یہ پیغام دنیا تک پہنچایا ہے کہ سب برابر ہیں عورت کا مقام بتایا غلاموں کے حقوق انہوں نے جو بات کہی سچی اور کھری کہی وہ دنیا بھر آج سے چودہ سو سال پہلے آئے ان کی کہی میں آج سچ ہو رہی ہیں اور ان کے عاشق دیکھو ان کی باتوں پر عمل کر رہے ہیں اور ان کی پر عمل کرنے سے انہیں بے انتہا فائدے پہنچے ہیں۔“ سنتوش نے بتایا۔

”نبی..... یہ نبی کیا ہوتا ہے.....“ ساسکشی نے ”جب زمین والے اپنے اصل مقصد اور غلط راہوں پر چل پڑے تو اوپر والا انہیں راہ دکھانے کے لئے انہی میں سے ایک نبی پیدا کرتا جو انہیں ان کے اصل مقصد سے آگاہ کرتے ہیں پھر اوپر والے نے مسلمانوں کے نبی پر یہ سلسلہ قائم کیا ہے کہ اب ان کا فرمان ہی سب کی سیدھی راہ ہے چاہے کوئی انسان کسی بھی دھرم کا

ہو اگر وہ یہ دین دھرم اپنائے گا تو وہ ہر جائز خواہش پوری کر سکتا ہے۔“ سنتوش نے بتایا۔

”مسلمانوں کے نبی نے کیا کہا ہے۔“ ساسکشی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”ان کے فرمان سے تو کتابیں بھر پڑیں ہیں۔“ سنتوش نے بتایا۔

”تو ٹھیک ہے میں وہ کتابیں ضرور پڑھوں گی۔“ ساسکشی نے کہا۔

”ضرور پڑھنا کیونکہ ہو سکتے ہیں تمہاری زندگی سنور جائے۔“ سنتوش نے کہا تو ساسکشی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

پھر سنتوش نے اسے عبداللہ سے احادیث اور سیرت النبی کی کتابیں لا کر دیں جس کا مطالعہ ساسکشی نے بڑے غور سے کیا اور پھر اس موضوع پر اس کی سنتوش سے بات شروع ہوئی۔

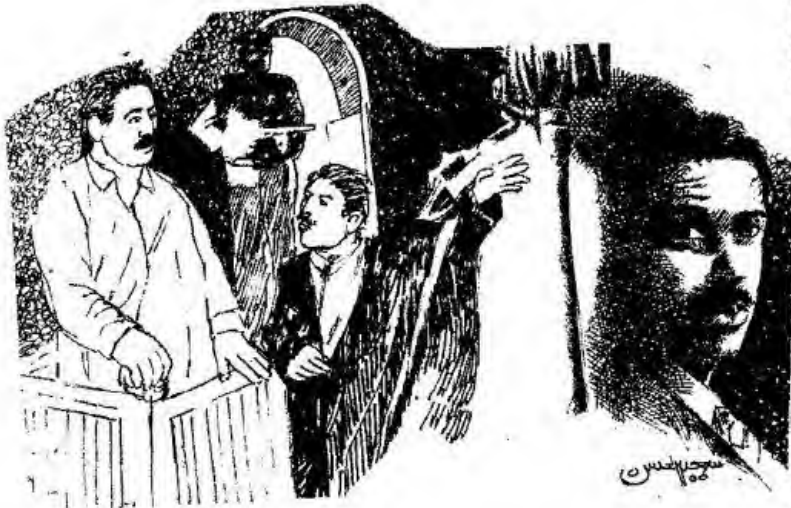
”تم نے واقعی ٹھیک کہا تھا سنتوش اسلام جیسی سچائی میں نے کسی بھی دھرم میں نہیں دیکھا۔“ ساسکشی نے کہا۔

”یہ تو واقعی حقیقت ہے۔“ سنتوش نے جواباً اثبات میں سر ہلادیا۔

”مسلمانوں کے نبی کا جنم آج سے چودہ سو سال پہلے ہوا انہوں نے جو باتیں اس دور میں کہی تھیں وہ آج ہر طرف موجود ہے۔ مسلمانوں کے نبی تو واقعی کمال کے ہیں۔“ ساسکشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”زندگی سے لے کر مرنے تک کے آسان طریقے بتائے ہیں جن پر چل کر انسان دنیا میں بھی کامیاب ہوتا ہے اور مرنے کے بعد سوگ (جنت) میں بھی جاتا ہے اسلام جیسا تو واقعی کوئی دھرم نہیں۔“

”بالکل..... تو ہے اسلام جیسا کوئی دھرم نہیں اور اس دھرم میں کسی طرح کی سختی نہیں ہے اسلام دھرم میں صرف فائدہ ہی فائدہ ہیں مسلمانوں کے نبی



اندھیرے کا مسافر

طارق محمود - کامرہ انک

مزدور گھر کی بنیاد اکھاڑ رہے تھے کہ اچانک ایک مزدور کی فلک شگاف چیخ سنائی دی تو قرب و جوار کے لوگ دھل کر رہ گئے، گڑھے میں انسانی ہڈیاں تھیں اور اس میں تعویذ مضبوطی سے بندھے پڑے تھے کہ پھر.....

کبھی کبھی نا عقل لوگ اپنی نا عقلی دوسروں پر قہر دیتے ہیں، کہانی پڑھ کر دیکھیں

تھیں لوگ ان کے نیچے پھنس گئے تھے گرد و غبار اتنا پھیلا کہ کسی کو پہچانا مشکل تھا۔
میں اپنے تفتیشی انسپر پر گرا تھا میرے اوپر بھی کچھ بوجھ سا تھا میں نے زور لگا کر اس کو اپنے اوپر سے ہٹایا چاروں طرف شور مچا تھا میں اٹھ کر کھاتا ہوا اس گرد و غبار سے ایک طرف لٹکا چلا گیا میرے دائیں بازو میں لگی جھکڑی کی ریجر زمین پر گھسٹنے لگی تب مجھ

دھماکہ اتنا شدید تھا کہ کچھری کی اننگ لڑاچی کھڑکیوں کے شیشے چھن چھن چھن کی آوازوں سے پھٹا چور ہو کر گر گئے سب لوگ زمین پر گر گئے ان کے منہ سے تو یہ توبہ کے الفاظ نکلنے لگے ایک سیاہی کی گردن اڑتی دوسری کی پیٹھ میں کتنے ہی لوگوں کی کرجیاں گھس گئیں وہ بھی آدھ دفن یاد کرنے لگا اُرف قیامت سی برپا چکی کچھری کی کچھ دیواریں گر گئی

”وہ کیا.....“ سنتوش نے پوچھا۔
”میں عبداللہ سے پریم کر گئی ہوں
ساکشی نے عجیب بات کہی سنتوش ساکشی کی اس بات پر مسکرایا۔
”مجھے پہلے ہی پتہ تھا کیونکہ میں نے اکثر نوٹ کیا تھا کہ تم جب بھی عبداللہ کی طرف دیکھتی تو تمہارا آنکھوں میں حسرت ہوتی تھی۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”بالکل..... پرنتو مجھے یہ چتا کھائے جا رہی تھی کہ ہمارا ملن کسے ہوگا پرنتو اب مجھے اس کی کوئی پتا نہیں۔“ ساکشی کسی خیال کے تحت بولی۔
”کیا مطلب.....“ سنتوش حیران ہوا۔
”پہلے میں نے سوچا تھا کہ اگر میرا اور عبداللہ ملن نہ ہوا تو میں آتما تھیا کر لوں گی یا مسلمان ہو جاؤں گی پرنتو اب بھی میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں پرنتو کارہ کوئی اور ہے۔“ ساکشی اتنا کہہ کر رہی۔
”کیا کارن ہے۔“ سنتوش نے دلچسپی سے پوچھا۔
”اب میں مسلمانوں کے نبی کے کارہ مسلمان ہونا چاہتی ہوں کیونکہ انسان جب ہی کا ماسا ہو سکتا ہے جب وہ اوپر والے سے پریم کرے اور ان کے نبی سے۔“ ساکشی نے بے حد خوب صورت بیان کیا۔
”واہ بھی واہ تم تو پوری تیاری کر رہی ہو۔“ سنتوش مسکرایا۔
”ہاں بالکل..... کیونکہ جیون کا کوئی دشمن نہیں کب سانس اکٹھا جائے اس لئے اوپر والے اصل اور حقیقی راستہ جن لینا چاہئے کیونکہ یہ تو فرضی ہے اصل جیون تو مرتے کے بعد شروع ہوتا ہے۔“ ساکشی ٹھوٹے ٹھوٹے لہجے میں بولی۔
”پرنتو مجھے مانتا پتا اور سریش کی چتا ہے۔“ مانیں گے۔“

(جاری)

نے خود ختمیاں برداشت کیں پرنتو اپنی ممتا (عوام، قوم) کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔“ سنتوش نے بتایا۔
”اس دھرم میں داخل ہونے سے انسان زندگی اور موت کی مشکلوں سے بچ جاتا ہے۔“ ساکشی نے بتایا۔
”یہ بھی حقیقت ہے۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
”آج میں تم سے ایک بات شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ پرنتو تم وعدہ کرو کہ وہ راز ہم دونوں کے بچ ہی رہے گا۔“ ساکشی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
”پہلے بات بتاؤ پھر وعدہ کروں گا۔“ سنتوش بھی سنجیدہ لہجے میں بولا۔
”نہیں نہیں پہلے وعدہ پھر بات.....“ ساکشی نے نفی میں سر ہلایا۔
”اوکے بابا وعدہ۔“ سنتوش نے آخر کار ہار مانتے ہوئے کہا۔
”مم..... میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔“ ساکشی نے بے دھڑک کہہ دیا۔
”کیا.....؟“ سنتوش حیران ہوا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔
”ہاں..... کیونکہ مسلمانوں کے نبی میں جو سچائی میں نے پائی ہے وہ کسی اور انسان میں نہیں اپنے لئے کچھ نہیں صرف اپنی ممتا کے لئے سوچا اسلام میں داخل ہونے کی کوئی زبردستی نہیں، کسی کے دھرم کو برا نہیں کہنا اوپر والا ایک ہے کیونکہ یہ بات دنیا کے ہر دھرم کی کتاب میں موجود ہے اوپر والے کی نظر میں سب برابر ہیں۔ بڑوں سے تیز سے بات کرو چھوٹوں سے پیار کرو ایک دوسرے کے کام آؤ اپنا دشو اس صرف اور صرف اوپر والے پر دھوکہ کبھی کسی کو حقیر نہ جانو غریب مسکین کا خیال رکھو اسے کھانا کھلاؤ اپنے ارد گرد کے لوگوں کا خیال رکھو وہ تو غیر دھرم کے لوگوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔“
”میں ایک اور بات تم سے کرنا چاہتی ہوں۔“

”ایک حقیقت“

اگر انسان یہ سمجھ لے کہ ”انسان کی موت اس وقت نہیں ہوتی جب وہ طبی طور پر منوں مٹی تلے دبا دیا جائے۔ حقیقت میں انسان کی موت اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی کی دعاؤں سے نکل جاتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی انسان زندہ رہتا ہے کسی یادوں میں، دعاؤں میں اور ایصالِ ثواب میں۔“

تو کبھی پھر کوئی ایسا کام نہ کرے جس کی وجہ سے وہ کسی کی دعاؤں سے نکل جائے۔ اس لئے آسانیاں بانٹنے چلو تاکہ لوگ مرنے کے بعد بھی آپ کو اچھے نظروں میں اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور آپ مرنے کے بعد بھی زندہ رہو کسی یاد، اچھے الفاظ اور دعا میں۔

(ایڈووکیٹ شہناز خان - کراچی)

”عادل بھائی کیا حال ہے؟“ دعا سلام اور حال احوال کے بعد وہ اصلی بات پر آیا میرے گھر کی دیوار ایسی تھی جس کی وجہ سے اس کے گھر اور اس طرف بننے والے گھروں کے لئے راستہ کچھ تنگ سا ہو رہا تھا میں نے اس سے کہا۔

”دیوار وہ اپنے خرچہ پر گرا دیں کچرہ وغیرہ میں خود اٹھو اگر تمہوڑا سا اندر کر کے دیوار بنائوں گا۔“ میری بات سن کر وہ بہت ہی خوش ہوا۔ ”عادل بھائی جیسا تھا اس سے بڑھ کر آپ کو پایا۔“ میں اس کی بات پر مسکرا کر رہ گیا۔

”راستہ تو صدقہ جاریہ ہے مجھے لوگوں کا راستہ تنگ کر کے دعاؤں اور گائیوں کے علاوہ ملتا کیا۔“ اس نے دو مزدور لگا دیئے جو احتیاط سے دیوار گرانے لگے اور پھر ان مزدوروں نے ایک ہی دن میں وہ دیوار گرا کے ایشیں صاف کر کے میرے صحن میں ڈھیر لگا دیا۔

میں بیٹھ کر گھر کی طرف تیزی سے چل دیا، ساتھ ہی خیال کے تحت ریسلو ایبیلنس کو فون کر دیا میرے گھر پہنچنے ہی ایبیلنس پہنچ چکی تھی وہ میری بیوی کو اسٹرینچ پر ڈال کر ایبیلنس میں سوار کر رہے تھے کہ میں پہنچ گیا اور ہم اسے اسپتال لے گئے۔

میڈیکل ٹریٹمنٹ سے اس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی اس کا مکمل میڈیکل ٹیسٹ کر دیا گیا پھر کچھ دھاری نہ تھی رپورٹس بھی ٹھیک تھیں معدہ میں کچھ ہلکی سی براہم تھی لیکن وہ دن بدن کمزور سے کمزور ہوتی جا رہی تھی گھر میں ہم دوی تو تھے بچے تو بہت چھوٹے تھے بوی کی دیکھ بھال مجھے خود ہی کرنی پڑی تھی ادھر کام کا راج ہو رہا تھا لیکن کیا کرتا گھر کو سنبھالنا بھی تو ضروری تھا بیوی کا علاج چل رہا تھا لیکن وہ سوکھ سوکھ کر بہت ہی کمزور ہو گئی تھی۔

آخر مجھے اس کی آنکھوں میں موت کی چھائیاں نظر آنے لگیں اور پھر ایک دن ہم لوگوں کو سسکتا بلکا چھوڑ کر چلی گئی۔

ہمارے بچتے بستے گھر کسی کی نظر لگ گئی میں نے قسمت کے اس لکھے پر مبر کر لیا، اب میں خود ہی بچوں کو تیار کرتا انہیں ناشتہ کھاتا خود کھلاتا انہیں اسکول چھوڑتا اور پھر اپنے کام پر توجہ دیتا اپنی بیوی کی اگلی میرے دل سے نکل نہ سکی لیکن زندگی تو ہے غم و خوشی بچے پہلے پہل بہت تنگ کرتے لیکن شاید ان کو زندگی کی انہیں کی سمجھ آگئی تھی۔

زندگی کی گاڑی پھر سے چل پڑی اداس زندگی لیکن اب یہ گاڑی تین پہیوں پر چلی نہیں آتی تھی مجھے جی شادی کے مشورہ دیتیں اور اپنے گھروں کو واپس آ جاؤں مشکل وقت میں دنیا میں والدین کے علاوہ کسی کام نہیں آتا ان پر گلو بھی کیا کرتا رہتا ہوں اپنی بیویاں ہیں۔ اس دن میں گھر پر ہی تھا بچوں کی بھی کئی جی میرا دل چاہ رہا تھا کہ بچوں کو کہیں سمھانے لے دوں دروازے پر دستک ہوئی میں باہر نکلا تو سامنے ایک جانتے والا پر اپنی ڈیلر تھا۔

کر سکتا ہے۔“

”لیکن آپ کے لئے میرا بھانگنا بہت مسئلہ بن سکتا ہے۔“ میرے منہ سے بمشکل نکلا۔

”نہیں..... عادل تم تو اس دھماکے میں جیوتھڑوں میں تبدیل ہو چکے ہو تم جاؤ کسی نئی پیمان سے نئی راہیں ڈھونڈو۔“ اور میں اس کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں سے نکل آیا، اب میرے ذہن میں دو ٹارگٹ تھے۔ میرے لئے دونوں ہی اہم تھے، دونوں ہی میری نظر میں انسانیت کے قاتل تھے۔

☆.....☆.....☆

میں ان دنوں پراپرٹی کا کام کرتا تھا زندگی بہت ہی اچھی گزر رہی تھی میری ڈیلنگ دونوں پارٹیوں سے ہی اچھی ہوتی پچھتا اور خریدنا کچھ لوگوں کی مجبوری ہوتی تو کچھ لوگ خریدار بننے سے پلان لے کر زمین خریدتے ہمارے علاقے میں دو یونیورسٹیاں کچھ قاصد پر بن رہی تھیں اس لئے ان کے آس پاس کی زمین جو کہ زیادہ تر رہتی تھی لیکن ان یونیورسٹیوں اور پھر تین روڈ بننے کی وجہ سے سونے کے بھاؤ بک رہی تھی میرے جیسے چھوٹے پراپرٹی ایجنٹ بھی اب تو کافی خوشحال ہو گئے تھے اب میرا اپنا گھر تھا چھوٹی سی گاڑی تھی دو بچے تھے ایک بیٹا ایک بیٹی دونوں ہی اچھے اسکول میں پڑھ رہے تھے میری بیوی اسی اسکول میں جاب کرتی تھی خوشحالی آتے ہی میں نے اس کی جیب چھڑوا دی، زندگی میں جبر نے اس کی طرح رواں دواں نہ کی کہ چانک ایک شیطان نے اس میں جبر نے میں غلابا پھینک دیا۔

ہوا یوں کہ میں ایک پراپرٹی کے سودے میں مصروف تھا کہ بیوی کے موبائل سے خالی آنے لگی میں نے ان لوگوں سے معذرت کی اور سائڈ پر ہو کر جلدی سے فون اٹینڈ کیا، دوسری طرف ہماری پڑوٹن تھی۔

”عادل بھائی پچھنیں بھائی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہیں وہ خون کی الٹیاں کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی ہے۔“ میں نے فون بند کیا اور گاڑی

پر انکشاف ہوا کہ تفتیشی افسر یا تو مر گیا یا پھر بے ہوش پڑا ہے۔ ایبیلنس اور حکومت کی مددگار گاڑیاں ہوڑ سہائی ہوئی وہاں آ پچھنیں۔ میں گردوغبار جھٹنے سے پہلے وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا کہ میری نظر ایک پٹی پر پڑی جو کہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پھنسی ہوئی تھی، میرے ضمیر نے مجھے وہاں سے بھاگنے نہ دیا میں اس پٹی کو نکال کر ایبیلنس تک اٹھا لیا وہاں کتنی ہی عورتیں بوڑھے اور ادھر ادھر کرے پڑے تھے جنہیں میں اٹھا کر ایبیلنس میں ڈالنے لگا میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں چار آدمیوں کا قاتل تھا، بے شک وہ قتل میں نے طش میں آ کر کئے تھے لیکن تھے تو قتل ہی، میں قاتل تھا مگر مجھے اس درد بھرے منظر نے رلا دیا میرے لئے یہ بہت ہی اچھا موقع تھا بھاگنے کا لیکن بے گناہ لوگوں کی تکلیف نے میرے پاؤں میں ان دیکھی زنجیر باندھ دی سکتے ظالم اور پتھر دل ہیں وہ لوگ جو ایسے دھماکہ کرتے اور کرواتے ہیں۔

جو لوگ ایسی موت بانٹتے ہیں جانے انہیں کسی موت آنے کی۔ زنجیوں کو ریسلو کار کنول کے ساتھ اٹھاتے ہوئے میری جھکڑی کی زنجیر زمین پر پھٹتی رہی لیکن مجھے احساس نہ رہا کہ میں ایک قیدی ہوں ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں کوئی پولیس کوئی قیدی کوئی دیکل نہیں ہم سب درد کی زنجیر سے بندھے تھے اور زنجیوں کو اٹھا کر گاڑیوں میں ڈال رہے تھے یہاں تک کہ کتنی کے چند زخمی رہ گئے باقی بے گناہ لوگوں کی ڈیلر ہوتی تھی میں ایک ڈیڑھی کو گاڑی میں لٹا کر پلانا تو ایک جھٹکے سے رک گیا میرے سامنے میرا تفتیشی افسر کھڑا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا، اس کو دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ میں ایک قیدی ہوں لیکن اس نے ایسا کام کیا کہ میں ششدر رہ گیا اس نے آگے بڑھ کر میری جھکڑی کھول دی۔

”مجھے حیرت ہو رہی ہے تم پر اپنے دل میں انسانیت کا اس قدر درد رکھنے والا کسی کوں کیسے

اب ہلکی ہلکی بنیاد اکھاڑ رہے تھے کہ اچانک ایک مزدور چیخ کر چیخے ہٹا میں بھاگ کر ان کے پاس جا پہنچا کہ ان لوگوں کو کیا ہوا۔

میں نے دیکھا کہ کچھ انسانی ہڈیاں تھیں جن کے گرد کالا دھماکہ لپٹا ہوا تھا جس میں تعویذ پروئے ہوئے تھے۔

”صاحب اسے ہاتھ نہ لگانا یہ تو آپ پر کسی نے سفلی عمل کروا رکھا ہے۔“ میں نے ان ہڈیوں کو اٹھانے کے لئے جھک کر ہاتھ برہایا تھا کہ ایک مزدور چلا آیا تو میں نے ڈر کر ہاتھ پیچھے ہٹ لیا۔

”وہ کیا ہوتا ہے سفلی عمل اور کس لئے ہوتا ہے۔“ میں میٹرک پاس اپنے کام میں زندگی بنانے والا عام سا آدمی تھا۔

مجھے کالے ظلم کے بارے میں کیا پتہ تھا بس کبھی کبھار تعویذ گنڈوں کے بارے میں گھر میں آنے والی عموؤں سے سنتا رہتا تھا لیکن کبھی دھیان نہ دیا۔ اس مزدور کو جتنا پتا تھا اس نے مجھے بتایا اس کی باتیں سن کر میرا دل کانپ اٹھا لوگ دوسروں کو ہرانے ان کو نیچا دکھانے کے لئے کیا کیا شیطان کے چکروں میں پڑے ہوتے ہیں۔

”اب مجھے کیا کرنا چاہئے اس سے حفاظت کے لئے۔“

میرے پوچھنے پر وہ مزدور مجھ ایک پیر صاحب کو لے آیا جنہوں نے وہ ہڈیاں وہاں سے اٹھالیں اور میرے گھر پر چاروں طرف قرآنی آیات پڑھ کر دم کیا اور پانی پر دم کر کے ہم کو پینے کے لئے دیا۔

”عادل صاحب آپ کے کسی کاروباری حریف نے آپ کے گھر پر بہت سخت سفلی عمل کروایا ہے۔ اس کے توڑ کے لئے مجھے تین دن آپ کے گھر میں ایک عمل کرنا ہوگا۔“ میں اب انہیں کیا جواب دے سکتا تھا اس بارے میں تو میں بالکل نا بلد تھا میں نے ان سے ان کاروباری حریف کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ناں میں سر ہلایا جس سے میں یہ سمجھا کہ یا تو انہیں اس کے بارے میں پتہ

نہیں یا تو وہ بتانا نہیں چاہتے کیونکہ اس کاروبار میں تو اب بہت لوگ ہیں میں خود سے اسے نہیں ڈھونڈ سکتا۔ بھلا ہوان پیر صاحب کا جو کہ تین دن تک میرے گھر وکیلہ کرتے رہے درجھے مطمئن کر کے یہاں سے گئے دیوار پھر سے تیسر ہوئی راستہ کھلا ہو گیا۔

ایک دن میری گاڑی باہر ہی کھڑی تھی بچوں کو تیار کر کے ہم نکلے تاکہ انہیں اسکول چھوڑ سکیں ہم باہر نکلے تو میں نے ایک آدمی زمان نامی کو کار سے غلے میں درہٹتے دیکھا میرا ذہن پہلے سے اب سیٹ تھا اس کو یوں وہاں سے تیزی سے دور جاتے دیکھ کر ہاتھ ٹٹکا میں کار کو خوب غور سے نیچے اوپر اندر سے جانچنے والی نظر سے دیکھا پلٹا ہر تو مجھے کوئی خرابی نہ لگی لیکن اندر سے میں ڈر ہوا تھا اسی لئے میں نے بہت ہی آہستہ آہستہ گاڑی چلائی بچوں کو چھوڑ کر مجھے سکون ملا، میں گاڑی واپس موڑ کر تھوڑی سی اسپید بڑھائی ہی تھی کہ اچانک گاڑی ڈگمگاتے لگی اور پھر درمیانی فٹ ہاتھ سے لگ کر گاڑی خود ہی رگ رگ ورن ہینڈل بالکل خراب ہو گیا تھا اللہ کا خاص کرم ہوا، میں بیچ گیا تھا لیکن گاڑی کا مانی راڈ ٹوٹ گیا تھا اور مجھے پتہ تھا یہ کس کی حرکت تھی۔

میرے دماغ میں پیر صاحب کی یہ بات چکرانے لگی کہ کوئی کاروباری حریف مجھے نقصان پہنچانے کے ذریعہ زمان بھی میرا ایک کاروباری حریف تھا میں اب ساری بات سمجھ گیا لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا میری قسمت میں جو لکھا تھا وہ مجھے مل کر رہے گا میں نے ٹھنڈے دل سے زمان سے بات کرنے کا سوچا میں نے گاڑی ایک قریبی گیران میں کھڑی کر دی اور سیدھا زمان کے گھر پہنچا میں نے اس سے سکون سے بات کی لیکن وہ اور اس کے تین بھائی مجھ سے لڑنے لگے مجھے بھی غصہ آ گیا، مجھ سے جتنا ہوسکتا تھا میں نے بھی ان کو مارا لیکن وہ چار تھے اور میں اکیلا مار کھاتے ہوئے جانے کیسے زمان کے ہاتھ سے میں نے پتھول چھین لیا، صرف چار گولیوں نے ان چاروں کا خاتمہ کر دیا۔

میں وہاں سے بھاگ نہ سکا اور بھاگ کر جاتا ہاں، میرے بچے میرے بغیر کیسے رہ پاتے کسی اس کو فون کر دیا اور میں گرفتار ہو گیا۔

میرا وکیل مجھے پکا یقین دلارہا تھا کہ مجھے موت نہیں ہو سکتی ہاں کچھ سال کی سزا ہوگی۔ اس دن عدالت میں پیشی تھی کہ دھماکہ ہو گیا۔ مجھے عرفان استاد ملا جس نے میری کہانی سنی

نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔

”عادل صاحب تمہاری ہنسی بہتی خوشحال کے ساتھ تو بڑی ٹریڈی ہوئی ہے۔“ جیسے تم ہو کہ تمہاری بیوی تندرست تھی لیکن اچانک بیمار رہ گئی۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ سفلی عمل سخت ہوتا ہے۔“

”عرفان استاد زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے آہستہ سے کہا تو وہ بولے۔“

دیکھو میں مولوی نہیں کہ تمہیں بھرپور طریقے سکھوں، بس اتنا سمجھ لو کہ یہ سب شیطانی ہے ہیں، شیطان نے قیامت کی صبح تک اپنے دل کے لئے اللہ سے سہلت لے رکھی ہے۔ اللہ فرمایا کہ ”جو میرے بندے ہیں وہ تیرے لئے ہیں کسی صورت بھی نہ آئیں گے اگر کچھ بھگت تو تو بے مانگیں گے تو میں انہیں بخش دوں گا۔“

یہ سب باتیں میرے دماغ میں فٹ ہو گئیں اب مجھے پتہ چلا کہ آج کل ایک عامل ناگر بابا میں اپنے کالے عمل سے شیطان کو خوش کر رہا ہے میرا پہلا ٹارگٹ وہی تھا میرے بچے میرے گھر میں تھے جن کی اولاد نہ تھی مجھے پتہ تھا کہ میرے بچوں کو بہت پیار سے رکھیں گے مٹی دی میں میرے مرنے کی خبر نشر ہو چکی تھی اب میں ان کی زندگی میں دوبارہ جا کر ارتعاش پیدا نہیں کرتا تھا۔

میں ناگر بابا کے پاس ایک ضرورت مند بن کر اپنی دروسے بھی کہانی سنا کر اس کا چیلہ بن گیا

میں کچھ دن اس کے پاس رہ کر دیکھتا چاہتا تھا کہ واقعی وہ کالے عمل کرتا ہے۔

کیسے کیسے لوگ اس کے پاس آ رہے تھے کوئی ساس اپنی بیوی کے ہاتھوں تنگ تھی اور اس پر سفلی عمل کروانا چاہتا تھی تو کوئی بیوی ساس کے ہاتھوں دنیا کمانے کے پکرنے لوگوں کی مت ماروی تھی ہر کوئی اپنے کاروباری حریف، رقیب اپنے محبوبہ کے ہونے والے خاوند کو کیسے کیسے لوگ وہاں شیطان کے بہکانے سے آ رہے تھے مجھ سے اور دیکھنا نہ گیا رات کو میں نے باقی جیلوں کو کھانے میں بے ہوشی کی دواملا کر بے ہوش کر دیا اور پھر ناگر بابا کو ایسی سزا دی کہ میں خود اس کا حال دیکھ کر لرز اٹھا، میں نے پانی میں خالص تیزاب ملا کر اس کے منہ میں جبراً ڈالا وہ پینا نہ چاہتا تھا۔

میں نے اس کی دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کاٹ دی اس نے پھر بھی ضد کی تو میں نے ایک اور انگلی کاٹ دی جب وہ درد سے چلانے کی کوشش کرتا تو میں اس کے منہ پر ہتھ کر رہا تھا رکھ دیتا آخر تین انگلیاں کٹوانے کے بعد اس نے موت کا پیالہ پی لیا تیزاب اندر جاتے ہی اس کے منہ ناک اور نیچے سے دھواں نکلنے لگا میں نے اسے مضبوطی سے باندھ رکھا تھا وہ تڑپنا چاہتا تھا لیکن تڑپ نہیں سکتا تھا اس کو اپنے موت آنی کہ اس کے اندر سے سب کچھ بہ نکلا اس کے بعد میں وہاں سے غائب ہو گیا۔

اب ناگر بابا جیسے لوگوں کے لئے میں ایک بہرہ دیا قاتل، دہشت کی علامت ہوں اس کے بعد دو اور کالے کر تو توں والے میں نے ایسے ہی قتل کئے، تو ایسے عمل کرنے والے چھپنے لگے، میں ساتھ ساتھ اپنے دوسرے ٹارگٹ کلر دھماکہ اور دہشت گردی کی واردات کرانے والوں کی تلاش میں ہوں، میرا پختہ عزم ہے کہ انسانیت دشمنوں سے میں اپنے ملک کو اپنی طاقت رکھنے تک لڑتا رہوں گا انہیں صفحہ ہستی سے مٹاتا رہوں گا اب میرا نام مجاہد ہے اور میں اندھیرے کا مسافر ہوں۔



سفاک کون

مہر پرویز احمد و لوسریاں چنوں



نادیدہ قوت کی دل شکستہ آواز سنائی دی۔ محترم بزرگ عام لوگ ہم پر الزام تراشی کرتے ہیں بلکہ جھوٹی باتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں اور حقیقت سے سب آشنا ہیں۔

حقیقت کے پالنائیں جھوٹی ہوئی اپنی نوعیت کی لرزادینے والی دل گرفتہ کہانی

بار بھر تک، دھڑنگ ڈراؤنی شکل والی چڑیلیں دائرے کی شکل میں گھنٹوں کے بل بیٹھ کر باباجی کے حضور گرہ زاری کرنے لگیں اور آئندہ کسی بھی انسانی آبادی میں آنے سے توبہ کرنے لگیں پہلی غلطی پر بار بار معافی مانگنے لگیں۔

باباجی نے رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی غلطی کی اس شرط پر معافی دی کہ وہ آئندہ کسی آبادی کے نزدیک رہائش نہیں رکھیں گی۔ باباجی نے جب ان سے میرے پاس آنے کی وجہ پوچھی تو بولیں۔

”عجیب نامی شخص نے ایک غیر مسلم سا لگا مسیح کو دس ہزار روپے دیے کہ حیدرہ کے گھر میں بیعتی گائے کو جان سے مارنا ہے، یہ گائے بیعتی اور ان کو بہت عزیز ہے، گائے کے مرنے پر ان کو دو لاکھ کا نقصان ہوگا، وہ ہمارا بہت نقصان کر چکے ہیں، ہم براہ راست ان سے نہیں لڑ سکتے لہذا آپ اس گائے کو قویہ گنڈے یا کسی ہوائی مخلوق کے ذریعے مروادیں۔“

سا لگا مسیح نے پلید جسم کے ساتھ پلید عمل کر کے ہم چڑیلوں کو قید کر رکھا ہے اس نے ہمیں بلایا ہم نے گائے کے پیٹ میں بلید، کیل وغیرہ ڈال کر اسے شدید

کھینچے گا، چڑیلوں کے ساتھ اس کو بھی جس نہیں لگا۔ تم حوصلے سے کام لو، تھوڑی سی تکلیف کرو۔“

آنے والے لمحات میں چڑیلیں ترپنے اور چیخ و پکار کرنے لگیں، جیسے جلتی آگ میں

انسان زندگی بچانے کی تک دود کرتا ہے۔

اسی دوران چھوٹے چھوٹے بولوں کی ایک لہری، جو کہ ان چڑیلوں سے بھڑگئی، ان کے تنہم سے ہی ایک بھاری شاپر ایک چڑیل کے ہاتھ لگا جسے اس چھوٹی مخلوق کے ایک لیڈر ٹائپ نے اٹھا لیا، اس نے جب اس کو کھولا تو اس میں ایک جو آپ کے سامنے کیل، پن، بلید اور بالوں کی تھ میں رکھی ہیں ان اشیاء کو اس بولنے کے حضور پیش کیا اور تمام ساتھیوں کو لے کر ہوا گیا۔

ان کے جاتے ہی مجھ پر غنودگی چھا گئی، دونوں بولوں نے فرش سے اٹھا کر کھلی پٹنگ پر لٹا دیا لیٹنے نظر سانسوں اور دل کی سرکلی دھڑکن نے میری پیش نش بھر دیا۔

لوگوں کے لمحات سے فارغ ہوتے ہی ایک

آکھیں چند ہوا کر خود بخود بند ہونے لگیں دماغ میں سوئیاں سی چبھنے لگیں، یوں محسوس ہوا جیسے نوکیلے ناواں، لمبے دانٹوں، سپاہ پال اور انگارے کی طرح ہل آکھوں والی پانچ بدردوں نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک جکڑ لیا ہے سانس لینا دشوار ہو گیا، آنکھیں ابل کر باہر آنے لگیں دکھنم پریشانی اور نول سے میری چیخیں کمرے کی چھت کو بھاڑ کر باہر جا گئیں۔

چیخ نکلتے کے فوراً بعد مجھے باباجی کی مسکور کن آواز سنائی دی۔

”مریدنی ڈرو نہیں، ان انسانیت چڑیلوں کا مقابلہ کسی عام ٹوکے باز، جھلی مال اور فراڈیے جن بابا سے نہیں بلکہ ”کھوبے شاہ“ ہے۔ میں ان کا خون پی جاؤں گا چتا جلا کر، ہر کھنڈروں میں خاک پھینکوں گا ان کو ایسا سبق سکھائے گا کہ ہر ڈراؤنی مخلوق انسان کے سامنے سے دور بھاگے گی۔“

جس شخص نے عمل کر کے ان کو تہارے بھیجا ہے وہ زندگی کی بھیک مانگے گا، آئندہ کسی سے من مرضی کے روپے ہنور کے اس کے مخالف

”میں پنچایت کے سامنے جو کچھ کہوں گی سچ کہوں گی۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔ ہم نے باباجی سے جنوں کے ذریعے حساب کروایا ہے انہوں نے بیوقوفوں کے ساتھ ہمارے خدشات کی تصدیق کر دی ہے۔ یہ تمام اشیاء کیل، سوئیاں، غورت کے سر کے بال، بلیدوں کے ٹکڑے، ان کی تعداد اور مقدار جنوں نے بتائی ہے جبکہ یہ تمام اشیاء ہم نے ایک سفید کاغذ میں لپیٹ کر شاپر میں بند کر کے صندوق میں رکھ کر بڑا بھاری تالا لگایا تھا۔“

سولگو میٹر دور باباجی کے خاص حجرے میں جنوں نے یہ تمام اشیاء دائرے کے اندر میرے سامنے لاکر رکھ دی تھیں۔

باباجی نے اپنے خاص حجرے میں مجھے بلایا پکے فرش پر موٹی سیاہ مارگرے دائرہ لگایا اس کے اندر مجھے بیٹھایا۔

میرے دائیں اگوتھے پر زتوں کا تیل لگایا اور مجھے اپنی ساری توجہ اس اگوتھے پر مرکوز کرنے کی ہدایت کی۔

باباجی نے جونہی پڑھنا شروع کیا، میرا اگوتھا بلب کی طرح جلنے بجھنے لگا نظریں ٹکانے کی وجہ سے

زنجی کر دیا زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جب وہ مرنے لگی تو اسے حلال کر دیا گیا اس کی بیماری کو شکوک ہونے سے بچانے کے لئے اس کے پیٹ کے اندر ڈالا گیا سامان ہم نے نکال لیا یہ تمام سامان ہم ساکھ مسیح کو دیتے واپس جا رہی تھیں کہ اس دوران آپ نے عمل کر کے ہم کو بلوایا۔ سزا بھی دی اور سامان بھی ہم سے چھین لیا، وہ سامان جو مجھ میرے ساتھی داماد نے گائے کو کھلا کر مار دیا تو اب ہم اس سے دولاکھ کی بجائے دس لاکھ لیں گے۔

اگر اس نے ہماری گائے کو ہلاک نہیں کیا تو ہمیں دس لاکھ کا سامن دے۔ اگلے جمعے والے دن نماز جمعہ کے بعد کوئی بھی شخص اس کی جگہ مسجد میں حلف دے کہ ہماری گائے کو اس نے ہلاک نہیں کیا تو ہم اس پر لگائے گئے الزام کی معافی مانگیں گے اور آئندہ اس کی ذات پر انگلی نہیں اٹھائیں گے۔

یہ تمام باتیں طے ہونے کے بعد مجیب کے ساتھ آئے ایک شخص نے پچھتائے کے سرخ سے کہا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو ہم بھی ایک بزرگ سے پورے گاؤں کے سامنے چوراہے پر حساب کروائیں ہو سکتا ہے یہ واقعہ ایسے نہ ہو جیسے حمیدہ نے بیان کیا ہے ان کا مجرم کوئی اور ہو۔“ دونوں فریقین کو پچھتائے نے پابند کیا۔

حلف دینے سے قبل ایک بار پھر حساب کروانے کے عمل پر اتفاق کیا گیا۔

☆.....☆.....☆

حمیدہ کا کردار ہوش سنبھالتے ہی مٹھوک نہیں بلکہ کالی سیاہ گھپ، اندھیری رات کی طرح سیاہ تھا لاکھ کوشش کے باوجود عزت کا سفید داغ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

جوانی کی عمر کو پہنچی تو آئے روز کی تہمت، بدنامی، ہزیمت والدین کے لئے سوبان روح بن گئی اس مصیبت سے جان چمڑانے کے لئے دور کے

رشتہ داروں میں اس کی شادی کر دی گئی۔

سسرال جانے پر پرانی روش نہ بدلی، زندگی کی مسمم شاموں میں تبدیل ہوتی رہیں چھ بچوں کی ماں بننے کے دوران کتنے ہی محاشقے چلے، کچھ کامیاب ہوئے کچھ ناکامی سے دوچار۔

ادھر عرصہ کو کچھ مٹی مگر جس پر بے کام کی گھٹی۔ کر پٹی بڑھی مٹی نصیحت کی طرح زندگی کے دو پہیے باندھ کر رکھا، یہ پرانی خون پیٹنے والی جو تک کی طرف اب تک اس کے ساتھ چلتی ہوئی تھی۔

دو بیٹیاں جوان ہوئیں تو ماں کی روش اپنائی، زخم چوسنے والی مٹی کی طرح طالب آتے اور روپوں کے عوض طلب پوری کر کے چلے جاتے۔

ایک بیٹی کا رشتہ دور پار کے رشتہ داروں میں طے کر دیا اور ایک مسائے میں ایک قریبی عزیز مجیب کو دے دیا۔

مجیب ایک فرم میں بطور سیل مین کام کرتا تھا اکثر ملک کے طول و عرض میں دورے پر ہوتا اس لئے اس کی پوری شہم میکے میں ماں کے پاس رہتی۔

حمیدہ اور بیٹی شبنم نے گھناؤنا کاروبار ہارلی رکھا، لیکن اب حمیدہ کے بیٹے باشعور ہو چکے تھے، زمانے کی اونچ نیچ کو سمجھتے تھے انہوں نے ماں بیٹی کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی گا دی لیکن جیسے چور چال سے جاتے ہیں اچھیری سے نہیں اسی طرح وہ چوری لوگوں سے ملنے لگیں لیکن یہ بات کب تک چھپی رہی، اکثر مل بیٹھے پکڑی جاتیں تو ان کی خوب دھلائی ہوئی گاؤں میں بدنامی الگ ہوتی۔

اب کی باری بیٹوں نے باز نہ آنے پر ہاتھ پاؤں توڑنے کی دھمکی دی۔ یہ دھمکی سن کر ان کے اوسان خطا ہو گئے، اب دوسری طرف وہ دوستوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھیں۔

اس مشکل مسئلے سے غصے کے لئے سخت قرار ہو گئیں۔ لفٹوں کو لٹکے میلوں دور سے تلاش

کر لیتے ہیں ان کو بھی ایک بابابی کی بھنگ پڑ گئی جو خواتین میں بہت مقبول تھے عزتوں کا لٹیرا ہونے کے ساتھ ساتھ ساکوں اور مریدوں کی جیبیں بھلی کرنے کا فن بھی خوب جانتا تھا۔

یہ بابا تو سفید ماں بیٹی حمیدہ اور شبنم کو مطلوب تھا، یہی ان کی محسوس میں پھنسی ناؤ کو کنارے لگا سکتا تھا۔

یہ بابابی الو کے خون سے دوران محبت تعویذ لکھتا تھا جو سفید کامیاب ہوتے۔ تعویذ لیتے ہی مسائل کے تمام داغ دھلانا شروع ہو جاتے مخالفین آنکھوں سے ناپتا، کانوں سے بہرے اور پاؤں سے معذور ہو جاتے، مسائل کھل کر من مرضی کے فیصلے اور افعال کرتا اس بابابی کی اطلاع پاتے ہی ماں بیٹی نے سکھ کا سانس لیا اگلے ہی دن دوپہر کے وقت بابابی کے حجرے میں پہنچ گئیں۔

☆.....☆.....☆

غفور عرف گھو با کسی دور میں گاؤں کے چوک میں بیٹھ کر جوتے کا ٹھٹھا اور پالش کرتا تھا کام کروانے والی اکثر خواتین اور لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنے پر اس کی جوتوں سے مرمت ہو چکی تھی۔

عاشقی کا بھوت جب سر پر سوار ہو تو سب کام چھوڑ کر منزل پانے کے لئے من کی مرادیں پوری کرنے والے بابا کا ملک بن گیا۔

یہ بابابی کے لئے مسائل تلاش کر کے لاتا، جھوٹی موتی کرامات سنا کر لوگوں کی توجہ مبذول کروا کر امن پسند خواہشات کی تسکین کے قصے سناتا اور لوگوں کو مطمئن کرتا۔

ایک لمبے عرصے تک خدمات سر انجام دینے کے صلے میں بابابی نے اپنے گدی نشین کی خلعت سے نوازا اور لوگوں کو فیوض و برکات سے مستفید کرنے کے لئے دور کے علاقے میں بھیج دیا جہاں کے مریدوں کو بابابی کے حضور حاضری دینے کے لئے بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا مریدوں اور مریدہ نیوں سے آشنائی تھی ان کی عقیدت نے ملتی پرتی کا کام کیا

بابا گھو بے شاہ کی شہرت کو چار کی بجائے آٹھ چاند لگا کر دور دور تک ڈھنڈورایا۔

”گھو بے شاہ“ کی کرامات کی شہرت حمیدہ اور شبنم کے کانوں میں پڑی تو فیضیاب ہونے کے لئے بے قرار ہو گئیں اور بابابی کے حضور پیش ہو گئیں۔

خوب صورت و حسین ماں بیٹی کو دیکھتے ہی بابابی کے منہ سے رال پھٹنے لگی جبکہ شکار خود غص میں متعید ہونے کے لئے بے قرار تھا۔

کون سا تعویذ اور کالے کادم، بابابی اور ان کے درمیان پیری مریدی سے ہٹ کر رشتہ قائم ہو گیا بیٹوں کو لگام ڈالنے کے لئے بابابی نے اپنے ایک خاص مرید کو کہہ کر دور کے شہر میں نوکری کا بندوبست کر دیا، جبکہ خود ماں بیٹی کی قربت سے حیرانے لگا۔

ایسے جیسے ہوئے بیروں کے مرید بھی ان کی طرح ذلت کے گڑھوں میں کھڑے ہوتے ہیں ایک خاص مرید کی نظر جب شبنم پر پڑی تو وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔

بابابی کو آستانے کے لئے ایک کینال زمین دی ساتھ ہی نذرانے کا ڈیر بھی بطور عقیدت پیش کیا اور بدلے میں کنیز شبنم کا ہاتھ مانگا۔

بابابی نے نظر عنایت کرتے ہوئے اس بار ہاتھ آئی بارات سے مل کر محفوظ ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا۔

مرید نے اسے بھی غنیمت سمجھا، شبنم اب بابابی کے علاوہ مریدی کی بھی منظور نظر بن گئی۔

☆.....☆.....☆

بابابی کے آستانے پر ماں بیٹی اسنے چاہنے والوں کے ساتھ عیاشیوں کی دلدل میں ڈھنسی گئیں۔ فحاشی کے قصے آستانے سے گھر کی دیواروں تک آ پہنچے۔

شبنم کا خاندان مجیب طیش میں آ گیا۔ شبنم کو مارا پھینکا، آئندہ سکے اور کسی بھی آستانے پر جانے سے سختی سے منع کر دیا۔

”رزق مقدر“

حضرت حذیفہؓ نے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی بھیجی ہے کہ کوئی شخص نہیں مرتا جب تک کہ وہ اپنا مقدر رزق پورا نہیں کر لیتا۔ اگرچہ میرے اس کو پہنچے۔ پس جب یہ بات ہے تو تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور روزی تلاش کرنے میں حد اعتدال سے تجاوز مت کرو اور تاخیر رزق کی صورت میں گناہوں کے ساتھ رزق طلب نہ کرنے لگنا اور جو رزق حلال اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اطاعت ہی سے حاصل ہوتا ہے (بزار)

(ایس حبیب خان - کراچی)

ہونے لگی، شور و غل، آلودگی اور رش سے ان نفیس لوگوں کا دم گھٹنے لگا۔ آبادی سے ہٹ کر جنگل بنانے شروع کر دیے، روپے پیسے کی ریل جیل نے ان کا غرور اور تکبر آسمان پر پہنچا رکھا تھا، اپنے علاوہ انسانوں کو گھٹیا، حقیر، کمتر اور کیڑے کوڑے سمجھتے تھے ہمیں کہاں خاطر میں لاتے۔

ہم سے دیران ٹھکانے بھی چھین لئے گئے، سر چھپانے کے لئے ہمیں جگہ کا ملنا محال ہو گیا زندہ انسانوں نے جب ہم سے زندگی چھیننا چاہی تو ہمیں وہ لوگ عظیم اور اپنے ہمدرد محسوس ہوئے جو ان زندہ لوگوں کے گھر، جنگل، بھگیا، بازار، کولھیاں اور لکڑی کاڑیاں چھوڑ کر قبرستان کی خاموش مگر پراسن سرزمین کے مقیم بن گئے تھے۔

ان مرحومین کی شرافت، بے بی اور انسانیت دوستی سے متاثر ہو کر قبرستان کے اندر کھنڈرات اور چھاڑیوں پر بے قرار کیا۔

رات کو قبرستان میں قبروں کے اندر نیک و بد مرحوم ہوتے اور ہم چڑیلوں کی گھنٹیں بجتیں۔

رابطہ کیا اور تمام واقعات اس کے گوش گزار کئے۔ اس بابا جی نے جھوٹے دن سب لوگوں کے سامنے سچ چور ہے پر چڑیلوں کو بلا کر ان سے حقیقت حال جاننے کا اعلان فرمایا۔

پنچایت، مدعی، ملزمان اور تمام گاؤں کے لوگوں کو چوک میں اکٹھے ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

جھوٹے دن بزرگ نے ایک مکان کی دیوار کو سیاہ چادر سے ڈھانپنے کا حکم دیا پوری دیوار جب کالی چادر سے چھپ گئی تو بابا جی نے مخصوص منتر پڑھنا شروع کیا منتر پڑھتے ہی اس سیاہ چادر پر ڈراؤنی شکلوں والی چڑیلوں کا غول نظر آنے لگا جب سب چڑیلیں نمودار ہو گئیں تو بابا جی نے ان کی ملکہ چڑیل سے سوال کیا۔

”سنا ہے تم ساکنا مسیح کی قید میں ہو اور اس کے کہنے پر انسانوں کا نقصان کرتی ہو۔ حمیدہ کی گائے کو بھی تم نے ساکنا مسیح کے کہنے پر ہلاک کیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“ تمام الزامات سننے کے بعد ملکہ چڑیل انتہائی مود بانہ انداز میں بولی۔

آبادی سے دور پر اسرار جنگلات، پہاڑوں اور کھنڈرات میں ہم سکون سے زندگی کی گاڑی میں محسوس تھیں رہائش کے لئے آسائشات سے محروم حویلیوں اور جنگلوں کی خواہشمند نہیں تھیں، محدود ضروریات اور خواہشات تھیں جو آسانی سے پوری ہو رہی تھیں کسی قسم کے مسائل اور پریشانیوں سے دور دور تک واسطہ نہ تھا۔

بڑھتی آبادی نے دیہاتوں سے شہروں کی طرف اور شہروں سے دیہاتوں کی طرف سفر کرنا شروع کر دیا یہ آبادیاں، دیہاتیں، شہروں کو نشانہ بنائی، جنگلات اور کھنڈرات تک جا پہنچیں ہمارا جنگلات اور کھنڈرات میں بے پراں شہری آسائشات سے لطف اندوز ہونے والے معززین نفیس اور انسانیت کے ٹھیکیداروں کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

ان لوگوں کو اب شہر کی زندگی بھی ناگوار محسوس

کھڑے، تیزاب اور پارہ ڈالا گیا اور یہ بیڑے باری باری گائے کو کھلا دیئے۔

زہریلے مادوں اور کیلوں، بلیڈوں پر مشتمل آٹے کے بیڑے کھاتے ہی گائے بیمار ہو گئی زمین پر گر گئی چاروں پاؤں بے قراری سے ادھر ادھر مارنے لگی۔

حمیدہ نے نمبردار کے ہمسائے سے قصائی کو بلایا۔ ساتھ ہی نمبردار کا بیٹا بھی بلایا اس کے علاوہ چند اور مرد حضرات اکٹھے کر کے سب کے سامنے گائے حلال کر دوائی چڑا وغیرہ اتار کر جب پیٹ کا ٹاٹا گیا تو اندر بہت سے زخم تھے۔

جب اونچڑی کو کاٹا گیا تو چارے کے ساتھ آٹا، بلیڈ، پٹیں، اور کیل بھی برآمد ہوئے۔

ان تمام اشیاء کو نکالا گیا تو حمیدہ نے دیکھتے ہی دوپٹے سے اتار کر درو پھینکا اور دونوں ہاتھوں سے منہ پر پھینک مارنے لگی۔

شبنم نے جب ماں کو روتا دیکھا تو وہ بھی ماں کے ساتھ زور زور سے پٹیں مار کر رونے لگی۔

پیٹ سے تمام سامان نکال کر دھویا گیا اسے سفید کاغذ میں لپیٹ کر شاہ پر میں بند کر کے صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا گیا۔

اگلے دن ماں بیٹی گائے کی ہلاکت کا سبب جاننے کے لئے بابا جی کے حضور پہنچ گئیں۔

بابا جی نے تمام حالات و واقعات کو ایک خاص رنگ دے کر تمام الزام ثبوتوں کے ساتھ حمیدہ اور گھروالوں پر لگایا۔

یہ سب اشیاء پنچایت اکٹھی کر کے حمیدہ نے سب لوگوں کے سامنے رکھیں بابا جی کے حساب کا فلسفہ بیان کیا اور تمام واقعات میں حمیدہ اور اس کے گھروالوں کو ملوث کیا۔

☆.....☆.....☆

حمیدہ کے ساتھ پنچایت میں موجود ایک شخص نے علاقے کی معروف، ہر دھڑ پر بزرگ شخصیت سے

مگر عشق کی آگ نے عزت، غیرت، انا، خودداری کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا، ایسی دھمکیوں اور پابندیوں نے خاک اثر دکھانا تھا۔

مرید اور شبنم ایک دوسرے کی زلفوں کے اسیر اور ایک جان دو قالب تھے۔ سماجی رکاوٹوں کو روندنے کا فیصلہ کیا۔

بابا جی اور آٹا کے کہنے پر خلع کا دعویٰ دائر کر دیا۔ یہاں بھی بابا جی کا اثر و رسوخ کام کر گیا۔

کسی بھی پیشی کی اطلاع جیب کو نڈل سکی، عدم پیشی پر یکطرفہ فیصلہ ہوا شبنم کو طلاق ہو گئی جیب کے نام کی زنجیر کے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئی اب سب لوگوں کو خوب گل کر برتنے کا موقع مل گیا۔

جیب نے اپنے دفتر کی سامی وکر سے شادی کر لی جو متعلقہ شاخ کی سربراہی اس کے دن بدلنے لگے۔

میاں بیوی کی تنخواہ بہت زیادہ تھی، تھوڑے عرصے میں شہر سے پلاٹ خرید کر ایک خوب صورت گھر بنایا۔

جیب کا ایک بھائی اور بہنوئی گاؤں میں رہتے تھے ان کو ملنے جب جیب آتا تو دفتر کی ٹویٹا کر دلاش بیوی کے ساتھ تحائف سے لدا پھندا بھائی کے گھر آتا۔

روپے پیسے کی ریل جیل نے اس کے انداز و اطوار تبدیل کر دیئے تھے۔ خوشحالی کے جھولے میں جیب اور اس کے گھروالوں کو کھولنے دیکھ کر حمیدہ اور شبنم کے سینے پر سانپ لٹھکتے۔

وہ ہر صورت جیب اور اس کے گھروالوں کو ذرا پہچانا چاہتے تھے۔ اور تو کچھ نہ کر سکے ان کی ایک آسٹریلیا کی گائے تھی جس کا ریٹ دو لاکھ روپے لگ چکا تھا اور انہوں نے بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس گائے کو ہلاک کر کے الزام جیب اور اس کے گھروالوں پر لگانے کا فیصلہ کیا گیا ایک دن انہوں نے کچے آٹے کے بیڑے بنائے ان میں خواتین کے سر کے بال، کیل، پٹیں، بلیڈوں کے

ہم میں سے بھی کچھ نیک فطرت، رحم دل، قابل احترام، اور کچھ بد فطرت، بد حرام، تیز طرار کام چور اور انسانیت دشمن تھیں۔

ان کا غرور بھی، زندہ مغرور دولت میں کھیلنے والے لوگوں کی طرح سر چڑھا تھا۔ اپنے پیاروں کے درمیان ہم زندہ چڑیلوں کی زندگی ان دنیا دار دوزخ نما پیٹ اور شیطان کی آنت کی طرح طویل خواہشات کے مالک حریص دنیا داروں کو کھٹکتے لگی۔

دولت کی سیاہ کاری سے مقدر کو کالا کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے اٹلے سیدھے عمل چلے اور تعویذ گنڈروں کی مدد سے تیز طرار بد کردار چڑیلوں کو قبضے میں کر کے ناجائز کام کروانے کا وعدہ شروع کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کم و بیش نو سو سال تک زندگی گزارنے والے اللہ کے خاص بندے آخر کار موت کی وادی میں مقید ہو گئے اسی طرح ہر زندہ زندگی کا اختتام موت ہے، کسی بھی شخص کو جتنا عروج ہوا آخر کار زندگی کے کنارے سے موت کے گڑھے میں چلا گیا لگا تا ہے۔

نیک کام کا صلہ اگر چہ دیر سے ملتا ہے مگر نیکی اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے اپنی راہی چمک سے ہر آنے والا سیاہ راستہ روشن کر دیتی ہے اور برائی کا انجام برا ہے۔ کیونکہ گندم بونے سے بھی چنے نہیں اگتے۔

چڑیلوں کو اپنے قابو میں لانا اتنا بھی آسان نہیں، لیکن کچھ لوگ خدا اور ان کا مسئلہ بناتے ہیں۔

اکثر کہتے سنا گیا ہے کہ ”دھوڑنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔“

اگر فریاد دودھ کی نہریں کھوسکتا ہے تو چڑیلوں کو قبضے میں لانا کون سا مشکل کام ہے۔

جس طرح ایک پرہیزگار شخص وقتی طور پر آزمائش کے کھینچے میں جکڑا جاتا ہے مگر اس کی سچائی پرہیزگاری اور ایمان کی مضبوطی پر مشکل گھڑی کے سامنے دیوار چین کی طرح سینہ سپر ہوتی ہے۔

مشکلات کی گھڑیاں دھوئیں کے بادل کی طرح

مٹ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ مگر شیطان انسان کا ازلی دشمن ہمیشہ مصائب کے اندھے کنوئیں میں دھکیلنے کے منصوبے بنا رہتا ہے جو انسان اس کو اپنا رہنما مان لیتا ہے شیطان خوب جن جن کراس سے بدلے لیتا ہے چڑیلیں سبھی ایک جیسی نہیں ہوتیں دودھ کی طرح صاف کردار کی مالک چٹانوں کی طرح مضبوط حوصلوں اور ارا دونوں کی مالک چڑیلوں کو لاکھ چلے کشتی، تمویز آدھی رات کے وقت ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر کچھ دیر یا میں مخصوص کلمات پڑھے جائیں دم، مرا تہے جو مرضی پاؤں پیلے جائیں قابو میں نہیں لایا جاسکتا۔

مگر بد کردار چڑیلوں کو فطرت کے خلاف کام اور گندی جگہوں پر گندے عمل کر کے قابو میں لایا جاسکتا ہے۔

ایسے بد کردار شخص کی شکل پر منحویت برستی ہے، رب کی پھونکار سے چہرہ بے نور ہوتا ہے شیطان کا ہر دھوکا راد قریب ہی سمجھی بن جاتا ہے۔

جس طرح شیطان روز ازل سے ملعون ہے اسی طرح ایسا مکروہ کردار کا مالک شخص بھی ہمیشہ ملعون سمجھا جاتا ہے سوائے روپے کی زیادتی کے باقی تمام دنیاوی فتنی اور روحانی آسائشات اور سکون کو اس سے چھین لیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے تو وہ بے اولاد ہوتا ہے، شکل قابل نفرت ہوتی ہے پاس بیٹھنے والے کو اس سے گھن اور بد بو آتی ہے۔

یہ شخص انتہائی سفاک، پتھر دل اور ظالم ہوتا ہے، رحم دلی کے معنی بھی نہیں جانتا انتہائی حریص، خود غرض اور مفاد پرست ہوتا ہے۔

روپے پیسے کا پجاری ہوتا ہے، اس کا دین، ایمان اور زندگی کا مقصد صرف پیسہ ہوتا ہے ایسا شخص جب مرتا ہے تو اس کی شکل گھڑ جاتی ہے۔

جیسے مردار کا گوشت گدھ کھاتے ہیں ایسے ہی اس کا مال کھانے والے گدھوں کی طرح جھنڈوں کی شکل میں مال پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

جس مال کو وہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیل کر اکٹھا کرتا ہے، موت کے بعد پانی کے بلبلوں کی طرح لٹخوں میں ختم ہو جاتا ہے۔

جو چڑیلیں ایسے بد قماش لوگوں کے قبضے میں آ جاتی ہیں وہ انسان کی طرح ظالم، بد طبیعت، بد کردار، بد دل اور لالچی نہیں ہوتیں کہ بلا وجہ انسانوں کو تنگ کریں ان کا جانی اور مالی نقصان کریں۔

ہم چڑیلیں کون ہوتی ہیں انسانوں کو ان کی مالاؤں کی سزا دینے والی، ہم نے اس زمین پر کبھی بھی زمین یا اس کے بیروں کاروں کی طرح خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔

تمام مخلوقات کی طرح ہم چڑیلیں بھی امتحان لئے اس دنیا میں ہیں اور زندگی کی ہر سانس، فعل و انفعالی کی جواب دہ ہیں۔

انسانوں کی طرح نیک عمل کو آنے والی کل تک ہی بھی ملتوی نہیں کیا۔ ہماری خواہش ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ مالک و خالق کی یاد سے خالی ہو نہ کرے ہمارے ہمارے کوشش ہوتی ہے کہ اوپر والا ہم سے راضی ہو جائے کیونکہ اگر اوپر والا راضی ہو گیا تو ہم اس دنیا میں بھی اہباب ہو جائیں گی اور جب اس کے حضور پیش ہوں گی تو شرمندگی نہیں ہوگی اور وہ بھی ہم انسانوں کی طرح دلیر نہیں کہ موت کے بعد دیکھا جائے گا زندگی سے الگ مرے اڑاؤ حرام حلال کو پس پشت ڈال دو۔

ہمیں قابو کرنا اتنا بھی آسان نہیں، یہ جتنے بھی بابا، پری بابا، تمویز گنڈے والے بابا ہیں ہمارے بے میں سراسر جھوٹ بولتے ہیں ہم اتنی بھی کمزور نہیں کہ ان جیسے فراڈیوں کے تابع ہوں اور ان کے حکم مانوں کی جان اور مال کو نقصان پہنچائیں۔

ایسے بابا سراسر جھوٹے، دغا بازار اور بے ایمان ہیں اور یہ جھوٹ بولتے ہیں کہ ہم ان کے ناجائز اہتمام دیتی ہیں۔

نی وی، اخبارات اور رسالوں میں جو لمبے اشتہارات دیئے جاتے ہیں ان کا حقیقت سے

قطعا کوئی تعلق نہیں۔ رسالوں اور میگزینوں کا کام، ہفتوں، دنوں اور گھنٹوں میں کرنے کا دعویٰ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے ایسا نہیں ہے لیکن اگر بغیرض حال مان بھی لیا جائے تو جو چڑیل ایک پلید کام کرنے والے شخص کے قاب و میں پلیدی کی حالت میں چلے کشتی کے بدلے قابو میں آ جاتی ہے تو جو چڑیل ایسے مکروہ بے دین شخص سے جان نہیں چھڑا سکتی وہ دنیا محرم لڑکے اور لڑکی کے درمیان پیاری بچی نہیں کہیے بڑھا سکتی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ اولاد دے اس کو ایک چڑیل اولاد کیسے دے سکتی ہے ایسا ممکن نہیں بلکہ یہ طاقت صرف اور صرف اوپر والے مالک کے پاس ہے۔

جن میاں بیوی کا آپس میں جائز طریقے کے مطابق نکاح ہوا ہے وہ لوگ اس رشتے کو نبھانا نہیں چاہتے تو ایک چڑیل کیسے ان کے درمیان پیار و محبت اور حقوق و فرائض کی ادائیگی کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے۔

یہ رٹے رٹائے جملے ہیں جن دن قابو میں، من پسند جگہ شادی، اولاد کا نہ ہونا، لاٹری ٹکٹ اور پرائز پاڈہ کا پہلا انعام لگتا۔

پڑھے لکھے اور ان پڑھ لالچی لوگ ایسے جھانے میں آ جاتے ہیں۔ انسانوں میں ایک عجیب خواہش پائی جاتی ہے کہ بیٹھے بیٹھے بغیر حرکت کئے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرنے کی بجائے روپے پیسے کے بل بوتے پر جائز ناجائز خواہشات کی تسکین چاہتے ہیں پانچ وقت نماز پڑھنے اللہ تعالیٰ کے حضور جھکتے اس کی اطاعت و بندگی کرنے کی بجائے اس کے احکامات کی صریح خلاف ورزی کرنے کے لئے کالے پیلے جادو کرنے والے چڑیلوں کو تابع رکھنے کا دعویٰ کرنے والے بابوں، پریوں کو کشتی کا ناچ بچانے کا ڈھونگ رچانے والے جعلی عاملوں کے آستانوں پر حاضری دینا فخر محسوس کرتے ہیں اور روپے پیسے کے عوض فطرت تبدیل کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔

جبکہ ایسا قطعا ممکن نہیں، جو بھی ہوتا ہے اللہ



شہر خموشاں

نسرین رانا-کراچی

رات کا ہولناک اندھیرا قبرستان کی ویرانی ہر سو دھشت پھیلا
وہی تھی کہ اتنے میں ایک خوفناک شکل انسان نظر آیا جو کہ
اپنا ہی ایک ہاتھ چبا کر منے سے کھا رہا تھا کہ.....

ہاتھ کو ہاتھ بھائی ندوینے والے دلت کے گھٹ ٹوپ اندھیرے جٹم لینے والی دشت ناک کہانی

اچانک ہی ان کی کار جو کد اسپڈ سے ٹکا ہوں سے بولا۔

”مطلب یہ ہے توحید صاحب جسے میں خوب جانتی ہوں۔“

”کیا جانتی ہو کیا کہے جاری ہو۔“ توحید

جھنجھلاتے ہوئے بولا۔

”گاڑی اسٹارٹ کرو۔“ صبا غصے سے بولی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“ توحید معنی خیز

”تو اور کیا کر رہا ہوں اتنی دیر سے۔“

ایسی کسی بھی حقیقت، واقعہ کا رنمہ جھوٹے،
کرامت اور پراسراریت سے ہمارا دور دور تک کوئی
تعلق نہیں۔

یہ سب ہم پر الزام تراشی اور بہتان ہے ان
جھوٹی کہانیوں کی وجہ سے انسان ایک دوسرے کو دھوکہ
دے رہے ہیں۔

حمیدہ سراسر جھوٹ بول رہی ہے، ایسے کسی بھی
واقعہ، کارروائی یا واردات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

گائے کی ہلاکت میں ہمارا ذرہ برابر کردار نہیں
جس نے اسے ہلاک کیا ہے اس کو تلاش کرو۔

جھوٹی کہانی سنا کر ہماری کردار کشی کی گئی ہے،
گائے کی ہلاکت کے بارے میں حمیدہ اور اس کے
چاہنے والے بابا بہتر جانتے ہیں انسانوں کے مسائل
انسان جانیں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔“

تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے پر بزرگ نے
چیزیل کا شکریہ ادا کیا جبکہ ان حقائق کو سنتے ہی حمیدہ شرم
سے زمین میں دھنسے گئی۔ جھوٹ کا پردہ چاک ہونے
پر پوری پنجائیت نے لعن طعن کی اس کی اور گھر والوں
کی سخت سرزنش کی۔

تعویر گمنموں کی مدد سے گائے کے قاتل
کو تلاش کرنے کا یہ طریقہ ایک سازش اور خائلیں
کو بلاوجہ بغیر جرم کے جھٹانے کا منمو یہ قرار دیا۔

حمیدہ کو وارننگ دی گئی کہ جب تک ٹھوس ثبوت
نہ ہو کسی پر بہتان، الزام لگا کر کھٹ نہ کیا جائے۔

اگر آئندہ مخالفین کو جھٹانے کی جھوٹی حرکت
کی گئی تو اس پورے خاندان کو گاؤں بدر کر دیا جائے گا۔

حمیدہ اور گھر والے سخت ہراساں اور پریشان
تھے پنجائیت اور عجیب سے معافی مانگی اور شرمندہ

شرسار چہروں کے ساتھ گھر چلے گئے اور ایک
عرصے تک لوگوں سے منہ چھپا کر جھوٹ کی منہ پرکھی

کالک کو مٹانے کی کوششیں کرتے رہے۔

تعلیمی کے حکم سے ہوتا ہے پوری کائنات میں بکھرے
اور لی سے لے کر انسان، حیوان، دریا، سمندر، دیوبیکل
پہاڑ تک اس کے حکم کے پابند ہیں۔

جو اللہ تعالیٰ ایک قطرے سے چھوٹ کا انسان
خلق کر سکتا ہے شیر جیسے طاقتور اور ہانگی جیسے دیوبیکل
جانور کو پیدا کر سکتا ہے چوٹی سے لے کر زراف تک
کو تخلیق کر سکتا ہے بھر زمین سے جاندار فصل، بے جان
اٹلے سے جاندار چوڑا پیدا کر سکتا ہے۔

جس نے کروڑ ہا سال قبل زمین کی تخلیق کے
وقت قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے ان
کے استعمال کی اشیاء سوٹا، جاننی، لوہا، تانبا، کرومائیٹ
، یورینیم، دھاتیں، گیس، آئیل، کونکے کے ذخیرے
زمین کے نیچے چھپا دیئے اور ان کے تحفظ کے لئے
اوپر پہاڑوں کو گاڑ دیا۔

قیامت تک انسان ان اشیاء کو استعمال کر کے تھک
جائے گا مگر ان کی مقدار میں ریت کے ذرے کے
برابر بھی کمی نہیں ہوگی۔

جس مالک نے بغیر ستونوں کے صدیوں سے
نیپالوں آسان کو کھڑا کر رکھا ہے زمین کے چھوٹے سے
ٹکڑے کو پانی کی سطح کے اوپر چٹا رکھا ہے۔

اس مالک کائنات کو بیٹا دینا مشکل ہے، میاں
بیوی کے درمیان پیار کا بند نہ پیدا کرنا آسان نہیں
، رشتوں ناطوں کو طے کروانے اور ارباب با مخلوق کو
روزی دینے کے لئے کسی سے مشورہ کرنے کا پابند ہے۔
نہیں نہیں ہرگز نہیں۔

ہم چلیں، آسب اور جنات بلاوجہ بدنام
ہو رہے ہیں۔

محترم بزرگوا! ہم دست بدم عرض گزار ہیں کہ
انسان ہی انسان کا دشمن بنا ہے انسان ہی انسان کو دھوکہ

دے رہا ہے اس سے فراڈ کر رہا ہے جھوٹ بول کر ریت
کے ٹکڑے تعمیر کر کے روپے ایشور رہا ہے پیار، محبت، عشق

، مشق، روزی، اولاد، من چاہی خواہش کی تسکین کے
جھوٹے وعدے تسلیم دے رہا ہے۔



توحید برابر گاڑی اشارت کرنے کی سعی کر رہا تھا۔
 ”یہ ناکک چھوڑو اور گاڑی اشارت کرو۔ سیدھی طرح سے۔“ صبا ناگواری سے بولی۔
 ”کیسا ناکک۔“ توحید حیرت سے بولا۔
 ”کیسا ناکک جیسے کچھ جانتے ہی نہیں کتنے ببولے بن رہے ہو ستر توحید میں خوب سمجھ رہی ہوں تمہارے اس ناکک کا مطلب مجھے سب معلوم ہے کوئی گاڑی واڑی خراب نہیں ہوئی ہے یہ سب تم جان بوجھ کر کر رہے ہو تاکہ مجھ سے بات کر سکو اور.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
 پھر بولی۔ ”فورا گاڑی اشارت کرو۔“
 ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے میں بھلا ایسا کیوں کروں گا۔“ توحید بولا۔
 ”جہیں نہیں معلوم کیا۔“ صبا اسے دیکھتے ہوئے طنز پر ہنسی کے ساتھ گویا ہوئی۔
 ”تم نے مجھے اتنا ٹھکانا سمجھا ہے کہ میں تمہارے رشتے سے انکار کے بعد ایسا کچھ کروں گا۔“ توحید غصے سے بولا۔
 ”میں کچھ نہیں جانتی بس فورا گاڑی اشارت کرو۔“ وہ چہرے کو دوسری طرف کرتے ہوئے بولی۔
 ”گاڑی حقیقت میں خراب ہوئی ہے تم یقین کرو۔“ وہ کار سے اترتے ہوئے لاپرواہی سے بولا۔
 اور پھر وہ کافی دیر تک کار ٹھیک کرنے کی اپنی سی سعی کرتا رہا۔
 اچانک ہی بہت زور سے تیز ہوائیں چلنے لگیں۔
 واقعی ہوا بہت تیز ہو گئی تھی درختوں کے پتے تیزی سے چلنے لگے کار کے اندر بیٹھی صبا چاروں طرف دیکھتے ہوئے گھبراہٹ مچ گئی۔
 توحید جو کار کے اشارت نہ ہونے کی وجہ سے صبا کے سوال سے اور اب اس تیز ہواؤں سے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ جھنجھلا کر کار میں واپس آ کر بیٹھ گیا۔
 ”کیسا ہوا.....؟“ صبا پریشان ہوتے ہوئے

”کیسا سوچ رہے ہو بیٹے جلدی کرو رات گہری ہو رہی ہے۔“ بوڑھے نے دونوں کو غور سے دیکھ کر کہا۔
 ”اتنی رات میں قبرستان سے پار جانا ٹھیک رہے گا۔“
 ”کیا کوئی اور حل نہیں۔“ توحید نے بوڑھے سے پوچھا۔
 ”نہیں.....“ بوڑھے نے سخت لہجے میں کہا۔
 ”دہاں جانا ہی پڑے گا کیونکہ دہاں آبادی ہے۔“
 توحید نے صبا کے نازک ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں ہوں نا تمہارے ساتھ چلو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے کار سے باہر آ گیا۔
 قبرستان سامنے ٹھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ وہ بوڑھا بھی ان دونوں کے ساتھ ہوا۔
 صبا نے توحید کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا، ایک ہاتھ میں بیگ دوسرے ہاتھ سے توحید کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔
 ”بابا اتنی دیر سے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ کوئی مل جائے مدد کے لئے مگر کوئی نظر نہیں آیا اور پھر آپ اچانک ہی نظر آ گئے۔“ توحید نے سوال کیا۔
 مگر یہ کیا بوڑھا غائب تھا۔ ”بابا کہاں گئے؟“ توحید بولا۔
 ”مجھے تو وہ کوئی بھوت لگتا ہے جو اچانک ہی غائب ہو گیا۔“ صبا بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔
 ”نہیں قبرستان میں نہیں جانا چاہئے، دیکھو وہ لڑکا غائب ہو گیا ہے۔“
 ”اس کے غائب ہونے سے میں بھی پریشان ہوں مگر جائیں تو کہاں جائیں قبرستان کی دوسری طرف آبادی ہے اس لئے وہاں جانا ضروری ہے۔“ توحید بولتے ہوئے قبرستان میں صبا کا ہاتھ تھامے دھڑلے داخل ہو گیا۔
 دونوں کے داخل ہوتے ہی تیز ہوائیں چلنے

لگیں تو توحید نے صبا کے ہاتھ پر اپنی گرفت مزید سخت کر دی اور آگے بڑھنے لگا۔
 توحید جلد از جلد اس شہر خاموشاں سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ صبا بہت ڈر رہی تھی۔ اور رات بھی آگے بڑھ رہی تھی۔
 وہ بہت تیزی سے چل رہے تھے کہ کسی چیز سے ٹکرا گئے صبا گرنے لگی تھی کہ توحید نے صبا کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ ڈال کر سنبھال لیا ساتھ اس نے نیچے دیکھا تو زمین پر ایک انسانی کھوپڑی پڑی تھی، ان دونوں کے پاؤں سے بھی کھوپڑی ٹکرائی تھی۔
 صبا ڈر کر توحید سے لپٹ گئی۔
 توحید نے اپنے پاؤں سے کھوپڑی کو ایک طرف کرنا چاہی تھی کہ اچانک انسانی کھوپڑی نے آنکھیں کھول دیں۔ کھوپڑی کی دونوں آنکھیں اب روشن ہو چکی تھیں۔ توحید نے صبا کا ہاتھ پکڑے اس جگہ سے آگے بڑھ گیا۔
 وہ تو اچھا تھا کہ صبا نے اس کھوپڑی کی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں ورنہ تو وہیں بے ہوش ہو جاتی۔
 توحید اور صبا دونوں ہی قرآنی آیات پڑھ رہے تھے اور ڈر جو کہ ان دونوں کو اپنے گلجھے میں جکڑنے کے لئے تلا ہوا تھا۔
 کافی چلنے کے بعد بھی قبرستان سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔
 مزید کچھ دور چلنے کے بعد دونوں کے قدم ایک آدمی کو دیکھ کر رک گئے۔
 وہ آدمی تو بڑی دور ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا اور کوئی لمبی سی چیز ایک ہاتھ میں دبائے کھارہا تھا رات بڑھ جانے سے اندھیرا کافی ہو گیا تھا ایک تورات اور چاروں طرف اندھیرا، دوسرے وہ آدمی کا لایا تھا۔ اس آدمی نے عجیب سا لباس پہنا ہوا تھا۔
 ”چلو اس کے پاس چلتے ہیں۔“ توحید بولا۔
 ”نہیں مجھے تو لگتا ہے یہ کوئی ڈاکو ہے۔“ صبا نے اپنا ٹھک ٹاک ہاتھ

اشتر

”یہ آج پارک میں اتنا کوڑا کیوں پھیلا ہوا ہے اس سے پہلے میں نے بھی پارک میں اتنے کاغذ بکھرے ہوئے نہیں دیکھے۔“

”کل پارک میں آنے والوں میں پمفلٹ تقسیم کئے گئے تھے جن میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ کوڑا کرکٹ پارک میں ادھر ادھر نہ دیکھیں۔ یہ سب وہی پمفلٹ ہیں۔“

(افشین ستار۔ کھنڈر ضلع ساکمر سے)

دیکھتے ہوئے صبا سے مخاطب ہوا۔

”صبا اپنا دوپٹہ کس کے ہاتھ لو اور قرآنی آیات کا ورد شروع کر دو اور یہاں سے بھاگو۔“

صبا کو تو جیسے سکتا سا ہو گیا تھا۔

پھر توحید صبا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے جھوپڑی کی طرف تیزی سے بھاگا۔

پھر اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا تو دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک اور منظر ان کی نظروں کے سامنے تھا۔

صبا بے ہوش ہو کر گر پڑی تو توحید دم بخود ہو کر اسے دیکھنے لگا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

ساری قبریں پھٹ گئی تھیں اور مردے اپنی اپنی قبروں میں کھڑے تھے۔

اب تو توحید بھی بہت خوف زدہ ہو گیا تھا اب اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ صبا کا ساتھ اور اب مردوں کا نظر آنا دل دہلا رہا تھا توحید نے قرآنی آیتوں کا پڑھنا بند نہیں کیا اور بلند آواز سے پڑھنے لگا اور اللہ سے مدد مانگنے لگا تھا۔ صبا کو اٹھا کر اس نے اپنے کندھے پر ڈالا، اتنی سردی کے باوجود وہ پسینے میں شرابور تھا۔

سارے مردے اپنی اپنی جگہ سے سیدھے

اچانک ہی تیز ہوائیں چلنے لگیں ادھر صبا کو ہوش آ گیا تو توحید نے فوراً صبا کو چلنے کے لئے کہا اور دونوں تیز ہو کر باوجود راستہ ڈھونڈنے لگے۔

ہوا کچھ اور تیز ہوئی تو صبا کا دوپٹہ اڑا اور ایک درخت پر جا کر لٹک گیا سردی بھی بڑھ گئی توحید نے اپنا کوٹا تار کر اسے دیا اور خود دوپٹہ اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

”رہنے دیجیے.....“ صبا نے توحید کو دوپٹہ اتارنے کی کوشش کرتے دیکھا تو کہا۔

”ہمیں یہاں سے جلدی لگنا چاہئے۔“

ہوا بہت تیز چل رہی تھی دوپٹہ درخت کی شاخ پر لہرا تھا تھوڑی اور کوشش کر کے آخر توحید نے دوپٹے کے پلو پکڑ لی۔

”یہ لیں مختصر صبا۔“

صبا نے دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہا۔ ”اتنی دیر ہو گئی چلتے چلتے مگر راستہ باہر جانے کا نہیں مل رہا ہے۔“

”نہیں واپس جانا چاہئے جہاں ہماری گاڑی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو پہلے یہ سانسے جھوپڑی نظر آ رہی ہے یہاں دیکھ لیتے ہیں شاید یہ گورن کا گھر ہے لگ کر وہ مل جاتا ہے اور ہماری مدد کرتا ہے تو ٹھیک ہے اور نہ واپس چلتے ہیں۔“

ہوا کافی تیز چل رہی تھی اچانک کسی شور کی آواز سنائی دی تو دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو عجیب سا منظر دکھائی دیا۔

ساری قبریں زور زور سے ہلنے لگی تھیں درخت ایسے ہلنے لگے جیسے چھوٹا سا پودا تیز ہوا سے ہلتا ہے رے قبرستان میں قبروں کی ہلنے کی آوازیں گونجنے لگیں ایک ہنگامہ سوار ہوا تھا آہستہ آہستہ آوازیں تیز تر تر تر آوازیں ایسی آنے لگیں جیسے کوئی پتھر گر رہا ہو۔ آوازیں اور بلند ہونے لگیں اور قبریں بہت

تیزی سے ہلنے لگیں توحید حیرت اور خوف سے یہ سب

”مگر مجھے تو بس اپنا ہی گوشت کھانے کی عادت ہے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا دوسرا ہاتھ اپنے پاؤں پر زور سے مارا اور ہاتھ جسم سے الگ ہو کر گر پڑا تو نیچے سے اپنا ٹوٹا ہوا ہاتھ اٹھا کر کھاتے ہوئے بولا۔

”یہ میری غذا ہے میرا کھانا ہے۔“ وہ اپنا ہاتھ بھینچوڑنے لگا۔

توحید کو کراہیت ہو رہی تھی۔ وہ اس کو بھاگنے بھی نہیں دے رہا تھا اسے اور صبا کو مار بھی نہیں رہا تھا آخر یہ چاہتا کیا ہے میں کب تک یونہی صبا کو لئے اس خوف ناک آدمی کے آگے کھڑا ہوں گا۔

پھر توحید کو خیال آیا یہ ہمیں کھائے گا بھی نہیں اور کچھ کر بھی نہیں سکتا ہے، اب تو اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں، مجھے فوراً یہاں سے لگنا چاہئے اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت آئے جلدی یہاں سے لگنا چاہئے۔

توحید نے بھیاک آدمی کو دیکھا جو اپنا ہی ہاتھ کھا کر اس کی ہڈیاں بھی چبا گیا تھا اور اب دوسرا ہاتھ بڑے مزے سے سر جھکائے کھا رہا تھا۔

اور پھر توحید موعن قیمت سمجھ کر فوراً وہاں سے صبا کو کندھے پر ڈالے بھاگ کھڑا ہوا۔

صبا کو کندھے پر اٹھائے کافی دور تک بھاگتا رہا پھر ایک گھنا درخت اس کے سامنے آ گیا تو توحید نے صبا کو نیچے گھاس پر لٹا دیا اور صبا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا اور اس وقت توحید کو صبا کے لئے پانی کی اشد ضرورت تھی مگر پانی کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

چاروں طرف قبریں ہی قبریں تھیں وہ سوچنے لگا یہاں کا گورن کہاں چلا گیا ہے سارا شہر خوشاں دہلیہ لیا ہے ہو سکتا ہے وہ بھی یہاں سے ڈر کر بھاگ گیا ہو۔

توحید بہت مضطرب ہو رہا تھا رات کافی ہو گئی تھی باہر جانے کا راستہ بھی نہیں مل رہا تھا اور کوئی رہبر بھی نہیں تھا ایک ملا بھی تو بھیاک بلا نما آدمی۔ ہر طرف بڑی عجیب سی خاموشی تھی اس کے باوجود اب لگ رہا تھا جیسے بہت شور وغل ہو رہا ہے۔

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی رہبر ہو اور ویسے بھی یہاں اور کون ہے جس سے ہم راستہ پوچھیں باہر جانے کا۔“ توحید یہ کہتے ہوئے صبا کا ہاتھ پکڑے اس آدمی کی طرف چلنے لگا۔

”سنئے۔“ توحید نے اس کے قریب جا کر بولا۔

”باہر جانے کا راستہ بتا سکتے ہیں کیا۔“ وہ آدمی جو گوشت کھانے میں مصروف تھا اس نے اپنا سر اٹھایا تو صبا اور توحید دونوں ہی ڈر گئے، صبا تو توحید سے لپٹ گئی۔

وہ آدمی اپنا ہی ہاتھ کھا رہا تھا اس کا ایک ہاتھ موجود تھا جسم کے ساتھ دوسرا ہاتھ بازو سے الگ تھا اور وہی ہاتھ دوسرے ہاتھ میں لئے ایسے کھا رہا تھا جیسے بہت ہی سن پسند کھانا کھا رہا ہو۔

توحید اور صبا کو دیکھ کر اس آدمی کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آ گئی تھی۔ خوف ناک مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا۔

”یہاں آنے کا راستہ ہے جانے کا نہیں۔ اور یہاں جو آتا ہے وہ واپس نہیں جاتا ہے یہ ہمارا شہر خوشاں ہے۔ یہاں ہمارا راج ہے۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”صبا بھاگو یہاں سے۔“ توحید صبا کا ہاتھ پکڑے بھاگنے کو تھا کہ صبا بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اور توحید کو ہمتا نہیں چلا وہ کب بے ہوش ہو گئی تھی۔

”ہاہاہاہاہ.....“ اس آدمی کے بھیاک قہقہے سے سارا شہر خوشاں دہلیہ گیا۔

توحید نے فوراً صبا کو اپنے کندھے پر ڈالا اور بھاگنے کو تھا کہ وہ آسیب نما آدمی جیٹ توحید کے سامنے آ گیا۔

”بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ سے ڈر مت کیونکہ میں تمہیں اور اس خوب صورت لڑکی کو نہیں کھاؤں گا اگر کھانا ہوتا تو اب تک تم دونوں میرے پیٹ میں بیچ گئے ہوتے۔“ وہ بھیاک ہنسی کے ساتھ اپنے بڑے دانتوں کی نمائش کرتے لگا۔

کھڑے تھے ان کی کوئی آواز تھی نہ ان میں کوئی حرکت تھی۔

توحید جمو پڑی کی طرف دوڑتا چلا گیا اور چند لمحوں میں وہ جمو پڑی کے اندر موجود تھا اس نے جمو پڑی کے باہر نہ دستک دی اور نہ آواز پریشانی اور خوف کے عالم میں وہ جگت میں جمو پڑی کے اندر کھس گیا تھا۔

اندر جا کر اس نے سانس لی اور چاروں طرف دیکھا۔

”اوہ..... تم“ وہ حیرت سے بولا۔
وہی گوشت خور آدمی اپنی ٹانگ کھا رہا تھا اسے دیکھتے ہی عجیب سی ہنسی پھٹنے لگا۔

آگے تم ابھی معلوم تھا تم یہاں ضرور آؤ گے اور جاؤ گے بھی کہاں اس شہر خوشاں سے بچ کر۔ یہاں آنے کا راستہ ہے جانے کا نہیں، یہاں ہمارا راج ہے۔“ وہ زوردار قہقہے کے ساتھ بولا۔

توحید پریشانی اور خوف سے کبھی جمو پڑی کے باہر کے منظر کی فکر کرتا تو کبھی اندر کا اس گوشت خور نما انسان جو بظاہر انسان نما تھا مگر کرتیں درندوں جیسی تھیں گویا ہوا۔

”کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ بھوک لگی ہے کیا تمہیں لو کھانا کھاؤ۔“ اس نے اپنی چٹائی ہوئی ٹانگ توحید کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

توحید نے پھر پھرتی سی لی اور دوسری طرف منہ پھیر لیا کیونکہ اگر وہ اسے بغور دیکھتا تو اسے ایسی ہوجانی۔ پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ”ہاں تم یہ کھانا نہیں کھاؤ گے کیونکہ تم تو انسان ہو۔“

توحید نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور پٹنگ پر مایا کو لٹا کر خود اس جگہ بیٹھ گیا۔ قبرستان میں بھاگتے بھاگتے وہ بری طرح تھک گیا تھا اس نے دوبارہ منہ ہی منہ میں آہستہ آہستہ تلاوت شروع کر دی تھی۔

گوشت خور آدمی ہنستے ہوئے بولا۔ ”مجھ سے ڈر کر یہ پڑھ رہے ہونا مگر ڈرو نہیں میں تمہیں

اور تمہاری محبوبہ کو کچھ نہیں کہوں گا اور نہ تمہیں کھاؤں گا کیونکہ میں تو صرف اپنا ہی گوشت کھاتا ہوں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

توحید کا ڈراس سے اب کچھ کم ہو گیا تھا مگر باہر کے منظر سے وہ ابھی تک خوف زدہ تھا مابا کو لے کر وہ باہر کیسے بھاگے چاروں طرف مردے ہی مردے تھے۔

پھر اس نے ڈرتے ہوئے اس گوشت خور آدمی سے پوچھا۔

”باہر سارے مردے اپنی اپنی قبروں سے نکل کر کھڑے ہو گئے ہیں..... ایسا کیوں؟“

”اس شہر خوشاں کا معمول ہے۔“ اس نے لا پر ادائی سے کہا۔

”کیا مطلب یہاں یہ روز ہوتا ہے مگر کیوں.....؟“

”وہ اس لئے کہ اس شہر خوشاں پر ہم سب کا قبضہ ہے یہاں تو اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔“ وہ خوف ناک مسکراہٹ کے ساتھ بولتے ہوئے اپنی ٹانگ کی ہڈی چبانے لگا۔

توحید کو پیاس لگ رہی تھی اور مباحوش میں لانے کے لئے پانی کی ضرورت تھی، سامنے ایک ٹی کا منڈکار کھا تھا۔

”میں پانی پی سکتا ہوں۔“ توحید نے پوچھا۔

”شوق سے پیتا پیتا ہے بیٹو۔“ وہ بولا۔
توحید نے منہ پر کمرے کی مٹی کے پیالے کو اٹھایا اور منہ سے پانی نکالنے لگا مگر پھر اس نے گھبرا کر مٹی کے پیالے کو چھوڑ دیا پیالہ زمین پر گر پڑا۔

”یہ..... یہ کیا ہے.....؟“ اس نے خوف سے پیچھے گرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”پانی کی جگہ خون۔“

”ااااا.....“ پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
”یہ ہمارا پانی ہے یہاں جو تازہ مردہ آتا ہے اس کا میں خون نکال لیتا ہوں اور اس منہ میں رکھ

لیتا ہوں۔“

اور کوئی مردہ نہیں آتا ہے تب کیا کرتے ہو۔“
توحید کو اپنی صبا کی فکر ہوئی۔

”تو بیا سارہتا ہوں.....“ اس گوشت خور نے جواب دیا۔

پھر توحید بولا۔ ”محترم کیا آپ ہمارے لئے کچھ کر سکتے ہیں، میرا مطلب ہے میں اس خوف ناک قبرستان سے باہر نکال سکتے ہیں؟“

”نہیں سا شہر خوشاں سے کوئی باہر نہیں جاسکتا ہے۔“ اس نے دوسری ٹانگ زمین پر کس کر ماری تو وہ ڈٹ کر گر پڑی۔ اب سر اور دھڑ رہ گیا تھا پھر وہ دوسری ٹانگ کو بھی چنبھوڑنے لگا۔

وہ درندہ کھانے میں مصروف تھا اور توحید اسے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگ رہا تھا۔

”پروردگار اس مشکل وقت میں ہماری مدد فرما نجانے ہمارے گمراہ ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ رشتہ سے انکار کے بعد مباح کے گمراہ نے یہ نہ سمجھیں کہ مباح کے انکار کرنے پر میں نے مباح کو خواہ کر دیا ہے یا مباح کر لے گیا ہوں۔“

ایک بار پھر توحید اچھٹے میں پڑ گیا، کیونکہ اس گوشت خور آدمی کے اب دونوں نے ہاتھ نظر آنے لگے تھے اور ساتھ ہی دونوں ٹانگیں بھی ثابت نظر آ رہی تھیں۔

توحید حیرت اور خوف سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”کیوں پڑ گئے ناں حیرت میں۔“ وہ ہنستے ہوئے منہ کی جانب بڑھا اور منہ سے خون نکال کر پینے لگا کہ اچانک توحید کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا پھر توحید گویا ہوا۔

”آپ تو بہت کچھ کر سکتے ہیں واقعی اس خوف ناک شہر خوشاں پر آپ کا قبضہ ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ بولا۔
”ہمارے لئے بھی کچھ کریں ہمیں کسی طرح

یہاں سے نکال باہر کریں شہر خوشاں سے جہاں ہماری گاڑی کھڑی ہے۔“ توحید کے لہجے میں التجا تھی۔

”نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اس نے صاف انکار کیا تو توحید اس کی خوشامد کرتے ہوئے پھر بولا۔

”آپ کی بڑی مہربانی ہوگی آپ کو آپ کے گوشت کی قسم اس نئے نکلے دونوں ہاتھ پاؤں کی قسم۔“
”اوہو یہ کیا کہہ دیا تم نے زندگی میں سب سے زیادہ جو چیز اہم ہے جو مجھے بے حد عزیز ہے جس کے بغیر میں رہ نہیں سکتا اور تم نے اسکی قسم دے دی جو میری غذا ہے میرا پسندیدہ کھانا ہے میرا اپنا گوشت اپنا کھانا میرے گوشت کی قسم دے دی اب تو مجھے کرنا ہی پڑے گا۔“

”اب ان کے لئے غذا کہاں سے لاؤں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔
”غدا مگر آپ تو اپنا گوشت کھاتے ہیں ناں۔“ توحید اسے غور دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”بے وقوف انسان میں اپنا گوشت کھاتا ہوں مگر میرے ساتھی تو دوسروں کا گوشت کھاتے ہیں۔“ بھیجا تک آدمی توحید کو اور پٹنگ پر لپٹی بے ہوش صبا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

توحید اس کی باتوں سے مزید ڈر گیا۔ ”یا اللہ مجھ پر اور صبا پر رحم فرما۔“
پھر توحید گویا ہوا۔ ”میں نے آپ کو قسم دی ہے کیا آپ میری دی ہوئی قسم کو توڑیں گے۔“ توحید کو اپنے صبا کے بچے کی جواسید نظر آتی تھی وہ ڈھٹکی ہوئی نظر آتی تو توحید نے اسے اپنی دی قسم کی یاد دلانی۔

”نہیں بالکل نہیں میں تمہاری دی ہوئی قسم کو نہیں توڑوں گا کیونکہ تم نے مجھے میرے ہی گوشت کی میری غذا کی قسم دی ہے اس لئے تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کو کیسے بہلاؤں ان سے کیا کہوں انہیں کیا دوں گا۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”خبر جانے دو کوئی اور شکار آ جائے گا۔“

”چلو تمہاری مدد کرتا ہوں۔“ وہ ایسے بولا جیسے بہت بڑا احسان کرنے جا رہا ہو۔

اور اگر وہ حقیقت میں ان دونوں پر احسان ہی کرنے جا رہا تھا، ان کی زندگی بخش کر۔

پھر توحید بھٹ بولا۔ ”ذرا ٹھہریں میں صبا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہوں جب تک آپ باہر کے منظر میرا مطلب ہے ان مردوں کو ہمارے راستے سے ہٹا دیں۔“ توحید نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”اس کی فکر نہیں کرو، وہ سب اپنی اپنی قبروں میں اب تک جا چکے ہوں گے اور ہنومت اس کے سامنے سے۔“ گوشت خور نے توحید کو صبا کے سامنے سے ہٹنے کا کہا۔

”کیوں.....؟“ توحید حیرت سے بولا۔

صبا کو ہوش میں لانے کے لئے اس گوشت خور نے یہ کہتے ہی صبا کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ شاید کچھ پڑھا بھی تھا۔ اور پھر اس نے صبا کے چہرے پر چھوٹک ماری تو صبا نے آنکھیں کھول دیں۔

سامنے اس گوشت خور کو دیکھ کر خوف سے اٹھ بیٹھی اور جھٹ پٹنگ سے اتر کر توحید سے لپٹ گئی تو توحید نے بھی اسے اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں فوراً لے لیا۔

”اب چلو بھی یا ابھی کچھ اور باقی ہے۔“ گوشت خور نے خوف ناک ہنسی بھرتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں چلے ہم چلے کو تیار ہیں۔“ توحید نے کہا۔

”میرا ہاتھ پکڑ لو اور اپنی آنکھیں بند کر لو۔“ اس نے اپنا کالا بڑے بڑے بالوں سے بھرا ہاتھ توحید کے آگے کیا اور تم لڑکی میرا دوسرا ہاتھ پکڑ لو۔“ تو صبا خوف سے توحید کی طرف دیکھتے ہوئے گردن کے اشارے سے نہیں کرنے لگی۔

تو گوشت خور بولا۔ ”تم انسان بڑے ہی عجیب ہو ایک بات ان لوگوں ساری بات منواتے ہو ارے بابا میں تمہیں کھاؤں گا نہیں۔ ہاتھ پکڑو۔“ وہ سمجھلا

کر بولا۔

توحید نے فوراً صبا کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”صبا یہ ہمیں ہماری گاڑی تک باہر پہنچا رہے ہیں ان کا ہاتھ پکڑ لو۔“

”دیر نہیں کرو جلدی سے ہاتھ پکڑ لو ورنہ اس کے سوا کوئی اور چار انہیں ہے دیکھو انہوں نے ہمیں ابھی تک کچھ نہیں کہا ہے۔“ توحید صبا کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

صبا نے ڈرتے ہوئے گوشت خور کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولی۔

”ہماری گاڑی تو خراب پڑی ہے تو پھر۔“ صبا توحید پر نظریں گاڑتے ہوئے بولی۔

”وہ بھی ٹھیک ہو جائے گی اب دونوں آنکھیں بند کرو اور جب تک میں نہیں کہوں آنکھیں مت کھولنا اور نہ ہی بات کرنا۔“

دونوں نے آنکھیں بند کر لیں تو انہیں ہلکا سا جھٹکا لگا اور محسوس ہوا کہ وہ ہوا میں معلق ہوں پھر تھوڑی دیر بعد گوشت کی آواز آئی۔

”آنکھیں کھول دو۔“ تو دونوں نے آنکھیں کھولیں تو وہ حیران رہ گئے کیونکہ گوشت گور اور وہ دونوں اب اپنی کار کے پاس کھڑے تھے۔

”اب تم دونوں بے خوف و خطر اپنی گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے باہر نکل جاؤ۔“ گوشت خور نے کہا۔

دونوں کار میں بیٹھے ہوئے گوشت خور کو احسان مند نظروں سے دیکھتے تھے گوشت خور نے سرکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا اور ہاتھ کا اشارہ کیا کہ اب چلے جاؤ۔

اور اچانک ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گیا۔ توحید نے کار اشارت کی تو دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے گاڑی اشارت ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

توحید اور صبا دونوں چچا زاد بھائی تھے۔ توحید

صبا کو پسند کرتا تھا اور جانے کب یہ پسند محبت میں بدل گئی تھی۔

توحید نے اپنا رشتہ بھی بھیجا مگر صبا نے اپنے والدین سے صاف کہہ دیا تھا کہ توحید کو پسند نہیں کرتی اور جب پسند نہیں تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور توحید کو اپنا رشتہ ٹھکرائے جانے سے اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی اور اس نے دل پر جبر کرتے ہوئے السلت کا بدلہ ایسے لیا کہ اس نے صبا سے قطع کلائی کر لی۔

اس شام کو توحید کے گھر دعوت تھی تمام رشتہ دار آئے تھے صبا کی فیملی بھی آئی تھی۔

توحید کے والد وحید علی صبا کو بہت پسند کرتے تھے ان کی یہ خواہش تھی کہ صبا ان کے گھر کی بہو بنے رشتہ سے انکار کے بعد وہ انسردہ تھے، سب مہمان چلے گئے اور پھر انہوں نے بہت ضد کر کے صبا کو روک لیا تھا اور پھر صبح کے وقت صبا کو اس کے گھر چھوڑنے کے لئے انہوں نے توحید سے کہا تو توحید نے چاہتے ہوئے بھی والد کی بات رکھ لی اور پھر صبا کو اس کے گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کار تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی دونوں خاموش تھے، سڑک سنسان تھی اس لئے توحید نے کار کی اسپینڈ بڑھادی تھی اور ایسے بھی وہ جلد از جلد صبا کو اس کے گھر پہنچانا چاہتا تھا۔

کل تک صبا جو توحید کو پسند کرتی تھی آج ایسے موقع پر اس کی مدد حاصل کی اس کا ساتھ دینے کی وجہ سے وہ نہ صرف اسے پسند کرنے لگی تھی بلکہ دل کے کونے میں توحید کے لئے پیار پیدا ہو گیا تھا۔

وہ خاموش بیٹھی شہر خوشاں کے ان جان لیوا خوف ناک مناظر کو یاد کرنے لگی تھی بار بار توحید کا ہاتھ پکڑنا اور جب وہ کئی بار بے ہوش ہوتی تو توحید کا اپنے کندھوں پر اسے ڈال شہر خوشاں سے باہر نکلنے کی

کوشش کرنا۔

لیکن اگر توحید چاہتا تو صبا کو وہیں چھوڑ کر خود اپنی جان بچا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

کیونکہ توحید اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے اور سچا پیار کرتا ہے اور میں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا، نا پسند کر کے رشتہ سے انکار کیا، شہر خوشاں میں داخل ہونے سے پہلے اس نے توحید کو جو کہا اس سے صبا کافی اذیت کی کیفیت میں ہو گئی تھی۔

گاڑی ہوا سے باتیں کرتے ہوئے چلی جا رہی تھی کہ توحید نے ایک نظر سر جھکائے صبا پر ڈالی جڑوڑکی اس سے دور رہنا چاہتی تھی آج وہ خود اس کے کتنے قریب آ گئی تھی۔ رشتے سے انکار کے بعد خود توحید اس سے دور رہنا چاہتا تھا اسے بھلا دینا چاہتا تھا مگر آج قسمت نے ان دونوں کو بہت قریب کر دیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ توحید نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں.....؟“

”کیسے کہوں کہ میں بہت شرمندہ ہوں اپنے سلوک سے کاش آپ کو نہ ٹھکرایا ہوتا۔“ وہ دل میں سوچتے ہوئے پڑ مردہ چہرے سے بس اتنا ہی کہہ سکی۔

☆.....☆.....☆

”کچھ تو ہے۔“ توحید پر سوچ انداز کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلو اچھا ہے میرا ہاتھ نہ سسپی اس گوشت خور کا ہاتھ تھام لیا۔ یعنی تم نے اسے میرے مقابل لاکھڑا کیا تو یہ ہے تمہاری پسند جس کے لئے تم نے مجھے ٹھکرایا۔“ توحید اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”چلو جو مرضی۔“ وہ شرارت سے بولتے ہوئے صبا کے خوب صورت چہرے کو دیکھنے لگا۔

”آپ سمجھ کیا رہے اپنے آپ کو۔“

”کیوں اس طرح کی باتیں کر کے میرے دل کو مزید دکھ دے رہے ہیں ایک تو میں پہلے ہی آپ کو ٹھکرا کر شرمندہ ہوں اور پھر سے آپ مجھے اور پریشان



گمنام اسٹیشن

گلاب خان لوگی - کشمور

رات اپنے پچھلے پھر میں داخل ہو چکی تھی قرب و جوار کی ویرانی دل دھلا رہی تھی ہر طرف خوف مسلط تھا رات کے اندھیرا بھاڑ جیسا منہ کھولے آگے ہی آگے بڑھتا آ رہا تھا کہ اچانک.....

خوف کے افق پر رواں دواں عجیب و غریب دل گرفتہ دل شکستہ اور دل فریفتہ کہانی

طوفانی ہواؤں کا شور اور بے کالے سے گاؤں سے دور واقع اس ویران ریلوے اسٹیشن کا بوڑھا چوکیدار اپنی عمر کی طرح سروں کے آخری ایام پورے کر رہا تھا جو سر شام ہوتے ہی ریلوے اسٹیشن کے ویران انتظار گاہ میں چار پائی لگا کر شاید ڈیوٹی کر رہا تھا یا اس عمر میں گھریلو حالات و معاملات سے دور بھاگ کر ریلوے اسٹیشن کی ویرانی میں زندگی کے آثار لانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

”سسرالی..... کون سسرالی.....؟“ مباحثت سے بولی۔

”ارے بھائی تمہارے گھر والے میرے سسرالی تو ہیں۔“

”مطلب تم میرا مطلب..... اب۔“ اور صبا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”بھئی ہم تو وہی کریں گے جو مرضی یار ہو۔“ تو حید ہنستے ہوئے گویا ہوا۔

”میں نے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے اتنا چاہنے والا مل جائے گا اور میرے لئے جان کی بازی لگا دے گا۔“

پھر تو حید بولا۔ ”ہمیں اس شہر خوشاں کا شکر گزار ہونا چاہئے جس نے ہمیں ایک جان دو قالب بنا دیا۔“

پھر تو حید کار کی کھڑکی سے باہر سر نکال کر زور سے چیخا۔ ”شکریہ شہر خوشاں شکر یہ شہر خوشاں۔“

”ارے یہ کیا کر رہے ہیں۔“ مباحثی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک ہنس پڑی تھی۔

”اب چلے بھی بہت دیر ہو گئی ہے۔ گھر والے کچھ اور نہ کچھ نہیں کہ آپ نے.....“ صبا نے مسکراتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ہاں وہ دوبارہ بولی۔

”ابھی ہم تھوڑی ہی دور آئے ہیں شہر خوشاں سے کہیں آپ کی آواز وہ گوشت خور نہ سن لے۔“

تو حید بھی ہنستے ہوئے۔ ”ہاں بھئی اب تو شہر خوشاں سے بہت دور جانا چاہئے کیونکہ اب ہمیں ہماری زندگی مل گئی ہے۔“ تو حید نے گاڑی کی اسپینڈ بڑھاتے ہوئے مسکرایا تو صبا نے شرماتے ہوئے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور اپنا سر تو حید کے بازو پر ٹکا دیا اور

تو حید کا دماغ بارش بارش ہو گیا اور گاڑی مزید فرار نے بھرنے لگی۔

”دل کی بات صبا کی زبان پر آ ہی گئی وہ شرمندہ نگاہوں سے تو حید کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”تو حید نے گاڑی روک دی۔“

”کہیں آپ کی باتیں سننے سے ایکسٹنٹ نہ ہو جائے۔“ تو حید چپکا۔

”تو تم اقرار کر رہی ہو کہ تم نے مجھے ٹھکرا کر غلطی کی ہے۔“ اب تو حید سیرس ہو گیا تھا۔

”ہاں.....“ وہ اشک غدا مت کے ساتھ ہاں کہہ گئی۔

”تو پھر کیا ارادے ہیں؟“ تو حید اس کے دل کی بات زبان پر لانے کے لئے مضطرب ہو گیا۔

”اب کیا فائدہ اب تو رشتے سے انکار ہو چکا ہے۔“ وہ دل شکستہ سے تو حید کو انگلیاں دکھا رہا تھا۔

دیکھتے ہوئے بولی۔

”اب میری بات کون سنے گا۔“

”میں ہوں ناں۔“ تو حید مسکراتے ہوئے بولا۔

”بس تم بتاؤ تم راضی ہونا کہیں پہلے کی طرح انکار تو نہ کرو گئی۔“

”نہیں..... نہیں.....“ وہ لمبی سانس لیتے ہوئے بولی۔

”صبا کو اپنے لئے اتنا مضطرب دیکھ کر تو حید کو بہت خوشی ہوئی کیونکہ یہی وہ لڑکی تھی جس کے لئے تو حید اسے دیکھنے کے لئے بے چین رہتا تھا اس کے گھر کے چکر لگانا اگر صبا سے اسے پیار نہ ہوا ہوتا تو اس کے گھر شوق دیدار کو نہ جاتا۔

صبا خاموش بیٹھی نظریں بھکائے اندر دھکی اس کی آنکھوں سے اشک غدا مت اس کے گال بھگو رہے تھے اب اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کا فیصلہ غلط تھا۔

”اچھا اب یہ آنسو بہانا تو بند کرو۔ ایسے گھر جاؤ گی تو میرے سسرالی کیا کہیں گے۔“ تو حید شرارت سے بولا۔



پتا نہیں؟ مگر ہمیں فی الحال طوفانی ہواؤں نے پریشان کر رکھا تھا رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ ہمیں وہاں دور سے آگ روشن نظر آئی اور تین سائے وہاں اپنے ہاتھ تاپ رہے تھے ہمیں بھی سردی نے آگھیرا تھا وہ تین لوگ تھے اور چوتھا بھی ان میں شامل ہو گیا۔

”آؤ پردہ کی باؤ! بیٹھو آگ تاپو“ شک

لکڑیوں کا چند من والا مقدار میں موجود تھا، میں بھی آلتی پالتی مارکر زمین پر بیٹھ گیا اور سب کا سرسری جائزہ لینے کا دوپڑے سے ایک اکورنو جوان تھا جو بالکل میری طرح دکھائی دے رہا تھا ان سب میں ایک بات یکساں تھی سب ہی ایک دوسرے کو ڈرانے کی کوشش کر رہے تھے اور ڈراؤنی قصے بیان کر رہے تھے، میں بھی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا، شاید اس طرح قصہ خوانی سے رات گزر جائے اور صبح ہوتے ہی ہر کوئی اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔

پوڑھے چوکیدار کی کھانسی میں سردی کی شدت کی وجہ سے اضافہ ہو گیا تھا ایسی طوفانی ہواؤں میں بھی دور اسے دھواں اٹھائی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”پتا نہیں یہ آگ کس نے جلائی ہے، یہاں تو اس وقت کوئی ٹرین نہیں آتی اور مسافر بھی نظر نہیں آ رہے؟ مجھے کیا؟“ وہ پھر رضائی میں منہ کر کے سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا پرنجانے آج نیند اس سے کوسوں دور تھی، اک عجیب سی بے چینی نے اسے آگھیرا تھا۔

وہ چاروں مسافر نما سائے بدستور آگ سینک رہے تھے۔ ایک پوڑھا مسلسل بولے جا رہا تھا اور اپنی خود نوشت سن رہا تھا اور باقی ہم تین ہر تن کوش ہو کر اس کی کہانی سن رہے تھے۔

”تو دوستو!...! میری کہانی کافی طویل ہے چونکہ ہر کوئی اپنی اپنی کہانی بیان کرے گا اس لئے مختصر میرا قصہ کچھ اس طرح ہے۔

”میں ایک تھانیدار تھا بے حد ظالم اور بے رحم۔ پتا نہیں کتنے مظلوم قیدیوں کو اپنے ظلم کا شکار بنا چکا تھا ان

میں بے گناہ بھی تھے اور گناہ گار بھی میرے کاغذوں کسی کے لئے معافی نہیں تھی میرا اور جتنا چھوٹا سا، جیل خانہ تھا جہاں میں تعینات تھا۔ لیکن ان سب میں ایک قیدی مجھے ہمیشہ یاد رہے گا اور وہ تھا ایڈم نمبر 53 جی یہاں قیدی نمبر 53 خاموش طبع، ڈرپن اور سنجیدہ، لیکن میرا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا ان پر الزام تھا کہ اس نے اپنے والد کا خون کیا تھا، کبھی ایسا اس کی بوڑھی والدہ اس سے ملنے آتی تھی ورنہ وہ ہر ایک چپ بیٹھا رہتا تھا مجھے صرف اتنا پتا چلا کہ ایک دن اس کے باپ نے اس کی ماں کو جو اپنے دیا اور بیٹس میں اس نے اپنے ہی باپ کا خون کر دیا۔

عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ ایڈم نمبر 53 سے بلاوجہ نفرت ہو گئی تھی، ایک دن اس کی بوڑھی والدہ اس سے ملاقات کرنے آئی تھی یہ اسی دماغ مگھوا ہوا تھا میں نے ایک زور کا دھکا دے کر اس کی بوڑھی والدہ کو کر دیا جس سے قیدی نمبر 53 کا دل تکلیف پہنچ پھر تو اس نے حد ہی کر دی، دنیا جہاں ل گالیاں مجھے ساڈا لیں بھلا میں بھی کہاں چپ بیٹھتا تھا اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکا اور آؤ دیکھا ایک بڑا سا ڈنڈا لے کر جیل کے کمرے کے اندر گیا اور اس بڑے ڈنڈے کی برسات کر دی اس کی ہاتھ واقع ہو گئی مجھے ہتھی نہیں چلا۔ دوسرے کا ٹیبل ہمارا ہوئے اندر آئے اور میرا ہاتھ روکا لیکن تب دیر ہو چکی تھی ایک بوڑھی ماں کے سامنے اس نے اپنے بیٹے کی لاش خون میں ڈوبی ہوئی پڑی تھی۔

بوڑھی عورت رو رو کر مجھے بددعا میں تھی ویسے میرے کیرئیر میں ایسے واقعات کی بہت سی اس لئے میں نے اپنے ماتخوں کو لاش ٹھکانے خودکشی کی رپورٹ بنا کر پیش کرنے کو کہا۔ میں اس کمرے میں واپس آ گیا ویسے میرا کمرہ جیل کے والے ایریا میں ہی واقع تھا اور ویسے بھی میں انکس اور شادی بیاہ کو فضول رسم سمجھتا تھا ڈیوٹی کے بعد وہاں شہاب کا اہتمام رہا ریکورڈ کرتا تھا۔

میرے ماتحت روز کوئی نہ کوئی کال گرل پیش کرنے کا انتظام کرتے تھے اور بدلے میں وہ مجھ سے پیش آنے کی توقع کرتے تھے کیا بتاؤں دوستو! اتنا مکار ظالم شخص تھا اور ایک دن اس بوڑھی عورت دھانے کا دم کر دکھایا۔

رات کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے پر ایک کسین حسینہ کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے حسن سے کوئی کچھ کر میں دنگ رہ گیا اس کی طلماسی آنکھوں سے گام گیا اس کسین حسینہ کو اپنی ہاتھوں میں لینے کے لئے ہی اس کے قریب گیا اس نے اپنے ہاتھ کے سے مجھے روک دیا۔

”اتنی بھی کیا جلدی ہے جیلر صاحب، شہاب سے اب کامز نہیں چھو گے۔“ اب شراب پینے کی بات کہے تھی۔ بہر حال میں بستر پر دراز ہو گیا اور وہ بیلنے لگی کہ چاک کرے کی لائٹ چلی گئی۔

”ارے یہ لائٹ اس وقت جاتی تو نہیں ہے موم بجی ہاتھوں میں اٹھائے جانے کس طرح نڈول کی بات سن لی۔

باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازوں میں بندرتج ہوتا جا رہا تھا بالکل ویسے جس طرح جیل میں کسی کے موت آ جانے سے پہلے سارے کتے زور زور آتے تھے لیکن آج کسی کی موت تو نہیں ہوئی جیسے اس کسین میرے قریب آئی تو، تو موم بجی کی روشنی اس کا چہرہ دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے کیونکہ وہ نہیں قیدی نمبر 53 کا چہرہ تھا جس میں کبھی نہیں اس کا چہرہ اور اب بھی بھینک ہو گیا تھا۔

میں نے اپنا پٹل اٹھانے کی کوشش کی لیکن گیز طور پر میرے ہاتھ جبرن ہو چکے تھے اور میں خوف کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

قیدی نمبر 53 بولا۔ ”سچا نا جیلر!... آج کیوں کو بھی اپنی دنیا میں ساتھ لے جاؤں، ویسے تو بڑا پھر ہے۔ میری بوڑھی ماں کی بددعاؤں نے اپنا لہا ہے اور مجھے تم سے بدلہ لینے کی قوت مل گئی ہے

بڑا شوق ہے ہاں کال گرل کو بلائے گا۔“ وہ سچر سے وار کرتا گیا اور میرے جسم کا ہر عضو الگ ہوتا گیا اور اس طرح مجھے زندگی سے نجات مل گئی اور قیدی نمبر 53 نے اپنا بدلہ لے کر ثبات کر دیا کہ ظالم کو اس دنیا میں ہی اپنے ظلم کا بدلہ چکانا پڑتا ہے۔

”میری روح تب سے بھٹک رہی ہے اور راہ نجات کے لئے یہاں وہاں بھٹکتا رہتا ہوں، تو دوستو یہ بھی میری کہانی۔“

اس کی کہانی سن کر ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر خوب ہنسنے لگے۔

میں نے کہا۔ ”کیا شکل سے ہم لوگ آپ کو بے وقوف نظر آ رہے ہیں جو آپ اس طرح ہمیں ڈرانے کی ناکام کوشش کریں گے۔“

”کیا کہا روح!...! دوسرا پوڑھا بول پڑا۔

”ساتھیو، ہمیں ڈرانا آسان نہیں ہے پر مجھے یقین ہے کہ میری کہانی سن کر آپ لوگ ضرور ڈر جائیں گے، تو وقت ضائع کے بغیر میری کہانی سنو۔“

”میں ایک کامیڈی بن تھا اور مذاق کر کے بہت پالتا تھا بھی ٹھہر میں بھی ظلم میں بھی ڈرے میں اور بھی ملے میں۔۔۔۔۔ میں ہر جگہ لوگوں کو ہنساتا تھا لیکن ایک چیز کو لے کر میں روتا تھا وہ تھا ایک خواب جو اکثر میں دیکھا کرتا تھا ایک جنگل ہے اور میں راستہ بھٹک گیا ہوں اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے اور ہر طرف جنگلی جانوروں کی آوازیں نے مجھے کافی ڈرا دیا تھا کما چاک ایک سفید ریش سفید پوش اجنبی میرے سامنے نمودار ہوا۔“

”ڈرو نہیں مسخرے تم لوگوں کو ہنساتے ہو اور آج کے دور میں یہ کام نہایت مشکل ترین کام ہے جو تم بخوبی سے سرانجام دیتے آ رہے ہو، لیکن میری ایک بات یاد رکھنا، یہ دنیا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے تم اپنی تکلیفیں چھپا کر دوسروں کو ہنساتے ہو، لیکن جس اولاد اور بیوی کے لئے یہ سب کر رہے ہو وہی لوگ ایک دن تم کو رلا دیں گے۔ یاد رکھنا موت کو۔“ سفید پوش اجنبی غائب

ہو گیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ یہی بات مجھے ہر وقت رلا کرتی رہتی تھی۔

ایک دن میں ایک تھیر میں تماشہ کر رہا تھا کہ اچانک مجھے دل کا شدید دورہ پڑا انتظامیہ والے مجھے شہر کے بڑے اسپتال لے کر گئے درد کم نہیں ہو رہا تھا اور ڈاکٹر مجھے بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے مجھے کوئی ہوش نہیں تھا میرے سامنے تو اندھیرا ہی اندھیرا تھا بس یوں سمجھو کہ میرا آخری وقت تھا، قریباً 20 منٹ بعد مجھے ڈاکٹروں کی سرگوشی سنائی دی۔

”ہی از تو مور“

میں خود کو کافی ہلکا محسوس کر رہا تھا، لگتا تھا جیسے کسی بیماری چیز کی دباؤ سے نجات مل گئی ہے۔

”ارے یہ کیا میں تو اندھیرے میں اڑتا جا رہا تھا، لگتا ہے میں کسی انجمانی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں لیکن اندھیرا تھا کہ جھٹکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اچانک ایک روشن چہرے والا سفید ریش میرے سامنے آ گیا اس کے چہرے کی روشنی سے اندھیرے میں اجالا سا ہو گیا ارے میں تو اسے پہچانتا ہوں یہ وہی اچھی سفید ریش تھے جو اکثر خواب میں مجھے دکھائی دیتے تھے وہ بہت ہی نرمی سے گویا ہوئے۔

”میاں مسخرے، حیران مت ہو تم ابھی مرے نہیں ہو بس موت کی سرحد پر کھڑے ہو، تم نے واپس جانا ہے اور خواب میں دیکھے گئے دھکے مزید جھیلنے ہیں بس اتنا خیال رہے کسی کا دل نہیں دکھانا۔“

ایک زوردار ہوا کا جھونکا سا محسوس ہوا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہی پرانا دن میرے ناتواں کندھوں پر آ گیا ہے۔

ڈاکٹروں کی آواز پھر گونجی۔ ”نامکن، ارے یہ کیسے ہو گیا تھوڑی دیر پہلے اس مریض کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی تھی اور ہم نے اسے مردہ قرار دیا تھا لیکن یہ اچانک اس کا دل کیوں دھڑک رہا ہے ارے یہ تو زندہ ہو گیا۔“

”میں کہاں ہوں۔“ میں نے آنکھیں کھولتے

ہی سوال کیا۔ سارے ڈاکٹر وہاں جمع ہو گئے، کسی کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں مرکز زدہ کیسے ہو گیا ڈاکٹر نے احتشار پریش نے اپنا مشاہدہ بیان کیا مگر کسی کو بھی باتوں کا یقین نہیں ہوا وہ سارے مادہ پر اور مگر لوگ تھے جو سائنس کو ہی سب کچھ مانتے اور سائنس روحانیت سے عاری ہے۔

خیر کچھ دن میں وہاں زیر علاج رہا اب میں باہر آ چکا تھا اور کامیابی بھی چھوڑ دی تھی پوری زندگی اولاد کی خاطر دھکے کھائے، وہ اب مجھے قاتلوں پر دھکے لگے تھے، میری بیٹی کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔

ہوئی اپنے میکے چلی گئی اور میرے بڑے بیٹے نے تو اہل کروایا مجھے اولاد ہاؤس میں بھرتی کر دیا جہاں میرے بیٹے کے اولاد کے ستارے ہوئے بوڑھے اور بزرگ سے دھکے کھاتے تھے۔ میں اس ٹیم میں بیٹا رہنے لگا۔

خواب والی بات سچ ثابت ہو گئی اولاد ہاؤسوں ملنے والے غم نے مجھے بے حال کر دیا۔ میں برسوں وہاں گزارا لیکن کوئی بھی مجھے ملے نہیں آیا اور آخر کار سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی اور آج آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔“

مسخرے کی باتوں پر ہمیں خوب ہلکی ہلکی مگر ڈرکھوں دور تھا۔ البتہ اس کے حالات جان کر افسردہ ضرور ہوئے۔ اب باری تھی تو جوان کی اس کچھ لکڑیاں آگ میں ڈالی پھر گویا ہوا۔

”میں کرکٹ کا مشہور کھلاڑی تھا کرکٹ کی سے میری طرز زندگی خاصی خوشحال تھی اور مگر بلا بھی خوشگوار تھے کھیل کود کو ہی میں نے اپنی زندگی مقصد بنایا تھا والد ایک سیاست دان تھے جو کرناٹک الگ ہمارے لئے دولت اکٹھی کر رہے تھے، والدہ ایک این جی او کی سربراہ تھیں والدین کی مصروفیات کی وجہ سے میرے لئے ٹائم کم تھا، تو کرکٹ میں کافی کمائی ہو رہی تھی لیکن جب بازی شروع کر دی گئی تھی میری توپا نیچوں اٹھیاں لگی تھیں میرے لئے دولت ہی سب کچھ تھی وطن

بھاری کر کے دوسری ٹیم کو ہوتا جان بوجھ کر کوکٹ ہر آؤٹ ہوتا اور بدلے میں بھاری دولت جوا کے ذریعے کماتا تو میرا مقصد حیات تھا۔

دین سے دوری کی وجہ سے دل تنگ آلود ہو گیا تھا پھر اچانک ایک دن دل کا دورہ پڑا اور والد صاحب اور میری بے پناہ دولت بھی مجھے بچا نہیں سکی اور جوانی کے عالم میں ہی خالی ہاتھ دنیا سے آنا پڑا اور اب یہاں آپ کو اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنے کی تلقین بھی کر رہا ہوں اور ڈرانے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔“

کرکٹ کی کہانی سن کر ہم لوگ کافی دیر خاموش رہے۔

رات اپنے پچھلے حصے میں داخل ہو چکی تھی۔ گناہ

اسٹیشن کی دیرانی قابل دید تھی، اب میری باری تھی۔

”تو دوستو! میری کہانی بھی زیادہ طویل نہیں ہے، میں ایک بے روزگار نو جوان تھا جو ایم اے کی ڈگری ہوتے ہوئے بھی نوکری کی تلاش میں دردر بھٹکتا رہتا تھا، مگر سفارش، پرچی اور رشوت کے بغیر نوکری کی نمائندہ میرے دل کے اندر ہی دفن ہو گئی۔ اور ایک دن حد ہوئی پھر روزگاری کی وجہ سے میری سبکدوشی مجھے چھوڑ گئی اور رشتے سے انکار کر دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ ایک ادیب ضرور ہوں میں سے اس کا بغیر ہوا اور بعد ازاں آخر شادی ہوئی بدل گیا، اسے دولت تو بہت ملی لیکن عزت.....؟“

وہ پرس میں اسے بھی پرس کے طور پر چلانے والا وہ ہائی سوسائٹی کال گرل بین بچی تھی شکر ہے میں اس عورت سے بچ گیا بے روزگار ہوا تو کیا ہوا، عزت کسی میں نے حالات کا کافی دنوں تک مقابلہ کیا مگر اب کچھ تھا، ملکی حالات ٹھیک نہیں تھے، سیاست کا رد بار بچی تھی، مہنگائی کسٹروں سے باہر تھی فاشی و عریانی دور دور تھا، لوگ درندے بن گئے تھے۔ معصوم بچے بچوں سے زیادتی و قتل کے واقعات عام ہو چکے تھے ہاف کا برنڈہ اڑ کر جنگوں میں چلا گیا تھا۔

آخر تک ایک بے روزگار ایسے حالات کا اہلہ کرتا، آخر کار شہر کے ایک مشہور چوک پر انٹرویو

سے ناکام واپسی پر میرا ایکسپرنٹ ہو گیا اور بے روزگاری سے ہمیشہ نجات مل گئی لوگوں نے مجھے اسپتال پہنچایا لیکن بہت دیر ہو گئی تھی۔

”ایک رات کی بات بتاؤ دوستو! لوگوں کے لئے تو وہ ایک ایکسپرنٹ تھا لیکن حقیقت میں وہ ایکسپرنٹ نہیں بلکہ خوش فہمی تھی..... ہاں میں نے خود شی کی تھی اور جان بوجھ کر گاڑی کے سامنے آ گیا تھا لیکن اب مجھے پچھتاوا ہوتا ہے، کاش میں نے ایسا نہیں کیا ہوتا اور زندگی جیسی نعمت کی قدر کی ہوتی۔“

میری کہانی نے سب کو رلا دیا تھا۔ رات ابھی باقی تھی ایک سایہ ہماری طرف آتا دکھائی دیا، وہ کافی عمر رسیدہ اور لاغر تھا اس نے باری باری ہم سب کو دیکھا اور ہمارے ساتھ بیٹھ گیا، ہمارے پوچھے بغیر ہی خود وہ بول پڑا۔

”میں سامنے والے ریلوے اسٹیشن کا چوکیدار ہوں، کافی سردی لگ رہی تھی سوچا آپ لوگوں کے ساتھ آگ سیٹک لوں، ویسے رات کو یہاں گاڑی نہیں آتی، عمر بیت گئی اس بچا کی تنگداری کرتے، لیکن آج تک میں نے کسی ٹرین پر سفر نہیں کیا! کیا آپ لوگ بھی ٹرین کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں؟“

ہمیں خاموش پا کر وہ خود ہی بولا۔ ”میں بھی کتنا بھولا ہوں جو مسافروں سے اس طرح کے سوال پوچھ رہا ہوں.....“

اچانک ایک ٹرین نمودار ہوئی لیکن اس کی ہولناک آواز سے ہماری روح تک کانپ گئی، جیسے کوئی زلزلہ ہو، پتھروں کی بارش ہو، ٹرین صدیوں پرانی معلوم ہو رہی تھی وہ عین ہمارے سامنے آ کر رکی اور باری باری ہم سارے لوگ اس پر سوار ہوئے، وہ طلسماتی ٹرین ایک جانب قایم ہو گئی۔

صبح گاؤں والوں کو بوڑھا چوکیدار ریلوے اسٹیشن کی انتظار گاہ میں اپنی چار پائی پر مردہ حالت میں ملا۔



نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لہانے میں اپنی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش جسم و جان کو انگشت بندنا کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لہولہان کھلتی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتا طاری کر دے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چمکنازنی گھٹا ٹپ اندھیرے میں جھم لینے والی کہانی

ایک چور راج کماری نے اور دوسرا چنڈ شرمیم نے سنبھال لیا۔ اور کشتی کو لے کر چٹان سے آگے نکلے اب جنگلی لوگوں کی کشتیاں دائرہ بنا کر چکر لگاتی تھیں جو پانی انہوں نے ان کی کشتی کو آتے دیکھا تو وہ فوراً ایک طرف ہٹ گئے اب شرمیم کو خیال آیا کہ کیوں نہ ان لوگوں سے کھانے پینے کی چیزیں حاصل کی جائیں اس نے راج کماری کو پوری طرح سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ان جنگلی لوگوں کو کہو کہ وہ جزیرے پر چلیں۔“

”میں تو ان کی زبان نہیں جانتی۔“
”تم اشاروں سے کام لو اور بولنا تمہارے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔ بات ہرگز نہ کرنا۔“
راج کماری نے کمال کی اداکاری شروع کر دی وہ کشتی میں کھڑی ہو گئی اور اپنا ہاتھ اپنے منہ کے قریب لے جا کر کچھ اس قسم کا اشارہ کیا کہ وہ پانی پینا چاہتی ہے اتنا سنا تھا کہ سارے جنگلی اپنی اپنی کشتیاں لے کر راج کماری کی کشتی کے قریب آ گئے پھر انہوں نے راج کماری کی کشتی کو اپنی کشتی کے ساتھ ساتھ نزدیک رکھا۔ اور بار بار اپنی کشتی میں جھک کر اسے پیچھے ہٹنے دے اپنے جزیرے کی طرف بڑھے جزیرہ وہاں سے میں میل کے فیصلے پر تھا یہ بڑا سبز اور شاداب جزیرہ تھا۔

راج کماری اور شرمیم کشتی سے اتر کر کنارے کے ریت پر کھڑے ہو گئے جنگلی لوگوں کو شرمیم دکھائی نہیں دے رہا تھا انہوں نے راج کماری کے آگے گے چلنا شروع کر دیا اور دیوی کے نعرے لگانے شروع کر دیے جزیرے کے دوسرے جنگلی بھی نکل آئے اور دیوی کا نام سن کر وہیں جھک گئے۔ راج کماری بڑی ٹھانڈ سے گردن اکڑا کر پل ریتی تھی شرمیم بھی اس کے ساتھ تھا راج کماری کی خدمت میں پھل اور دودھ پیش کئے گئے جسے راج کماری نے بڑے شوق سے کھایا اور پیا، جنگلیوں کا ایک مکار جادوگر بڑے حد سے راج کماری کو دلہ رہا تھا اسے شک ہوا کہ یہ کوئی انسان ہے اور جنگلی لوگوں کو بے وقوف بناتی ہے اس نے تیز ہچکال کر کہا۔ ”یہ دیوی نہیں ہے بلکہ کوئی عام عورت ہے۔ اور ہمیں الوبتا رہتی ہے۔“
شرمیم نے راج کماری کے کان میں کہا۔ ”گھبرا جائیں میں اس کو سنبھال لوں گا پھر وہ مکار جادوگر بڑا اگر یہ دیوی ہوگی تو اس پر میرے حملے کا کوئی اثر ہوگا۔۔۔۔۔ اگر یہ جھوٹی عورت ہے تو میرا نیزہ اس کے پیٹ کے آ پار ہوگا۔“ سب جنگلی چپ ہو گئے جیسے ان ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی ہو۔
راج کماری گھبرا رہی تھی کیونکہ وہ اس پر تیز ہچکال

کے لئے بالکل تیار تھا۔ شریم بھی چوکس ہو گیا تھا اس نے راج کمار کے کان میں سرکشی کی اپنی جگہ سے مت ہلنا میں اس کو اس گستاخی کا مزہ چکھانے جا رہا ہوں..... اور شریم لپک کر جاوگر کے پیچھے آ گیا۔ اس نے نیزہ اوپر اٹھایا تھا کہ شریم نے اس کی گردن پر اتنی زور سے اچھل کر لات ماری کہ وہ چیخ کر مرنے کے بل گرا اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا اور وہ وہیں مر گیا۔ پھر شریم نے نیزہ اٹھا کر اس کے پیٹ میں گاڑ دیا یہ بھیا تک منظر دیکھ کر جنگی دم بخود ہو کر رہ گئے پھر انہوں نے اس قدر بلند آواز میں دیوی زندہ باد کا نعرہ لگایا کہ سارا جنگل گونج اٹھا۔

دو روز راج کمار نے دیوی بن کر جزیرے کے جنگلی لوگوں کی مہمان نوازی کا مزہ اٹھایا تیسرے روز راج کمار نے انہیں اشاروں میں بتایا کہ وہ آسمان پر جا رہی ہے۔ جنگلیوں کے ذریعہ اور کیلوں کے پتھروں سے بھری ہوئی ایک بڑی کشتی راج کمار کی کشتی کے ساتھ دی سے باندھ دی۔ راج کمار کی کشتی میں سوار ہوئی شریم پہلے ہی اس میں بیٹھ چکا تھا۔ جنگلی لوگ اونچی آواز میں اپنے بچپن گانے گئے شریم ہنس رہا تھا۔ راج کمار خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ وہ ان آدم خور وحشیوں کے درمیان سے صحیح سالم واپس جا رہی ہے۔ جنگلی جزیرے سے کافی دور تک راج کمار کے ساتھ آئے اور اس کی کشتی خود کھینچتے رہے پھر جب کشتی کھلے سمندر میں آگئی تو راج کمار نے شریم سے کہا۔

”ان الوڈں سے کوکاب دفع ہو جاؤ۔“ راج کمار نے ہاتھ سے اشارہ کر کے ان کو واپس جانے کو کہا۔ جنگلی اپنی اپنی کشتیوں میں ادب سے جھک گئے۔ اور پھر نعرے بلند کرتے واپس اپنے جزیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

راج کمار نے سکھ کا سانس لیا۔ اور ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خشک کر کے بولی۔ ”شریم بھائی تم کشتی میں ہوتاں۔“

”ہاں تمہارے ساتھ ہوں۔“ شریم نے جواب دیا۔ اچھا ہوا کہ ان سے چچا چھوٹ گیا شریم نے کہا۔

”اب ایسا کرتے ہیں کہ کچھ پھل اور ناریل اپنی کشتی میں رکھ لیتے ہیں اور اس کشتی کو ہمیں سمندر میں چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ دی سے بندھی ہوئی یہ پھلوں سے بھری کشتی طوفان میں ہمیں بھی لے ڈوبے گی۔“ انہوں نے تصور سے بہت پھل اور ناریل اپنی کشتی میں رکھ کر دوسری کشتی کو کھول کر سمندر کی وسیع لہروں کے حوالے کر دیا کچھ دور تک وہ کشتی انہیں نظر آتی رہی پھر سمندر کی بڑی بڑی موجوں کی اوٹ میں کھو گئی اب ان کا ایک اور سمندری سفر شروع ہو گیا تھا۔

شریم نے کہا۔ ”تم بخت ان جنگلیوں کی زبان ہماری سمجھ سے باہر کی زبان سے پوچھتے کہ یہاں سے قریبی ملک کا ساحل کتنی دور ہے؟“

پھر شریم نے راج کمار سے پوچھا۔ ”کہ وہ کچھ حساب لگا کر بتا سکتی ہے۔“

راج کمار نے آسمان پر جھکتی دھوپ اور نیلے سمندر میں چاروں طرف دیکھا اور کہا۔ ”میرے حساب کے مطابق ہماری کشتی مشرق کی طرف جا رہی ہے اور ہمارا ملک ہندوستان اسی طرف ہے۔“ شریم نے سر کو جھٹک کر کہا۔

”یہ تو تم نے پہلے ہی بتایا تھا اور ہم آتش فشاں پہاڑوں میں پھنس گئے تھے۔ خدا کے لئے اب کوئی اس قسم کی پیش گوئی نہ کرنا۔“ سارا دن ان کی کشتی لہروں پر اپنے آپ بہتی رہی۔

کھلے سمندر میں پہنچ کر شریم کو دور ایک گولی کی شے سمندر سے ابھرتی اور پھر ڈوبتی دکھائی دی۔ شریم نے سمجھا کہ شاید اس کا وہم ہو۔ راج کمار اپنے ماں باپ کی یاد میں اداس ہوئی شریم اس کی ڈھارس بندھا رہا تھا۔

اچانک دور دورہ ہی گولی چیز ایک بار پھر سمندر میں سے باہر نکلی شریم راج کمار سے بولا۔

”یہ کیا شے ہے راج کمار۔“ راج کمار اس گولی شے کو غور سے دیکھنے لگی دھوپ سمندر میں تہک رہی تھی لیکن ابھرتی ہوئی شے کا کافی فاصلے پر بھی راج

کمار ڈر گئی۔

”بھگوان کے لئے کشتی کا رخ موڑو۔ یہ کوئی بڑی خطرناک بلا لگتی ہے۔“ جسے شریم غور سے دیکھ رہا تھا۔

سمندر سے ابھرتی گولی کی چیز اب زیادہ بڑی ہوئی تھی مگر صاف پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ کیا چیز ہے کوئی ویل پھلی ہے کہ سمندری عفریت ہے۔ شریم نے کشتی کا رخ دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن لہروں کا رخ اچانک اس ابھرتی ہوئی بلا کی طرف ہو گیا۔ کشتی سمندری عفریت کی طرف تیز تیز جا رہی تھی راج کمار نے گھبرا کر کہا۔

”ہم مصیبت میں پھنس گئے ہیں شریم بھائی۔“

شریم نے کہا۔ ”حوصلہ مت ہارو راج کمار! ہم مصیبت کا مقابلہ کریں گے۔“ شریم کی نگاہیں ابھرتی ہوئی بلا پر لگی ہوئی تھیں کشتی اس کے قریب جا رہی تھی یہ بلا اس سیاہ چٹان کی طرح سمندر کی لہروں سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہی تھی کیا سمندر میں کوئی نیا جزیرہ نمودار ہو رہا تھا یا پھر اس لاکھ سال پہلے کا کوئی سمندری عفریت سمندر سے باہر نکل رہا تھا۔

شریم کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا وہ پریشان ضرور تھا کیونکہ اگر یہ کوئی عفریت ہوتی تو پھر اس سے چھٹکارا مشکل تھا چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا وہیں شریم کیا کر سکتا تھا ابھرنے والی بلا اب کچھ کچھ نظر آنے لگی تھی۔

اچانک شریم کا پٹ اٹھا اس بلا کے سر پر کالے گالے لمبے بال تھے جو سمندر کی لہروں کے ساتھ لڑا رہے تھے۔ پھر اس بلا کا سر موجوں سے اوپر ہو گیا اس کے ساتھ ہی عفریت نے اپنا سر باہر نکال لیا وہ ایک بہت بڑا سر تھا جس کی آنکھیں بڑے بڑے سرخ لہروں کی طرح باہر کو ابھری ہوئی تھیں اور لمبے لمبے ہاتھ ہاتھی کے دانٹوں سے بھی زیادہ لمبے تھے یہ کوئی بلا جتنا بڑا جن یاد یو تھا جس کے دونوں بازو بہت لمبے تھے اور سمندر کی موجوں پر تیر رہے تھے۔ اس سمندری ریت کو دیکھ کر راج کمار نے ایک چیخ ماری اور کشتی

میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ سمندری عفریت نے پورا منہ کھولا اور ایک ایسی چٹھاڑ کی آواز اس کے حلق سے نکلی کہ اس کے دھماکے سے سمندر میں طوفان آ گیا۔

بڑی بڑی موجیں اٹھ کر سمندری عفریت کے پہاڑ جیسے جسم سے نکلنے لگیں ایک موج نے شریم کی کشتی کو نیچے سے اوپر اچھال دیا کشتی الٹ گئی اور شریم راج کمار سمیت سمندر میں گر پڑا۔ شریم نے سمندر میں آنکھیں کھول کر دیکھا وہ سمندر کی تہ میں آگئی ہوئی جھاڑیوں میں ابھی ہوئی تھی اس نے راج کمار کو بھی ایک جھاڑی میں پھنسنے دیکھا شریم لپک کر اُدھر گیا اور اس نے راج کمار کو جھاڑیوں سے بچھ لیا وہ اسے اوپر اٹھائے پانی میں اوپر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

سمندر کے پانی کا دباؤ اسے اوپر نہیں آنے دے رہا تھا۔

راج کمار غوطے کھا رہی تھی شریم اپنے جسم کی ساری طاقت لگا کر راج کمار کو سمندر کی سطح پر لے آیا اس نے سمندر کے نیچے سمندری عفریت کی بڑی بڑی ٹانگیں دیکھیں جو اس سے ٹھوڑے ہی فاصلے پر تھیں اس نے راج کمار کا منہ موجوں کے اوپر کر دیا تاکہ وہ سانس لے سکے سمندر سے باہر آ گئے ہی اس نے دیکھا کہ وہ سمندری عفریت سے زیادہ دور نہیں بلکہ وہ اس کے قریب اور شریم راج کمار کی ٹوٹی ہوئی کشتی کے ایک بڑے سے ٹکڑے کو پکڑ کر چپانے کی کوشش کر رہا تھا وہ بار بار دھاڑ رہا تھا جس نے سمندر میں ایک دہشت پھیل کر رکھی تھی۔

شریم نے راج کمار کو کندھے سے پکڑ رکھا تھا جو نبی وہ سمندر کے اوپر آیا ایک بہت بڑی لہر نے اسے پیچھے سے اٹھایا اور بہا کر کافی دور لے گئی عفریت اب اس سے کافی دور چلا گیا تھا شریم نے راج کمار کی طرف دیکھا وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

شریم اسے لے کر سمندر میں تیرنا شروع کر دیا اس کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ کہیں کوئی چٹان بھی دکھائی نہ دے رہی تھی۔ راج کمار کو ساتھ لے کر

تیرا مشکل ہو رہا تھا وہ اسے لے کر اڑھکی جاتا تو ایک فرلانگ اڑنے کے بعد اسے دوبارہ سمندر میں اترنا پڑتا شرمیم نے محسوس کیا کہ راج کماری کو لے کر اگر وہ اسی طرح تیرتا رہا تو وہ جسم میں پانی بھر جانے سے مر جائے گی کیونکہ سمندر کی بڑی بڑی لہریں شرمیم کو تیرنے نہیں دے رہی تھیں پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور سمندری لہروں پر تیرتا چلا گیا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کس طرف جا رہا تھا اور یہ لہریں اسے کہاں لے جائے گی۔ بہت دور تیرنے کے بعد شرمیم کی طاقت بھی جواب دینے لگی وہ تھک گیا اس کے ہاتھ ہلکے پڑ گئے اور بے ہوش راج کماری اس کے ہاتھوں سے نیچے گرنے لگی۔ شرمیم گھبرا گیا۔ وہ خود تو ایک روح تھا اور مر نہیں سکتا تھا اگر وہ تیرنا چھوڑ بھی دیتا تو سمندر کی لہروں پر بے حس و حرکت لیٹ کر بھی زندہ رہ سکتا تھا مگر سب سے زیادہ پریشانی اسے راج کماری کی طرف سے تھی وہ راج کماری کو ہر حالت میں زندہ رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات اسے ناممکن نظر آ رہی تھی راج کماری کے پیٹ میں سمندر کا کچھ پانی چلا گیا تھا اور وہ اس طرح بے ہوش تھی سمندری موجیں ان دونوں کو بہت دور لے آئی تھی۔ شرمیم نے اپنے سامنے راج کماری کو موت کے قریب دیکھا تو اس نے خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا ہماری مدد دعا کے ملتے ہی شرمیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر کے نیچے اس کے پاؤں کی ٹھوس شے سے لگ گئے ہیں اس سخت شے میں تھوڑی تھوڑی تری بھی تھی وہ حیران ہوا کہ اتنے گہرے سمندر میں یہ کیوں کی چیز ہے جس پر اس کے دونوں پیر تک گئے ہیں کیا یہ کوئی سمندری چٹان تھی اس نے سوچا لیکن ایسا بھی نہیں تھا اگر چٹان ہوتی تو وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوتا۔ اور یہ وجود شرمیم کو اپنے سر پر اٹھائے سمندر میں آگے کو جا رہا تھا۔ پھر یہ کیا تھا شرمیم نے پہلا کام تو یہ کیا کہ راج کماری کو سمندر میں سے نکال کر اپنے کندھے پر اٹھا لیا اس کے پاؤں چونکہ سمندر کے اندر کسی مضبوطی شے پر تکیے ہوئے تھے اس لئے وہ بے فکر ہو گیا لیکن وہ ضرور چاہتا تھا کہ اس

کے پاؤں کے نیچے یہ کیوں سی چیز ہے جو اسے لے کر آگے ہی آگے جا رہی ہے۔

شرمیم نے دیکھا کہ سمندر میں وہ شے ایک خاص سمت کی طرف سفر کر رہی تھی پھر اس شے نے ہیولے ہیولے سمندر میں اوپر کو ابھرتا شروع کر دیا شرمیم نے راج کماری کو اپنے کندھے پر ڈال رکھا تھا وہ شے پانی سے باہر آنے لگی ہوتے ہوتے وہ سمندر سے بالکل باہر آ گئی اور شرمیم نے نیچے جھک کر دیکھا چاہا کہ وہ کون سی چیز ہے کہ جس نے ان دونوں کو اٹھا رکھا ہے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ سمندر میں منہ بھری کر رہی ہے۔

جونی شرمیم کی نظریں اپنے پاؤں پر مچی تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک سات منہ والے ایک بہت بڑے اژدھانے کے چمن کے اوپر کھڑا ہے اور اژدھا سانپ اسے لے کر سکون سے لہروں کو چیرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اچانک شرمیم کو نامن کا خیال آ گیا کہیں یہ نامن تو نہیں۔ شرمیم نے نامن کو آواز دی۔ ”نامن بہن کیا یہ تم ہو۔“ اور اس کے ساتھ ہی شرمیم نے بے ہوش راج کماری کو اس اژدھا سانپ کے چمن کے اوپر لٹا دیا۔ وہاں اتنی جگہ تھی کہ شرمیم خود بھی لیٹ سکتا تھا یہ بہت بڑا اژدھا تھا۔ اژدھانے اپنی زبان میں جیسے شرمیم سمجھتا تھا جواب دیا۔ ”مجھے بھی نامن ہی سمجھو بھائی شرمیم۔“

”کیا تم واقعی نامن ہو۔ تمہاری آواز کیوں بدل ہوئی ہے۔“ شرمیم کے اس سوال پر اژدھانے کہا۔

”شرمیم بھائی میں نامن نہیں ہوں مگر نامن کا دوست ہوں۔ اور میرا نام سمندر کا شیش ناگ ہے۔ اتفاق سے میں اس سمندر کے نیچے سے گزر رہا تھا تو مجھے تمہاری آواز سنائی دی میں تمہاری طرف بڑھا تو مجھے تمہارے جسم اور کپڑوں سے اپنے پرانے اور بہترین ساتھی نامن کی خوشبو آئی اسی وقت میں نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔“

”یہ بتاؤ کہ تم نامن کو جانتے ہو.....؟“

شرمیم نے کہا۔ ”کیوں نہیں وہ تو میری بہن ہے۔ اور ابھی اس سمندر میں میرے ساتھ تھی کہ آتش فشاں پہاڑ کے پھٹ جانے سے وہ مجھ سے پھرتی مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس حال میں ہے اور کہاں ہے..... میں اور نامن راج کماری کو اس کے ماں باپ کے پاس ہندوستان لے کر جا رہے تھے۔“

”کیا نامن سمندر میں نہیں ہے۔“ اژدھانے کہا۔ ”نہیں شرمیم نامن اس سمندر میں کہیں بھی نہیں ہے اگر وہ ہوتی تو مجھے سمندر کی ایک ایک لہر آ کر بتا دیتی پھر نہ جانے وہ کہاں جا چکی ہے وہ سمندر سے نکل کر ضرور کسی جزیرے یا کسی ساحلی ملک میں پہنچ گئی ہوگی اگر سمندر میں ہوتی تو میں ضرور تمہیں بتا دیتا۔“

شرمیم کہنے لگا۔ ”کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ ہمارا دوسرا بھائی شاہان کہاں ہے۔“ اژدھے نے کہا۔ ”شاہان کا نام سن کر مجھے خوشی ہوئی آج سے کئی سال پہلے ایک دریا میں میرا نامن سے تعارف کرایا تھا مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ کہ شاہان اس وقت کہاں ہوگا..... ایسا کچھ معلوم کرنا میری طاقت سے باہر ہے کیا وہ بھی اس ہم میں تمہارے ساتھ تھا۔“

”ہاں وہ ہمارے ساتھ تھا۔ لیکن یہ بہت پہلے کی بات ہے اصل میں ہمیں اس سفر میں کئی نئی مہموں سے واسطہ پڑتا ہے اور کئی مصیبت میں پھنسے ہوئے لوگ ملتے ہیں جن کی ہم کی مدد کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہم پھر روانہ ہوتے ہیں۔ راج کماری کو بھی ہم بہت بڑی مصیبت سے نکال کر اس کے ماں باپ کے گھر لے جا رہے ہیں۔ اس کا باپ ایک ریاست کا راجہ ہے۔“ اژدھا خاموشی سے شرمیم کی باتیں سنتا رہا۔ وہ برابر سمندر میں آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا شرمیم نے بات ختم کی تو وہ کہنے لگا۔

”شرمیم بھائی میں تم تینوں کی لمبی اور مصیبتوں سے بھری ہوئی آبِ ہیتی سے اچھی طرح واقف ہوں

کاش میں تمہاری اس سے زیادہ مدد کر سکتا۔ کیونکہ ابھی میری زندگی کے صرف تین سو سال ہی گزرے ہیں دو سو سال اور گزر جانے کے بعد میں بھی نامن کی طرح جو چاہے شکل بدل سکتا ہوں۔ لیکن ابھی میں تمہارے لئے صرف اور صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ میں تمہیں اس سمندر سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پہنچا سکتا ہوں۔“

راج کماری اسی طرح اژدھے کے اوپر بے ہوش پڑی تھی۔ اژدھانے کہا۔

”کیا میں اس راج کماری کو ہوش میں لے آؤں۔“ شرمیم نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ اگر اس وقت ہوش میں آگئی تو شاید تمہیں، میرا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو ایک اژدھے کے اوپر لیٹے دیکھ کر پھر بے ہوش ہو جائے گی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ کسی جگہ زمین پر پہنچنے کے بعد ہوش میں لایا جائے۔“

”اچھا خیال ہے۔“ اژدھانے کہا۔ شرمیم نے اس سے پوچھا۔ ”اس طرح زیادہ دیر بے ہوش رہنے سے وہ مرنے نہیں جائے گی۔“ اس کے جواب میں اژدھانے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہوگا راج کماری کے بدن میں جو پانی داخل ہوا تھا وہ میرے سر کی گرمی کی وجہ سے خشک ہو چکا ہوگا زمین پر اترنے کے بعد میں تمہیں ایک مہرہ دوں گا وہ مہرہ راج کماری کے گلے میں باندھ دیتا پھر اسے کچھ نہ ہوگا اور اس پر زہریلے سے زہریلے سانپ کا بھی اثر نہ ہوگا۔“

شرمیم نے پوچھا۔ ”لیکن یہاں ارد گرد زمین کہاں ہے.....؟“

اژدھانے پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو؟“ شرمیم کہنے لگا۔

”ہمیں ہندوستان جانا ہے جیسا کہ میں نے پہلے تمہیں بتایا ہے کہ میں راج کماری کو اس کے راجہ باپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔“

اژدھا ہلا۔ ”شرمیم بھائی فکر نہ کرو ہندوستان کا

سائل یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔“ وہ چہرے پر اسی طرح مسکندہ میں اڑھدھاکے پھن پر لیٹ کر تیرتے رہے اور تیرے پھر کے قریب دور زمین کے سائل کی کالی لکیر نظر آنا شروع ہوئی اڑھدھانے شرم سے کہا۔

نہیں کر سکتا تھا۔“
اڑدھانے لگا۔ ”شریتم تاگن کے بھائی ہو۔
اس حساب سے تم میرے بھی بھائی ہو۔ اور بھائیوں کی
معیت میں مدد کرنا میری بھائی کا فرض ہوتا ہے کاش میں
اس سے زیادہ تمہاری مدد کر سکتا۔ اگر مجھے زمین پر بسر
کرتے پورے پانچ سو برس ہو چکے ہوتے تو اس وقت
میں تمہاری اور بھی مدد کر سکتا تھا پر ابھی میری عمر کے
دو سو سال باقی ہیں۔“

”وہ کھیلے ہوئے بولی۔
 ”دیکھیں ہم اس سمندری عفريت سے بچ کر کیسے
 “شریم نے ہنس کر کہا۔
 ”جیسے ایک دوسرا سمندری عفريت، یہاں تک
 “زان کماری نے بہم کر پوچھا۔
 ”وہ کہاں ہے؟“ شریم نے اسے حوصلہ دیتے
 کہا۔

ہور ہاتھا۔ پہلے شریمن نے سوچا تھا کہ وہ رات سمندر کے کنارے کی ریت پر ہی بسر کریں اور اگلے روز دن کی روشنی میں جنگل کا سفر شروع کریں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ کہ وہ ہر قسم کی مشکل کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس لئے وقت ضائع کرنے کے بجائے یہی بہتر ہے کہ سفر جاری رکھا جائے تاکہ وہ جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچ سکے۔ انہوں نے کچھ فاصلہ سمندر کے ساحل پر جنگل کے ساتھ ساتھ طے کیا۔ پھر سورج کے حساب سے جنگل کے اندر جاتی ایک پیڈلری برا کئے۔

یہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا..... بس ایک گھنٹہ ٹی سی بی تھی جس میں اگی ہوئی لمبی گھاس یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اس پر سے بہت کم کوئی گزرتا ہے یہاں جانوروں کے پاؤں کے بھی نشان نہ تھے ٹیلے کا موڑ موم کر شرمیم سامنے آیا تو اسے ایک چشمہ نظر آیا جو ٹیلے کے پتھروں سے نکل کر وادی میں جا رہا تھا۔ راج کمار نے چشمے کے پانی سے اپنی پیاس بجھائی یہاں جنگلی بیروں کے بہت درخت تھے۔ شرمیم نے راج کمار کو کبیر توڑ کر دیئے جو اس نے بڑی مشکل سے کھائے۔ مخلوں میں رہنے والی راج کمار نے ہمالیہ اس طرح کے کھنے جنگلی پھر کھائے ہوں کے لیکن مجبور تھی جب انسان پر کوئی ہماری مصیبت آتی ہے تو سب کچھ کرتا پڑتا ہے۔

”میرا خیال ہے کہ اسی جگہ رات بسر کرتے ہیں۔“ شرمیم نے کہا۔
راج کمار درختوں کو دیکھ کر بولی۔ ”بھتر ہوگا کہ ہم کسی درخت پر بھرا کریں کیونکہ زمین پر رات کو جنگلی درندوں کا خطرہ ہوگا۔ اور ہمارے پاس تو ایک چھوٹا سا چاقو بھی نہیں۔“ ان کے پاس واقعی کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن شرمیم کو اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا۔ اور خدا پر بھروسہ تھا وہ ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

کہنے لگا۔ ”تم کسی درخت پر چڑھ جاؤ میں یہاں زمین پر ہی رہوں گا۔“ اس پر راج کمار نے بڑی بہادری سے کہا۔ ”اگر تم زمین پر رہو گے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گی درخت پر سانپوں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔“

”ٹھیک ہے آؤ مل کر اچھی سی جگہ بنا لیں۔“ انہوں نے چشمے کے پاس ہی ایک جگہ سے پتھر صاف کئے ادھر ادھر سے خشک گھاس اور گھرے پڑے پتے لاکر دو بستر تیار کئے اور ان پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ شام کے سائے جنگل میں اترا آئے تھے خاموشی اور زیادہ گہری ہو گئی تھی درختوں کے نیچے اندھیرا دھیرے دھیرے پھیلنے لگا تھا اور پھر رات آگئی چاروں

طرف تاریکی کا راج ہو گیا جنگل سنسان ہو گیا درختوں پر بھرا کرنے والے پرندے بھی خاموش ہو گئے اس خاموشی میں صرف چشمے کا پانی کے بہنے کی آواز آرہی تھی۔ راج کمار دل میں خوف سا محسوس کر رہی تھی مگر اوپر سے وہ ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے کوئی خوف نہ ہو۔

شرمیم اس کے دل کا حال جانتا تھا اور اس کی حفاظت کا عہدہ کئے ہوئے تھا۔ راج کمار کو اس کی بھی زیادہ تہائی اور خوف محسوس ہو رہا تھا کہ شرمیم ایک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ صرف اس کی آواز سن سکتی تھی۔

”شرمیم بھائی کیا تم مجھے نظر نہیں آ سکتے؟“ شرمیم ہنس پڑا۔ ”کاش ایسا کرنا میرے اختیار میں ہوتا میں مجبور ہوں راج کمار کی خدا جانے وہ وہ کب آئے گا جب میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک دوسرے کو نظر آ سکوں گا۔“ راج کمار نے کمال جواب نہ دیا پھر خاموشی چھا گئی اس خاموشی سے اس بھر سے خوف ہونے لگا وہ چاہتی تھی کہ شرمیم اس باتیں کرنے۔ شرمیم بھی اب بولنے بولنے تھک گیا تھا اس نے راج کمار سے کہا۔

”سونے کی کوشش کرو بہن اور ڈرو نہیں تمہارے پاس ہی بیٹھا ہوں میں سوؤں گا نہیں تمہارا پہرہ دوں گا۔“

راج کمار نے کہا۔ ”تم باتیں کرتے ہو ہمارے سونے کی کوشش کرتی ہوں۔“ راج کمار نے اسے بند کر لیں اسے شرمیم کی آواز برابر آرہی تھی وہ مصر کی ہزاروں سال پرانی کوئی کہانی سن رہا تھا پر غنودگی طاری ہونے لگی اور پھر وہ سو گئی۔

ضرورت پیش نہ آئی تھی مگر وہ کبھی کبھی شوقیہ سوچا تھا کمال کی بات تھی کہ سو سے میں اسے کی چیز کی برائی تھی اور اسے کوئی خواب بھی نہ آتا تھا آخری پ شرمیم نے کافی پہلے دیکھا تھا بھر حال راج کمار کی نیند سو رہی تھی اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سن سکتی تھی۔

شرمیم خوش ہو گیا اس نے بھی ایک پتھر سے ٹیک لیا اپنی آنکھیں بند کر لیں خدا جانے کیا بات ہوئی شرمیم کی بھی آکھ لگی مگر حالانکہ وہ اس قسم کے بات میں کبھی نہ سوچا تھا لیکن قسمت میں جو ہونا تھا وہ ہو کر رہتا تھا شرمیم گھاس پر راج کمار سے پانچ کی دوری پر دوسری طرف منہ کے سر ہاتھ دھو سوتے کبھی کو بھی نظر نہ آ سکتا تھا لیکن جہاں وہ سو رہا تھا اسے خشک گھاس اور پتے دب گئے تھے یہ کوئی بے میں غور سے دیکھتا تو اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ یہاں سو رہا ہے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر نیند کی دنیا بونے تھے۔

رات خاموش اور سنسان تھی جنگل کے درختوں کیوں سے اور زیادہ ڈراؤنا بنادیا تھا سوائے چشمے کے پانی کے وہاں اور کوئی آواز نہیں تھی پھر اچانک راتوں میں کوئی جنگلی پرندہ پھر پھرا جیسے وہاں کے نیچے سے کوئی شیر یا چیتا گزرا ہو کیونکہ وہ پر آدمی رات کو ہی اپنے شکار کی تلاش میں جنگل میں بہت دور کسی باغی کے بولنے کی آواز اس کے بعد پھر گہرا سنا جھا گیا۔ چند لمحوں کے بعد سب کے درختوں پر کوئی الو بول کر چپ ہو گیا زیادہ ڈراؤنی ہو گئی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ یہ کیا تھی کبھی کبھہ خبر نہ تھی۔

جنوبی ہند کے ایک پراسرار قبیلے کے دو جنگلی رات کو انسانی بو یا کرا دھر کو بڑے آ رہے جنوبی ہند کے گئے جنگلوں کا سب سے بدنام تھا یہ لوگ نہ صرف یہ کہ انسانی گوشت بڑے

شوق سے کھاتے تھے بلکہ انسان کا سر کاٹ کر اسے سکیڑ کر لٹی کے سر جھٹا بنانے کا فن بھی جانتے تھے۔ انسانی سر کاٹ کر یہ پندرہ دن اس پر کوئی ایسا عمل کرتے کہ کتا ہوا انسانی سر کی کھوپڑی ناک منہ اور کان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہوتے ملی کے سر جھٹی ہو جاتی پھر وہ انسانی سر کو اپنی جھوپڑی کے باہر لٹکاتے اور ان کا سردار اپنے گلے میں انسانی سگری ہوئی کھوپڑی کا ہار بھی شوق سے پہنتا تھا۔

دونوں جنگلی انسان کی تلاش میں ساحل سمندر کی طرف جا رہے تھے جہاں کوئی نہ کوئی ماہی گیر انہیں مل جاتا تھا اور وہ اسے پکڑ کر لے جاتے تھے پہلے اس کا سر کاٹتے اور پھر اس کا گوشت اُبال کر کھاتے۔

اچانک چلتے چلتے انہیں ہوا میں انسانی بو محسوس ہوئی جنگلوں میں ہی ساری زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کے ناک بڑی تیز ہو گئی تھی اور یہ بڑی دور سے انسان کی بو سونگھ لیتے تھے انہوں نے کافی دور سے راج کمار اور شرمیم کے جسم کی بو سونگھ لی تھی اور وہ خوشوار درندوں کی طرح جھاڑیوں اور ندی نالوں پر سے ہوتے ہوئے اس چشمے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں راج کمار اور شرمیم گہری نیند سو رہے تھے۔

جنگلیوں نے اپنے ہاتھوں میں لمبے نیزے تھام رکھے تھے کاندھے پر تیر کمان لٹکے ہوئے تھے ان کے تیر زہر بھرے تھے اور نشانہ ایسا کہ اڑتی چڑیا کو مارا کر لیتے تھے۔

جب انسانی بو زیادہ تیز ہو گئی تو دونوں جنگلی ریک ریک کر چلے گئے۔ آخر وہ جھاڑیوں میں سے اس جگہ نکل آئے، جہاں چشمے کے پاس خشک پتوں پر انہوں نے ایک عورت کو لیٹے ہوئے دیکھا اگرچہ وہاں اندھیرا تھا مگر ان کی آنکھیں الووں کی طرح اندھیرے میں ہر چیز کو دیکھ لیتی تھی سوئی ہوئی راج کمار کی کو دیکھ کر ان کی آنکھیں خوشی سے جھپکنے لگیں ہونٹ پھیل گئے اور لمبے لمبے زرد دانت باہر نکل آئے جب کوئی عورت مل جاتی ہے تو ان کے ہاں بڑی خوشی کی

جاتی ہے۔

اب وہ آہستہ آہستہ سوئی ہوئی راج کمار کی طرف بڑھنے لگے راج کمار ہلکے ہلکے ہندے خراٹے لے رہی تھی اس سے ذرا ہٹ کر شریم سورہا تھا مگر شریم ان جھگیوں کو دکھائی نہ دے رہا تھا وہ جیتے کی طرح اپنی تھوکتیاں زمین کے ساتھ لگائے۔ ریتھتے ہوئے راج کمار کے سر کے اوپر آگئے۔

ایک جھگی نے اپنے ہاتھ میں کسی بوٹی کے رس کو اچھی طرح رگڑا اور پھر اپنا ہاتھ راج کمار کے منہ پر رکھ کر زور سے دبا یا راج کمار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی مگر چونکہ اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا اس لئے وہ کوئی آواز نہ نکال سکی جو جی اس نے ہانک کے ذریعے سانس لی اس کے پیچھروں میں ایک بڑی ہی تیز تا گوار بوہمی جس کی وجہ سے اسے زبردست چکڑ آ گیا۔ راج کمار کی آواز نکالے بغیر بے ہوش ہو گئی۔

وحشی سے اسے تھکٹ کر ایک طرف لے گئے انہیں کسی دوسرے انسان کی بو امی تک آ رہی تھی اشاروں اشاروں میں ایک وحشی نے دوسرے سے پوچھا۔

”یہ کس انسان کی بو ہے اور وہ انسان کہاں ہے“

”دوسرے نے اشاروں ہی اشاروں کہا۔“
”وہ یہاں تو کسی دوسرے انسان کو نہیں دیکھ رہا مگر ان کے ہانک جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے شریم ان سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر کھاس کے پتوں پر سو رہا تھا مگر وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے جب انہیں وہاں کوئی دوسرا انسان دکھائی نہ دیا تو وہ بے ہوش راج کمار کو کندھے پر ڈال کر جنگل میں گم ہو گئے۔

جنگل آگے جا کر اتنا گھٹان ہو گیا تھا کہ آدھی اس کے اندر بڑی مشکل سے چلتا تھا سانپ اس جنگل میں جگہ جگہ تھے اور درختوں کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے مگر وحشیوں کو سانپ پکڑنے میں بڑی مہارت حاصل تھی یہ سانپ کو لپک کر پکڑتے اور اس کی گردن کاٹ کر پھینک دیتے اور باقی جسم مولی کی طرح بڑے شوق

سے کھا جاتے سانپ بھی شاید اپنے دشمنوں کو پہچانتے گئے تھے وہ بھی ان وحشیوں کے جنگلی اور گندے بالوں بھرے جسم سے اٹھنے والی تیز بو کو فوراً محسوس کر لیا کرتے تھے اور جہاں سے یہ گزرتے وہاں سے بھاگ جاتے تھے۔

دونوں وحشی گھٹان جنگل کے گہرے اندر گئے۔ میں یوں آسانی سے جھاڑیوں میں گزرتے چلے گئے جیسے وہ کسی شہر کی گلیوں میں سے گزر رہے ہوں جنگل میں ایک جگہ پہاڑی ٹیلے کی سرنگ آگئی۔

دونوں اس سرنگ میں داخل ہو گئے اس سرنگ میں گہرا اندھیرا تھا اور کونوں سے سانپوں کی سبٹوں اور وحشیوں کی پھنکاروں کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن دونوں وحشی بے فکر ہو کر چلے جا رہے تھے ہاں تو وحشی توڑی دیر بعد وہ منہ سے سنی کی ایک عجیب سی آواز نکلاتے جس کے بعد سانپوں اور وحشیوں کی آوازیں بند ہو جاتی تھیں سرنگ آگے جا کر ایک اور جنگل میں آگئی یہاں اچانک ایک بہت بڑا رینگھٹان کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا دونوں وحشی رک گئے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ایک وحشی راج کمار کی کوزمین پر لٹا ہوا پھر دونوں تیر کمان لے کر زمین پر گھٹنا رکھ کر انہیں باندھنے لگے۔ رینگھٹان زور سے غرایا اور ان کی طرف بھاگے۔

انہوں نے زہریلے تیر اس کی طرف چلا دیے دونوں رینگھٹان کی گردن میں آ کر کھڑے تو رینگھٹان کی گردن میں داخل ہو گیا یہ زہر اس قدر خوف ناک اور تیز تھا کہ منہ کے بل گر پڑا اور ٹپ ٹپ کر اسی وقت ٹھنڈا ہوا۔

دونوں وحشی راج کمار کو اٹھا کر دوبارہ جنگل میں داخل ہو گئے وہ ایک ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگے نیچے دو ایک جگہ درختوں کے جھنڈ میں آگے والا درخت تھا اور شعلوں کی روشنی میں وہاں کے درختوں کے تنے چمک رہے تھے یہاں ان خود بخود آواز سننے لگا قبیلہ رہتا تھا انہوں نے الاؤ کے پاس جاتے ہی الاؤ ہو کر منہ سے ایک خاص قسم کی آواز نکالی اور آواز تنک چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں سے مردادہ

استعمالِ لکھنوی۔۔۔۔۔ کامیابی کا راستہ

پیشانیوں سے چھٹکارہ ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

شادی کرنی ہو یا کروانی ہو	جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح	اولاد کا نہ ہو یا ہو کر مر جانا
گھر بونا چاقی	کاروباری بندش
جنات کا سایہ	دیگر مسائل

سید فرمان شاہ کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کا علم جو بکڑے کام بنائے

سرال میں بھوسہ کی آنکھ کا تار این سکتی ہے ہر کام 100% رازداری کے ساتھ

کلام الہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویذ سے آپ کی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فن کا پر آپ کے مسائل کا حل ایک فن کا پر

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فن کا حل کی دوری پر موجود ہوں فن ملائیے اور آزما لیجیے ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیوں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔ نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فن کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس میں عمل نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

سید فرمان شاہ

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جائیا کرتی ہیں

ہر مشکل کا حل بذریعہ موسکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہو اور ہر عامل کا کام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل وہ جس علم سات سمندر پار چلے کالے وسطی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاندان سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فن کا ل نے ہماری زندگی بدل دی

زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنیوں کی بے رخی سے دیکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

میں آپ سے ایک فن کا حل کی دوری پر موجود ہوں فن ملائیے اور آزما لیجیے ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیوں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔ نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فن کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس میں عمل نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

سید فرمان شاہ

0300-6484398

شور مچاتے باہر نکل آئے انہوں نے راج کماری کو دیکھا تو خوشی سے تاجپے لگے۔

سردار بھی اپنی جمونپڑی سے سر پر سینگوں والا تاج پہنے باہر نکل آیا سب وحشی خاموش ہو کر جھک گئے سردار نے بے ہوش راج کماری کے منہ پر ایک خاص قسم کی دوائی چھڑکی تو تھوڑی ہی دیر میں راج کماری کو ہوش آ گیا اس نے جو آگ کی روشنی میں اپنے ارد گرد دیکھا وہ دیکھا تو خوف سے اس کے حلق سے چیخ نکلی۔

سردار نے راج کماری کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کی کھوپڑی پر ہاتھ پھیر کر اپنی زبان میں دیشیوں سے بولا۔

”یہ کھوپڑی نرم سی ایک ہفتے میں سڑ جائے گی۔“ راج کماری نے اپنے بال چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں راج کی بیٹی ہوں مجھے چھوڑ دو۔“ کوئی بھی وحشی اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا انہوں نے راج کماری کی چیخ پکار کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔

”پہلے میں اس کے ساتھ شادی کروں گا پھر اس کا سر کاٹ کر اپنے گٹے میں ڈال لوں گا۔“ سردار نے کہا۔ ”کل رات ہماری شادی ہوئی پرسوں میں خود اس کی گردن کاٹوں گا اور اس نیز پر رکھ کر آگ میں بھونوں گا۔“

یہ سن کر وحشی نعرے لگا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے وہ روٹی ہوئی راج کماری کو اٹھا کر لے گئے اور ایک برگد کے گھنے درخت کے نیچے بنے ہوئے جھونپڑے میں جا کر قید کر دیا چار وحشی جمونپڑی کے ارد گرد پہرہ دے رہے تھے راج کماری جھونپڑی میں جاتے ہی سسکیاں بھر کر رونے لگی اسے شرم اور اپنے ماں باپ کی یاد آگئی اور وہ غم سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی لیکن وہاں اس کے آنسوؤں میں ترس کھانے والا کوئی بھی نہیں تھا تھک ہار کر وہ گھاس پر شرم بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

دوسری طرف اچانک ہی شرم کی آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا کہ راج کماری وہاں سے غائب ہے پہلے تو وہ سمجھا کہ راج کماری شاید جتنے پرانی پینے کے لئے گئی ہوئی اٹھ کر اس نے جتنے پر بھی دیکھا وہاں بھی وہ نہیں تھی شرم نے ارد گرد ساری جنگل میں راج کماری کو تلاش کیا اسے آوازیں دیں مگر سوائے لودوں کی آواز کے کسی نے بھی جواب نہ دیا۔

الو بھی شرم کو شاید یہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وحشی راج کماری کو پکڑ کر لے گئے ہیں لیکن شرم الو کی زبان نہیں سمجھتا مگر تاکن جانوروں کی بولی سمجھ لیتی تھی لیکن تاکن تو شرم سے ہزاروں میل دور پر نکلی جہاں پر پڑتال کی طرف سفر کر رہی تھی اور شاہان بے چارہ ابھی تک سمندر کے بیچ میں پہاڑ کی چوٹی والے پراسرار تھاب پوشوں کے نکل کے تہہ خانے کے کنوئیں میں پڑا ہوا ہر نکلے کی تدبیر سوچ رہا تھا اور غار کا بے ہوش جسم اسی تہہ خانے کے کونے میں رکھے ایک تابوت میں بند تھا۔

اور شرم بہت پریشان تھا۔ راج کماری کا اچانک غائب ہو جانا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ ”کہیں اسے کوئی درندہ اٹھا کر نہ لے گیا ہو لیکن اگر درندہ اٹھا کر لے جاتا تو راج کماری ضرور چیخ مارتی اور شرم جاگ پڑتا یہ اتنی خاموشی اور اس پراسرار طریقے سے اسے کون اغوا کر کے لے جاسکتا ہے۔“

جنگل میں اندھیرا ہو گیا تھا اور آسمان پر چاند نکل آیا تھا جس کی روشنی شاخوں کے پتوں سے چھن کر زمین پر پڑ رہی تھی اس روشنی میں شرم نے دیکھا کہ جن پتوں پر راج کماری لیٹی ہوئی تھی وہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اور کہیں کہیں سے روندے گئے تھے شرم بہت ڈوبن تھا اس کی نظروں سے ایسے واقعات گزر چکے تھے وہ سمجھ گیا کہ یہاں کے جنگلی لوگ رات کو آ کر سو جاتی ہوئی راج کماری کو اٹھا کر لے گئے اور انہوں نے ضرور راج کماری کو کسی جنگلی بوٹی کی دوائی سونگھا کر پہلے بے ہوش کیا ہوگا شرم نے گھاس پر وحشی آدمیوں کے پاؤں

کے نشان بھی دیکھ لئے تھے وہ ان نشانوں کے تعاقب میں اس طرف روانہ ہو گیا۔

شرم اندازے سے آگے بڑھ رہا تھا کیونکہ گھاس پر جنگلوں کے پتروں کے نشان اب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

شرم اگرچہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کے وجود کو جنگلی جانور اور کبوترے کورے بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

شرم جنگل میں آگے ہی آگے چلا گیا کافی آگے جا کر ایک بہت بڑا ڈوہا اس کے راستے کے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا شرم اس کے قریب سے ہو کر گزرنے لگا تو خدا جانے اڈھے ہو کر کپے محسوس ہوا کہ کوئی انسان اس کے پاس سے گزر رہا ہے اڈھے نے زور سے پھونک کر ماری اور اس کے منہ سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔

شرم نے اڈھے کو کچھ بھی نہ کہا اور آگے کو روانہ ہو گیا آگے جا کر ایک ٹیلا آگیا جس کے نیچے ایک سرنگ کا منہ کھلا ہوا تھا شرم وہاں کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ وہ سرنگ کے اندر جائے یا ٹیلے کی دوسری طرف سے ہو کر نکل جائے اس کے دماغ نے اہم فیصلہ کیا۔

اور وہ سرنگ کے اندر داخل ہو گیا انسان کی نیت نیک ہو اور دل میں دوسرے انسانوں کی بھلائی کا خیال ہو تو اللہ پاک دل میں نیک اور صحیح خیال ڈال کر رہنمائی کرتا ہے۔

ایسا ہی شرم کے ساتھ ہوا کیونکہ اس کا بھی دل صاف تھا اور نیت نیکی کی تھی وہ بغیر کسی غرض کے راج کماری کی مدد کر رہا تھا اگر کوئی خیال تھا تو صرف انسانی ہمدردی کا۔

سرنگ میں اندھیرا تھا لیکن شرم ایسے کئی اندھیری سرنگوں سے گزر چکا تھا یہ سرنگ اس کے لئے کوئی نئی سرنگ نہ تھی وہ آگے بڑھتا چلا گیا اندھیرے میں کافی دیر چلنے کے بعد شرم نے سرنگ میں روشنی کا دھندلا سا دھبہ دیکھا جو کہ کافی بڑا ہوتا چلا گیا یہاں

سرنگ ختم ہو جاتی تھی اس سے آگے نیلے کے پار دیشیوں کی بستی تھیں۔

راج کماری بھی وہاں ہی قید تھی یہاں پہنچتے پہنچتے پوچھنے لگی اور آسان پر نیلی نیلی روشنی بھیلی ہوئی تھی شرم کو ابھی تک کوئی جنگلی بستی نظر نہیں آئی تھی وہ کچھ ناامید سا ہو گیا تھا کہ شاید وہ غلط طرف نکل آیا ہے اور اسے جنگل میں دوسری طرف جانا چاہئے تھا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں کالے رینگھ نے دیشیوں پر حملہ کیا تھا اور رینگھ ان کے تیر کھا کر مر گیا تھا اس جگہ رینگھ کی لاش پڑی تھی جس پر لاکھوں چوہیاں رینگھ کی تھیں شرم رینگھ کے پاس سے ہٹ کر آگے گز گیا یہاں اس سے غلطی ہو گئی بجائے اس کے کہ وہ سامنے والے درختوں سے ہو کر ٹیلے کی طرف جاتا تو مرے ہوئے رینگھ کی لاش کے پہلو سے ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ جدھر سے پانی کے چشمے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی اس کا خیال تھا کہ جہاں چشمہ ہوگا وہاں دیشیوں کی آبادی ضرور ہوگی اس طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں ضرور کھڑی تھیں جن کی دیواروں پر گہری سبز اور سیاہ کافی جی ہوئی تھی۔

صبح کی ہلکی روشنی نے جنگل کے اندھیرے کو دور کر دیا تھا جنگل کی ہر چیز نظر آنے لگی تھی۔

شرم ایک چشمے پر آ کر رک گیا اور جسے وہ چشمہ سمجھ رہا تھا وہ ایک چٹان کی دراڑ تھی جس کے اندر سے پانی کے قطرے نیچے چھوٹے تالاب میں گر رہے تھے۔

شرم نے ایک جمہری جمہری سی لی اور ایک پتھر پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کہیں وہ غلط سمت کو نہیں نکل آیا۔

اسنے میں اسے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی جھاڑیوں میں سے گزر کر اس چٹان کی طرف آ رہا ہو جس کے پاس وہ بیٹھا ہوا تھا اس نے جھاڑیوں کی طرف دیکھا تو ایک جگہ جھاڑیاں ہل رہی تھی کوئی ادھر کوئی آ رہا تھا شرم کو تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا ویسے تو شرم کو تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا وہ اسی جگہ بیٹھا رہا اسنے میں جھاڑی سے ایک وحشی باہر کھا شرم

نے اسے دیکھا۔

اب اس کی ہمت بندی کہ راج کماری کا پتہ چل جائے گا وہ اس جنگلی کا پیچھا کرے گا راج کماری ضرور ان جنگلیوں کی قید میں ہوگی شرم غور سے وحشی کو کھینکے لگا وحشی چٹان والے پانی کی طرف آ رہا تھا شاید وہ پانی پینے آیا تھا۔

اتنے میں اچانک شیر کی دھاڑ گونجی تو وحشی جہاں تھا وہیں کا وہیں کھڑا ہو گیا شرم بھی چونکنا ہو گیا شیر تالاب پر پانی پینے آ رہا تھا وحشی نے پیچھے ہٹ کر ایک درخت کی آڑ لی اور تیز سے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی اتنے میں ایک دھاری دھار شیر درختوں میں سے نکلا اور تالاب پر آ کر گر گیا۔

فناء میں شیر نے بھی انسانوں کی بو سونگ لی تھی۔ شیر نے خطرہ محسوس کر لیا تھا وحشی نے یہاں ایک زبردست حماقت کی کہ تیز لے کر درخت کی آڑ سے باہر نکل آیا اور شیر کو لٹکرایا اس کی بہادری بھی تھی شیر نے جو اپنے پیچھے ایک نوجوان کی لٹکائی تو پلٹ کر دیکھا۔

اور وہ دھاڑ اور سٹ کر جو اس نے چلائی لگائی تو سیدھا وحشی کے اوپر جا کر اور وحشی کو دیوچ لیا اس کی کھوپڑی کو دانتوں سے چبا ڈالا لیکن وحشی کا تیز بھی شیر کا کام کر چکا تھا تیز شیر کے پیٹ میں پیوست ہو کر دوسری طرف سے آ رہا ہو گیا تھا تھوڑی دیر بعد دونوں نے دم توڑ دیا شرم اس خوبی تکمیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور اس قسم کا بہادرانہ کھیل اسے بہت پسند تھا۔

شرم اپنی جگہ سے اٹھا اور اس طرف روانہ ہو گیا جدھر سے وحشی آیا تھا اس کا خیال تھا کہ وحشیوں کی جمہوریت اسی طرف ہوگی لیکن یہ بھی اس کی بھول تھی جنگل کے وہ جس راستے پر چلا جا رہا تھا وہ ایک بہت ہی چالاک جادوگر کے غار کی طرف جاتا تھا اس جادوگر کا نام گوتا تھا وہ جادو کے زور سے آدمی کو پتھر کا بنا دیتا جانور بنا دیتا تھا وہ روحوں کو آتے جاتے دیکھ لیتا تھا اس وقت گوتا اپنے غار کے باہر آگم جلائے ہوئے

اور آنکھیں بند کئے کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔

شرم جنگل میں چلتے چلتے جب اس غار کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک کالا کلوٹا بن ماس قسم کا آدمی جو کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا سر پر سرخ کے پروں کا تاج پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔

شرم نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ اس آدمی نے راج کماری کو غار میں چھپا رکھا ہوگا شرم اس آدمی کی طرف بڑھا کہ اس آدمی کے پیچھے سے ہو کر غار کے اندر جائے اور راج کماری اگر وہاں ہو تو ساتھ لے آئے۔

شرم درختوں کے پیچھے سے نکل کر غار کے سامنے آیا تو جادوگر کو فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ کوئی غیبی روح ہے اور سوائے اس کے اور کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے بھی جادو کے ضرور سے اسے دیکھا تھا۔ جادوگر نے اب ایک چال چلی وہ چپکے سے بغیر کوئی حرکت کئے آگم کے پاس بیٹھا رہا۔

جیسے اس نے شرم کو دیکھا ہی نہیں۔ شرم برے مزے اور بے لگاری سے ہاتھوں کے پاس سے گزر کر غار کے اندر چلا گیا۔ غار کے اندر جادوگر کی کا سامان بڑا ہوا تھا لوکاں سر انسانی کھوپڑی کو لے کر کوچہ شیر کے پیچھے اور پیچھے کے ناخن اور ہڈیوں کی مالائیں وہ سمجھ گیا کہ یہ شخص کوئی جنگلی جادوگر ہے۔ اور اپنے جھوٹ موٹ کے جادو سے جنگلی لوگوں پر اثر ڈال کر ان سے کھانے پینے کی چیز ایشہ لیتا ہوگا۔ راج کماری غار کے اندر نہیں تھی شرم باہر آ گیا۔

ناگوا آگم کے پاس آکر بیٹھا خالی آنکھوں سے شرم کو دیکھ رہا تھا۔ شرم کچھ دیر غار کے پاس کھڑا جنگل کی طرف دیکھتا رہا وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اب کس طرف جائے اور راج کماری کو تلاش کرے دن ڈھل رہا تھا اور شام سر پر آ رہی تھی اسے معلوم تھا کہ رات اگر سر پر آگئی تو پھر اتنے گھنے جنگل میں راج کماری کو تلاش کرنا مشکل کام تھا۔ ناگوا نے تھیلے میں سے کچھ ہڈیوں کے ٹکڑے نکال کر اپنے سامنے زمین پر پھینکے جیسے وہ کوئی قال نکال رہا ہو ہڈیوں کے زمین پر گرنے

کی آواز سن کر شرم ناگوا کے قریب آ گیا۔

اس وقت ناگوا زمین پر گر کر ہونی ہڈیوں کو تک رہا تھا پھر اس نے وہ ہڈیاں اٹھائیں۔ تھوڑی دیر بعد چار ہڈیاں اور اٹھائیں شرم کو شرارت سوچی اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر زمین پر سے باقی ہڈیاں اٹھائیں یہاں اس کے ہاتھ میں جاتے غائب ہو گئیں وہ گمراہ ہاتھ ناگوا کو شرم کو اپنے پاس بیٹھا صاف دیکھ رہا تھا اس طرح سے من تھا جیسے وہ شرم کو نہیں دیکھ رہا شرم کی خوش تھا کہ اس نے ناگوا کو پریشان کیا ہے۔ شرم نے ہڈیوں ہڈیاں دوبارہ زمین پر گرادیں، ناگوا نہیں اٹھانے کو شرم نے جھٹ ہاتھ بڑھا کر ہڈیوں کو غائب کر دیا کی کا خیال تھا کہ ناگوا حیرت سے تنگ رہ جائے گا مگر اس جیسے کوئی اثر نہ ہوا۔ شرم کو تعجب ہوا کہ اس شخص ہڈیوں کے اچانک غائب ہونے پر اثر کیوں نہیں ہوا شرم ہاتھ میں یہ ہڈیاں تھا سے یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ہونے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ شرم کو دیکھ رہا ہو شرم گھبرا گیا ناگوا نے کہا۔ ”میری ہڈیاں واپس کر دو۔“ تو شرم کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

کتنے ہی سالوں کے بعد یہ موقع آیا تھا کہ کسی نے شرم کو دیکھ لیا تھا اس نے جھٹ ہڈیاں ناگوا کے کچے پھینک دیں اور حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا..... کہا مجھے دیکھ رہے ہو.....“

”کیوں نہیں تم ایک سانولے اور خوب صورت کے ہو اور تمہارے کپڑے آج سے کافی برس پہلے کے لے کے ہیں تمہارا نام کیا ہے۔“ اب تو شرم پریشان کیا۔ اسے ایک دم خیال آیا کہ کہیں اس پر جادو کا تم تو نہیں ہو گیا کہ اب ایسا تو نہیں ہے کہ اب ہر کوئی دیکھے گا اس نے ناگوا سے کہا۔ ”تم نے مجھے کیسے الیامیر نام شرم ہے۔“

ناگوا نے کہا۔ ”میں اس علاقے کا سب سے بڑا درگاہوں میرے اس جادو کی اتنی طاقت ہے کہ میں ہوسوت بدروح اور ڈاکو کو دیکھ سکتا ہوں۔“ شرم ناگوا ذرا دور ہٹ گیا اب وہ وہاں سے بھاگ

جانا چاہتا تھا کیونکہ نظر آنے کے بعد وہ ایک عام اور کمزور لڑکا بن گیا تھا۔

اور اسے ناگوا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ناگوا نے شرم کو کھینکے ہوئے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

”شرم تم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے۔ میرے جادو نے تمہارے سب راستے بند کر دیے ہیں۔ تمہارے اندر اب پہلے والی طاقت نہیں رہی۔ تم اب عام کمزور لڑکے بن چکے ہو اس لئے بہتر یہی ہے کہ جس طرح میں کہتا ہوں دیے ہی کرو۔“ شرم نے اپنے اور گردن گاہ ڈالی تو اسے ایسا لگا جیسے اس کے چاروں طرف درختوں کو آگم لگی ہو اور وہ اس آگم میں سے باہر نہیں نکل سکتا تھا وہ اپنے آپ کو پہلی بار مجبور محسوس کرنے لگا۔ ناگوا نے کہا۔

”میرے ساتھ اس غار کے اندر چلو۔“ شرم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“

ناگوا بڑی مکاری سے بولا۔ اس کے لیڑھے دانت آگم کی روشنی میں چمکنے لگے۔ ”یہ ایک راز ہے اور یہ راز میں تمہیں غار کے اندر جا کر بتا دوں گا ایک بات یاد رکھنا تم اب یہاں سے بھاگ نہیں سکتے اگر تم نے مجھ سے کی کوشش کی تو وہ آگم جو تمہیں جنگل کے درختوں پر نظر آ رہی ہے وہ تمہیں جلا کر رکھ کر دے گی یہ میرے جادو کی آگم ہے اور اس کا وار بھی خالی نہ گیا بولوب تم کیا کہتے ہوں۔“ شرم نے ہتھیار پھینک دیئے وہ ناگوا کے کھینچنے میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ اسے جنگل کی طرف سے آگم کے شعلے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔ اس نے جھٹ کہا۔

”تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گا میں تمہارے غار میں جا رہا ہوں اور شرم سر جکائے ایک بے بس قیدی کی طرح غار کے اندر چلا گیا۔

غار میں جہاں جادوگر کا سامان رکھا تھا۔ وہاں ایک دیباہل رہا تھا اس کی روشنی بھی ایک اور راڈنی تھی کھوپڑیوں کے سائے سامنے دیوار پر پڑ رہے تھے۔ اس کے پیچھے ناگوا بھی غار کے اندر آ گیا۔ اس

نے آتے ہی چہرے کے چپوڑے پر سے ایک کھوپڑی اٹھا کر اس کے اندر بیٹھے ہوئے کٹڑے کو باہر نکالا اور اسے ہوا میں شریم کی طرف اچھال دیا کٹڑے نے جھکی جیسی تیزی کے ساتھ فرش سے لے کر چھت تک شریم کے آگے ایک جالا بن دیا ناگو نے کٹڑے کو پکڑ کر اپنی کھوپڑی میں ڈالا اور شریم کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اسے تم کٹڑے کا کزور جالا مت سمجھنا یہ اتنا مضبوط ہے کہ اگر ساری رات سارا دن اس پر کھوار کا وار کرتے رہو تو یہاں سے نکل کر باہر نہیں جاسکتے۔ یہ جال لوہے کی تاروں سے بھی مضبوط ہے۔“ شریم نے تار کو ہاتھ لگایا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس نے فولاد کے موٹے تاروں پر ہاتھ لگا رہا ہو۔

جال اپنی جگہ پر فولاد کا جھنگہ بن کر اس کے سامنے آن گرا تھا اور وہ اس کے اندر قید ہو کر رہ گیا تھا۔ شریم پہلے مکا مار کر ہاتھی کی گردن کو ڈوباتا تھا لیکن اس کے جسم میں وہ اب طاقت نہ رہی تھی وہ اب اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا اس نے زچ ہو کر ناگو سے کہا۔

”آخر تم نے مجھے یہاں کیوں قید کر لیا ہے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“ ناگو نے کہا۔

”ابھی بتاتا ہوں پھر وہ انسانی کھوپڑی کو اٹھا کر اس پر آنکھیں بند کر کے کوئی مہتر پڑھتا رہا۔ مہتر بڑھ کر کھوپڑی میں پرچھونک ماری تو وہ کھوپڑی ہڈیوں کا پورا ڈھانچہ بن گئی اس ڈھانچے کے ہاتھ میں تکی ٹکڑا تھی۔ اور وہ فولاد کی جال کے آگے کھڑا ہو کر پھر دینے لگا ناگو نے ڈھانچے کو غم دیا۔

”اس لڑکے کی پیہرہ داری کرنا اگر اس نے کسی طریقے سے بھاگنے کی کوشش کی تو اس کی گردن ایک پل کے اندر اندر تار دینا۔“ ہڈیوں کے ڈھانچے نے ہوا میں زور سے ٹکڑا لہرا کر اپنی سر کی کھوپڑی لہرائی۔ اور اس کے منہ کے سوراخ میں سے آواز آئی۔

”میں اس کی گردن کاٹ دوں گا۔۔۔۔۔ اور ڈھانچہ کھڑا کھڑا لگا۔ شریم ڈر گیا اتنی مدت بعد اسے کسی شے سے ڈر محسوس ہوا تھا وہ سچ سچ بہت کمزور

ہو گیا تھا ناگو نے شریم کے چہرے میں لوہے کی ایک زنجیر ڈال دی اور زنجیر کو پتھر میں جکڑ دیا۔ ”آخر تم مجھے کس لئے قید کر رہے ہو۔“ شریم نے تنگ آ کر پوچھا۔

”اس لئے کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“ ناگو مکاری سے چپا۔ شریم سر پکڑ کر پتھروں پر بیٹھ گیا خدا نے ضرور اس کے کسی بڑے بول کی سزا دی تھی اس نے دل ہی دل میں خداوند کریم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور دعا کی کہ وہ اسے پھر اس کی طاقت دے دے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس کی قسمت میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

ناگو نے کہا۔ ”شریم میں جادو گروں کے بادشاہ افراسیاب کا ایک طلسم کر رہا ہوں اس طلسم کی کامیابی کے بعد میں سارے افریقہ کے جن بھوت اور بدروحوں کا بادشاہ بن جاؤں گا۔ لیکن اس طلسم کی ایک شرط تھی جو مجھ سے پوری نہیں ہو رہی تھی کہ کسی ایسے لڑکے کا سر کاٹ کر میں اس کا خون کالی بلی کو پورے چاند کی رات کو پلاؤں جو لڑاؤں کو دکھائی نہ دیتا ہوں میں ایک عرت سے ایسے لڑکے کی تلاش میں تھا یہ تو اچھا ہوا کہ تم خود ہی غار میں آ گئے اب میں تمہیں ہرگز ہرگز نہ چھوڑوں گا اور! بعد پورے چاند کی رات ہے۔ اور میں اس رات کو تمہاری گردن کاٹ کر تمہارا خون کالی بلی کو پلاؤں گا۔

اور پھر سارے افریقہ کے جن بھوت اور بدروحیں میرے قبضے میں آ جائیں گی۔ اور ناگو کو مردہ انداز میں قہقہہ لگا کر شریم پر اشرام اس کی باتیں سن کر سمجھ گیا کہ یہ شخص اس کو زندہ نہ چھوڑے گا اب دنیا کی کوئی طاقت اسے اس ظالم انسان سے نہیں بچا سکتی اسے راج کماری کا خیال آ گیا کہ جانے وہ کس حال میں ہوگی اس نے ناگو سے کہا۔

”میں تمہارے قبضے میں آ گیا ہوں اب بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا کیا تم میری بہن راج کماری نے بارے میں بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟“ ناگو نے ہڈیاں پیچک کر زمین پر دو ٹکڑیں بنا دیں اور اپنی لال ال آنکھیں اٹھا کر بولا۔

”راج کماری اس وقت اس جگہ کے سب

بے خوف ناک وحشی قبیلے کے قبضے میں ہے اور وہ لوگ آج رات کے آخری حصے میں اس کا سر کاٹ کر اس کی کھوپڑی سیکڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“

شریم کانپ گیا۔۔۔۔۔ یا خدا وہ دونوں کس مصیبت کی محسوس کئے ہیں اس سے تو بہتر تھا کہ ہم ہندوستان کے اس ساحل پر نہ آتے یہاں آتے ہی دونوں کی جان غرے میں پڑتی ہے بلکہ اب تو یہ کہنا چاہئے کہ زندگی کے چراغ کی لوتھلٹا رہی ہے زندگی کوئی دم کی محتاج ہے۔ ناگو سے شریم نے کہا۔

”کیا تم میری بہن کی جان بچا سکتے ہو۔“ ناگو نے ذات نکال کر کہا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا کہ میں اپنے وحشی قبیلے کے سردار کے خلاف کوئی کام کیسے کر سکتا ہوں بلکہ میں تو تمہاری بہن کی ہڈیاں حاصل کر کے کاہر بنا کر گلے میں ڈالوں گا کیونکہ جوان لڑکی کی ہڈیاں اسے طلسم کو زیادہ طاقتور بناتی ہے۔۔۔۔۔“ شریم خاموش رہا اس شیطان سے انسانی ہمدردی کی امید کن فضول تھا شریم نے شاہان اور ناگوں کو بہت یاد کیا خدا جانے کہ وہ کہاں سے گئے ہیں کاش انہیں خبر ہو جائے کہ ان کا بھائی شریم کس جہت میں پھنس گیا ہے اور صرف دو دن کا مہمان ہے جسے چاند کی رات کو اس کا سر کاٹ دیا جائے گا اور اس کے بہتے لہو کو کالی بلی چاٹ دی ہوگی۔

رات ڈھل رہی تھی مگر رات کی خاموشی اور اندھیرا نے اس میں اس طرح چھایا ہوا تھا۔ لہر راج کماری پڑی میں قید تھی وہ جاگ رہی تھی اس کی جھوپڑی کے اردو وحشی چل پھر کہہ رہے تھے راج کماری کی باتوں کے سامنے کھڑی تھی آخر وہ راج کی بیٹی تھی اس نے اپنی خون کھول اٹھا اور اس نے زندگی بچانے کے آخری داؤ لگانے کا فیصلہ کر لیا مرنا تو تھا ہی اسے لڑکیوں نہ ایک بار فرار ہونے کی بھرپور کوشش کی جانے لگی مگر راج کماری کے لئے کوئی شے تھا جس میں جھکی عورت راج کماری کے لئے کوئی شے تھا جس میں جھکی عورت راج کماری کی طرف بڑھ رہی تھی جھکی عورت

راج کماری کی جھوپڑی میں داخل ہوئی اسے کسی نے نہ روکا راج کماری کی آج گردن اتار دی جانے والی تھی اور یہ جھکی عورت سردار کی جانب سے ایک رسم پوری کرنے آئی تھی جو کہ بہت ضروری تھی اس رسم میں ہلاک ہونے والی کھوپڑی لڑکی کے گلے میں لٹکے ہوئے والی رات کے پچھلے پہر سرخ گلاب کے پھولوں کی مالا پہنائی جاتی تھی آج راج کماری کے گلے کی رات بھی آج صبح اسے ہلاک کر دیا جانا تھا۔ چنانچہ سردار نے رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں ایک جھکی عورت کو گلاب کی مالا دے کر راج کماری کے پاس بھیجا تا کہ آخری رسم پوری کر سکے۔ جھکی عورت کو دیکھتے ہی راج کماری کے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا۔

اور اس نے اس خیال کو پورا کرنے کا اسی وقت فیصلہ کر لیا معلوم ہوا کہ جھکی عورت گولی ہے اور صرف غم کاغیس ہی بات کرتی ہے جھوپڑی میں اس وقت سوائے راج کماری اور اسی جھکی عورت کے اور کوئی نہیں تھا۔

جھکی عورت نے تھال میں سے گلاب کے پھولوں کا بار اٹھایا۔ اور آگے بڑھ کر راج کماری کے گلے میں ڈال دیا اور پھر غم کاغیس کے ہنسنے اور خوش ہونے لگی اور پھر اس نے ہاتھ سے اپنی گردن کی طرف ایسا اشارہ کیا جیسے چھری پھیر رہی ہو گویا راج کماری سے کہہ رہی تھی کہ صبح اس کی گردن کاٹ دی جائے گی اور کھوپڑی آگ میں ڈال کر چھوٹی کر دی جائے گی اور پھر خود بھی ہنس پڑی گویا راج کماری کی ہونے والی موت پر خوش ہو رہی ہو۔ راج کماری کے جسم میں خدا جانے کہاں سے یہ بھرتی یہ جرأت یہ طاقت آ گئی تھی شاید اس لئے بھی کہ جب چراغ بجھے والا ہوتا ہے تو بڑی زور سے بھڑکتا ہے راج کماری نے جھکی عورت کو اشارے سے قریب بلایا جب وہ قریب آئی تو جیسے کی طرح اچھل کر اس کی گردن کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اتنی مضبوطی سے دبوچ لیا کہ جھکی عورت کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہ نکل سکی یہ راج کماری چاہتی تھی

اگر ذرا سی بھی آواز نکل جاتی تو اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا تھا یہ اس کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا اس جنگلی عورت راج کمار کی کہاتوں کو اپنے ناخنوں سے نوچ رہی تھی لیکن راج کمار کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی ہونے کے بجائے اور زیادہ سخت ہو رہی تھی راج کمار تو جیسے زیادہ خوشوار شریف بن گئی تھی جنگلی عورت کا گلاب بند ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں اور ایک منٹ کے اندر اندر اس کا دل بھی بند ہو گیا یہ سارا کام ڈیڑھ منٹ میں ہو گیا تھا کوئی آواز نہیں نکلی تھی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی جو پوری کا دیا اسی طرح جل رہا تھا ہر اسی طرح وحشی پہرہ دے رہے تھے رات اسی طرح ڈھل رہی تھی ہر طرف ویسی ہی خاموشی تھی کسی کو معلوم تک نہ ہو سکا تھا کہ ان کے قہقہے کی ایک جنگلی عورت کم ہوئی ہے اور اس کی لاش جمو پڑی کے اندر پڑی ہے اور راج کمار بھی مہمانے کی کوشش کر رہی ہے راج کمار کی اسیم کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا اور بڑی کامیابی سے مکمل ہو گیا تھا اب اس کی اسیم کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا اس نے جلدی جلدی اپنے سارے کپڑے اتار کر کونے میں پھینک دیئے پھر جنگلی عورت کی لاش کے کمر کے گرد بندھی ہوئی کیلے کے پتے اتار کر اپنی کمر کے گرد باندھے اور اپنے گلے کا گلاب کا ہار اتار کر پھینک دیا جنگلی عورت کے گلے سے سٹکوں اور ہڈیوں کی مالا میں اتار کر اپنے گلے میں ڈالی مٹی کے دیئے کے نیچے سے کالک نکال کر اپنے جسم اور چہرے پر زرد زرد سے منلا جس سے راج کمار کا رنگ سیاہ ہو گیا سر کے بالوں کو نکمیر کر جنگلی عورت کے بالوں کی طرح بنایا۔ زمین پر سے مٹی اٹھا کر اپنے جسم پر ڈالی کچھ بالوں میں ڈالی گویا بالکل میلی پٹی کالی کلوی وحشی عورت بن گئی راج کمار کی اسیم کا اب سب سے آخری مرحلہ اور سب سے خطرناک مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ اس نے تھال اٹھا کر سر پر رکھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ جمو پڑی سے باہر آگئی چاروں پہرے دار رات کے کم ہوتے اندر میرے میں باری باری پہرہ

دے رہے تھے اور اس کے قریب سے گزرے کسی نے اس پر شک نہ کیا وہ یہی سمجھے کہ جنگلی عورت راج کمار کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر جینے موت کا ہار پہنا کر ایک ضروری رسم پوری کر کے واپس جا رہی ہے۔

راج کمار تھا اپنے سر پر اٹھا رکھی تھی اور جنگلی عورت کی طرح اٹھلا اٹھلا کر چلتی پہرہ دینے والے وحشیوں کے قریب سے گزری ایک ڈرا سی غلطی ایک ذرا سا غلط قدم اسی وقت اس کی موت کی وجہ بن سکتا تھا چاروں طرف سے خیر اور خیر سے اس کے جسم میں آ رہا ہو سکتے تھے لیکن راج کمار بہت حوصلے اور ہمت سے کام لے رہی تھی وہ ہر حالت میں زندہ رہنا چاہتی تھی اور اپنے ماں باپ سے ملنا چاہتی تھی ماں باپ کی محبت اور ان سے ملاقات کرنے کی شدید خواہش تھی اور اسی خواہش نے راج کمار کے جسم میں فولادی طاقت بھر دی تھی وہ درختوں کے نیچے سے واپس جا رہی تھی کہ ایک وحشی نے اسے چھیڑا اور ہنسا جنگلی عورت یعنی راج کمار نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہنسنے ہونے غوں غاں کیا اور بھاگ گئی وحشی ایک پل کے لئے برا حیران ہوا کہ اس عورت کو آج کیا ہو گیا ہے کیونکہ اس سے پہلے کبھی اس نے ایسی حرکت نہ کی تھی وہ جب بھی اسے چھیڑتا تھا وہ اس کے منہ پر ایک زبردست تھپڑ مارا کرتی تھی وحشی کا دماغ کچھ نہ سمجھ سکا اور اپنی راہ ہلایا راج کمار اب بڑے سردار کی جمو پڑی کے سامنے سے ہو کر گز رہی تھی جمو پڑی کے باہر دو وحشی تلواریں لئے پہرہ دے رہے تھے اندر میرے کی وجہ سے وہ راج کمار کو نہ پہچان سکے انہوں نے اسے جنگلی عورت ہی خیال کیا اور خاموش آنکھوں سے جنگل میں عورتوں کی جمو پڑیوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

راج کمار جمو پڑی سے نکل گئی آگے درختوں کا گھٹا جنگل شروع ہوتا تھا یہاں آ کر اس نے ایک طرف بے تحاشہ بھاگنا شروع کر دیا بھاگتے بھاگتے ان چڑھا یا درختوں میں سے دن کی روشنی چھن چھن کر اگلے میں آنے لگی راج کمار نے صرف کمر کے گرد کیلی

نہی لپیٹ رکھی تھی اسے کوئی دیکھتا تو یہ بھٹکا کہ جنگلی وحشی کی بیوی یا بہن جنگل میں جا رہی ہے اس کا سارا جسم کالا ہو رہا تھا بال نکھرے ہوئے تھے اور ان میں مٹی جی ہوئی تھی اب تو وہ یوں لگ رہی تھی جیسے جنگل میں بدروح چلی جا رہی ہوں راج کمار بھی بھاگتے بھاگتے چلتے چلتے اس جگہ پہنچ گئی جہاں شریم اور وہ سوئی ہوئی تھی اس نے دیکھا کہ شریم وہاں نہیں تھا خوشے کا پانی اسی طرح دراڑ میں سے نکل کر چھوٹے سے تالاب میں گر رہا تھا راج کمار نے وہاں سے ایک درخت کی شاخ اتار کر اسے اپنے جسم کے اوپر والے حصے پر لپیٹ لیا اور سوچا کہ یا اسے شریم کی تلاش میں جانا چاہئے لیکن اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ شریم کہاں اور کدھر گیا ہے وہاں رکتا ہوا ہی خطرناک تھا دن چڑھ آقا تھا اب کسی بھی وقت وحشیوں کو راج کمار کے فراک پتہ چل سکتا تھا اور وہ اس کی تلاش میں طوفان بن کر جنگل میں نکلے والے تھے۔

راج کمار نے اس طرف چلنا شروع کر دیا جس طرف سے وہ شریم کے ساتھ جنگل میں داخل ہوئی تھی وہ سمندر کے ساحل پر پہنچ کر چٹانوں کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف نکل جانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے راجہ باپ کی ریاست شمال کی طرف ہی تھی اگرچہ وہاں سے وہ ریاست کافی دور تھی لیکن راج کمار کی کھوپڑیاں پہننے والے وحشی کی دنیا سے دور نکل جانا چاہتی تھی بھاگتی چلی گئی جب تھک گئی تو ایک درخت کے نیچے گر کر اپنا سانس درست کیا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔

اور دن چڑھا تو جنگلی وحشیوں میں شور مچ گیا راج کمار کے کپڑے ان کی اپنی کوئی جنگلی عورت کی کے پاس پڑے تھے اور راج کمار کی غائب تھی وار کا غصے کے مارے برا حال ہو رہا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی شکار ان کے جنگل سے نکل بھاگا تھا اس نے اٹھا کر چیخ مار کر کہاں ”وہ جہاں کہیں بھی ہے اس کی رون کاٹ کر میرے پاس لے آؤ۔“

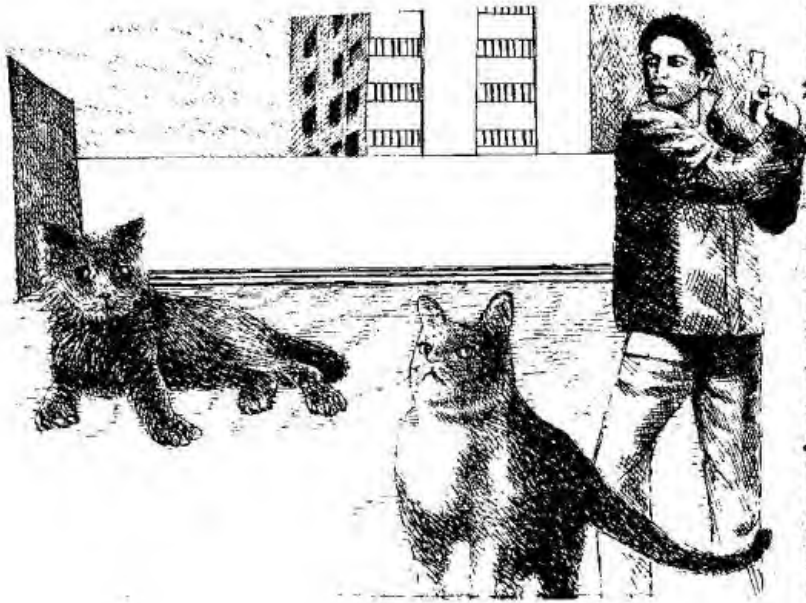
”وحشی نیزے لہراتے شور مچاتے جنگل میں راج کمار کی تلاش تلاش میں بھاگ لگے دس ایک

طرف، دس ایک طرف اور دس وحشی ایک طرف جنگل میں گھس کر کم ہو گئے راج کمار جنگل میں بھاگی جا رہی تھی سمندر کا ساحل اب قریب تھا وحشی بھی اس کے تعاقب میں دوڑے چلے آ رہے تھے دوسری طرف شریم بے بسی کی حالت میں اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔

اچانک اسے اپنی میٹھی کے اندر سینے کے ساتھ کسی سخت سی چیز کا احساس ہوا اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا کہ یہ کیا ہے اچانک امید کی ایک کرن اس کے چہرے پر روشن ہوئی کیونکہ یہ وہ سانپ کا مہرہ تھا جو اسے چھ منہ والے اڑدھے نے دیا تھا کہ مصیبت کے وقت تمہارے کام آئے گا شریم نے دیکھا کہ ناگوار کے باہر کڑا ہی میں سے ابلا ہوا بدبودار پانی نکال کر ایک منٹے میں ڈال رہا تھا پھر وہ منٹے لے کر شاید اسے کسی خفیہ جگہ رکھنے جنگل کی طرف چلا گیا اس کے جاتے ہی شریم نے سانپ کے مہرے کو گلے میں سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اے میری بہن ناگن کے دوست اڑدھا اگر تو میری آواز سن رہا ہے تو میری مدد کر میں ناگن دنوئی کا بھائی ہوں یا اسے میرے حال کی خبر کر یا تو میری جان بچا۔“

شریم مہرے کو ہتھیلی میں رکھنے غور سے دیکھ رہا تھا غار میں گہری خاموشی چھا گئی تھی کہ اچانک اس کی نظروں کے سامنے پھٹلی پر سانپ کا مہرہ ہلنے لگا ہلنے ہلنے مہرہ ایک دم سے الٹا ہو کر پھٹلی پر رک گیا اس کے ساتھ ہی شریم نے دیکھا کہ غار کے کونے میں اس کے سامنے وہی چھ منہ والا اڑدھا کھڑا ہے اڑدھا نے شریم سے کہا۔ ”شریم بھائی میں ناگن کا دوست ہوں تم ناگن کے بھائی ہو تو میرا بھی بھائی ہو جب تک میں زندہ ہوں تمہیں ناگن سے مدد لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہونے دوں گا تمہیں یہاں کس نے قید کر رکھا ہے۔“ شریم نے اسے ناگن کا سارا قصہ سنایا اور یہی بتایا کہ اس نے اسے دیکھ لیا ہے اڑدھے نے کہا۔

”وہ کہاں ہے۔۔۔“ شریم نے بتایا کہ جنگل میں گیا اور بہت طاقت ور جاگروگر ہے۔



خونخوار بلی

ملک فرخ ندیم - لاہور

نوجوان اپنے بستر پر محو خواب تھا کہ اچانک کوئی وزنی چیز اس پر گر گئی اور جب نوجوان کی آنکھیں کھلیں تو مارے دہشت کے اس کی گھگھی بندھ گئی ایک خوفناک انگارہ برساتی بلی اس پر سوار تھی۔

خوف کے شعلے میں جکڑی ہوئی عجیب و غریب اپنی نوعیت کی دلخراش کہانی

میں نے کہا نہیں تو ابھی نہیں کیونکہ تو بھاری ہے پہلے قیصر کو چڑھنے دے پھر تیری باری آئے گی اور آگے کی طرف بڑھتا ہوا خرم شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور قیصر بندر کی سی پھرتی سے اس آٹھ فٹ کی دیوار پر چڑھ گیا۔ پھر خرم آیا اور اس کو اوپر چڑھاتے چڑھاتے جو ہمارا زور لگا وہ ہم ہی جانتے تھے۔ اس کا وزن کم از کم ساٹھ کلو تھا۔ کسی نہ کسی طرح اس کو بھی دیوار پر چڑھا

میں نے فرخ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور جی سے کہا۔ ”چلو بھئی باری باری اس کے اوپر پاؤں کر دیوار پر چڑھو۔ اور جلدی کرنا پھر ہم بھی اوپر نہیں گئے اور سارے مل کر یہ ہم سارا انجام دیں گے۔“ سب سے پہلے احمد نے ایک پاؤں ہمارے پر رکھا اور اوپر اپنا ہاتھ دیوار پر رکھ کر اوپر چڑھا اور آسانی دیوار پر چڑھ گیا۔ اس کے بعد خرم آگے بڑھا

کر سکوں لیکن مجھے آج ہی شام سمندر کے نیچے سانپوں کے ملک میں ضرور پہنچنا ہوگا وہاں ہمارے بادشاہ کا دربار لگ رہا ہے۔“

شریم نے کہا۔ ”مجھے راج کماری کے پاس پہنچا کر تم بے شک واپس چلے جانا، ناگو آ رہا ہے تم اس فولادی جال سے بڑی آسانی سے نکل جاؤ گے وہ تمہیں نہیں دیکھ سکے گا بے شک آزمالینا۔ میں غائب ہوتا ہوں اور ہاں تم اس ظالم ناگو کو کچھ نہ کہنا اس کی خبر میں لوں گا۔“ اتنا کہہ کر اڑھانا غائب ہو گیا۔

شریم فولادی جال کی طرف بڑھا تو جال کے سخت تاروں نے اسے نہرو کا وہ بڑی آسانی سے جال میں سے دھویں کی لہر کی طرح نکل گیا اس میں اور دھویں میں یہ فرق تھا کہ دھواں نظر آ رہا تھا اور شریم نظر نہیں آتا تھا شریم غار کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا سامنے سے ناگو چلا آ رہا تھا وہ شریم کے قریب سے گزر گیا اور شریم کو نہ دیکھ سکا حالانکہ شریم اس نے راستے میں غار کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ دوبارہ غائب ہو گیا ہے اگر ناگو نہیں دیکھ سکا تو پھر کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا ناگو سیدھا غار کے اندر چلا گیا اس نے جاتے ہی دیکھا کہ کڑ

کے جال کے دوسری جانب سے شریم غائب تھا اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے بھاگ کر غار سے باہر آگیا باہر بھی کوئی نہیں تھا۔ شریم قریب ہی کھڑا تھا اور سرکار رہا تھا اس نے زمین پر سے ایک پتھر اٹھا کر ناگو کے آگے پھینک دیا اور کہا۔

”ناگو یہ میں ہوں شریم اب تم اپنے انجام لئے تیار ہو جاؤ۔“ ناگو جلدی سے اس طرف دھینکے جہاں سے آواز آئی تھی۔

اسے کچھ نہیں آ رہا تھا وہاں اسے شریم اٹھ نظر نہیں آ رہا تھا حالانکہ وہاں شریم کھڑا تھا، شریم اس سے ہنس پڑا۔ ”مجھے تمہارا جادو اب اثر نہیں کر سکا۔“ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

(جاری ہے)

اڑھانا نے کہا۔ ”تمہارے پاس جوہر ہے اسے اپنے جسم میں لے کر جیب میں رکھ لو تم اس جادوگر کی نظروں سے دوبارہ غائب ہو جاؤ گے اور یہ بھی تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔“

شریم نے اسی وقت اس مہرے کو اپنے سارے جسم پر گزرو کر ملنا شروع کر دیا اس کے ساتھ ہی شریم کو اپنے اندر بے پناہ طاقت کا احساس ہوا اسے ایسا لگا جیسے اس کی ساری کھوپڑی ہوئی طاقت واپس مل گئی ہے۔

اڑھانا نے کہا۔ ”میں تو تمہیں ہر حالت میں ہمیشہ دیکھ سکتا ہوں لیکن اب تمہیں ناگو نہیں دیکھ سکے گا۔“ شریم نے کہا۔

”کیا ناگو کا جادو اب مجھ پر اثر نہیں کرے گا۔۔۔۔۔“

”ہرگز نہیں شریم بھائی اس کا جادو اب تمہارے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھ سکتا تم پھر سے وہی پہلے والے شریم بن گئے ہو۔ طاقت اور اور کسی کو نہ دکھائی دینے والا شریم۔ اگر یقین نہ ہو تو ابھی ناگو واپس آئے تو آزمالینا۔ اب میں تمہاری اور کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ شریم نے ناگن کے بارے میں پوچھا تو اڑھانا نے کہا۔

”کر اسے ناگن کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی سمندر میں جہاز میں سفر کر رہی ہے اور یہ جہاز پرنال کی طرف جا رہا ہے۔“ شریم نے راج کماری کے بارے میں دریافت کیا تو اڑھانا بولا۔

”میری آنکھیں تمہاری ہم سفر راج کماری کو اس وقت یہاں سے دور جنگل میں پریشانی کی حالت میں بھاگتے ہوئے دیکھ رہی ہیں خوفناک وحشی نیزہ لہراتے ہوئے اس کے پیچھے لگے رہے تاکہ اس کا سر کاٹ لیں۔“ شریم نے جلدی سے کہا۔

”کیا تم اسے بچانے میں میری مدد نہیں کرو گے۔“

”ضرور مدد کروں گا شریم بھائی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے دوست ناگن کے بھائی کی کوئی مدد نہ

Dar Digest **182** April 2018

خوف و ہراس کے سمندر میں غوطہ زن اور دلوں پر سکتہ طاری کرتی اپنی مثال آپ کھانی جو کہ پڑھنے والوں کو طویل مدت تک اپنے شکنجے میں جکڑی رہے گی۔

ایک ایسی کہانی..... جو کہ پڑھنے والوں کو کسی کروت بھی چین سے نہ رہنے دے گی



عابدہ نے مکران کی طرف دیکھا تو رانی نے کہا۔ ”آگے چلو کیوں دیکھ رہی ہو کم بخت آوارہ بدعاش ہیں۔“

پھر کچھ دن لڑکے نظر نہ آئے تو رانی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جان چھوٹی۔

ایک دن وہ اسکول کے لئے تیار ہوئی عابدہ کا انتظار کر رہی تھی اور عابدہ نہ آئی تو رانی نے بیگ اٹھایا اور عابدہ کے گھر چلی گئی۔

عابدہ کی امی سے پوچھا تو وہ کہنے لگیں۔ ”عابدہ کو بخار ہے وہ آج اسکول نہیں جائے گی۔“

رانی عابدہ کے پاس گئی تو حقیقت میں عابدہ کو بخار تھا۔ رانی نے عابدہ سے کہا۔

”اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے اسکول سے واپس آتے ہی تمہارے پاس آ جاؤں گی۔“

عابدہ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ پھر رانی تیز قدم اٹھاتی ہوئی اسکول کے لئے چل پڑی ابھی وہ اسکول سے تھوڑی دور تھی کہ وہ لڑکے پھر اسے سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ مگر رانی سرجھکائے تیز تیز چلتی رہی۔ جب وہ قریب آئے تو ایک بولا۔

”واہ کیا مست جوانی ہے کبھی نہیں بھی تو موقع

دے دو۔“

رانی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پھر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اسکول پہنچی۔ پورا دن وہ سوچتی رہی کاش وہ آج نہ آتی پھر چھٹی ہوئی تو وہ بیگ اٹھا کر گھر کی طرف چل دی۔

اور ابھی کچھ ہی دور گئی تھی کہ اچانک دونوں لڑکے ایک درخت کے پاس کھڑے نظر آئے تو وہ جلدی جلدی آگے بڑھنے لگی کوشش کرنے لگی وہ کسی کو مدد کے لئے پکار بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ بہتی سے کافی دور تھی۔

اچانک لڑکوں نے اس کا راستہ روک لیا تو رانی نے کہا۔

”چھوڑ دو میرا راستہ مجھے جانے دو اگر مجھے ہاتھ لگایا تو میں گھر جا کر تمہاؤں کی ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔“

رانی کی بات سن کر ایک لڑکا غصے سے دوہرا ہو گیا۔

”بے شرم زبان لڑا رہی ہے مجھ سے آج میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ رانی کو گھسیٹتا ہوا درختوں میں لے گیا دوسرا بھی اس کے ساتھ تھا رانی روٹی رہی ہاتھ جوڑتی رہی خدا کا واسطہ دیتی رہی۔

رانی اور عابدہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت چاہتی تھیں اکثر عابدہ رانی کے ساتھ مل کر اس کے گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتی رہتی تھی، رانی کا باپ بھی بہت خوش تھا کیونکہ رانی عابدہ کے ساتھ بہت خوش رہتی تھی۔

وہ بہت شریف اور بزرگوں کا ادب کرنے والی لڑکی تھی اس کا باپ اس سے بہت پیار کرتا تھا وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا مگر رانی نے بدل تک پڑھا کیونکہ اس کے گاؤں میں صرف بدل تک اسکول تھا ہائی اسکول گاؤں سے باہر تھا۔ رانی نے ایک روز باپ سے بولی۔

”ابو میں آگے بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔“ اور رانی کے ساتھ ساتھ اس کا باپ بھی چاہتا تھا کہ رانی زیادہ پڑھے۔

مگر وہ سوچتا تھا کہ اتنی دور رانی اکیلی کیسے جائے گی۔ اور جب اس نے رانی سے ذکر کیا۔

”میری بچی تو اکیلی اتنی دور کیسے جائے گی؟“

تو رانی نے جواب دیا۔ ”ابو میری سہیلی عابدہ بھی جائے گی۔“ اس طرح اس نے اور عابدہ نے داخلہ لے لیا عابدہ اس کی بہت اچھی سہیلی تھی اس کے گھر کے ساتھ اس کا گھر تھا اسکول کے بعد بھی اکثر عابدہ اسی کے ساتھ اس کے گھر آ جاتی تھی۔

وانسی ایک گاؤں کی رہنے والی تھی اس کی ماں چار سال قبل فوت ہو چکی تھی وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی اس کا اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا اس کا باپ رحمت ایک مزدور تھا وہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بہت شریف اور بزرگوں کا ادب کرنے والی لڑکی تھی اس کا باپ اس سے بہت پیار کرتا تھا وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا مگر رانی نے بدل تک پڑھا کیونکہ اس کے گاؤں میں صرف بدل تک اسکول تھا ہائی اسکول گاؤں سے باہر تھا۔ رانی نے ایک روز باپ سے بولی۔

”ابو میں آگے بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔“ اور رانی کے ساتھ ساتھ اس کا باپ بھی چاہتا تھا کہ رانی زیادہ پڑھے۔

مگر وہ سوچتا تھا کہ اتنی دور رانی اکیلی کیسے جائے گی۔ اور جب اس نے رانی سے ذکر کیا۔

”میری بچی تو اکیلی اتنی دور کیسے جائے گی؟“

تو رانی نے جواب دیا۔ ”ابو میری سہیلی عابدہ بھی جائے گی۔“ اس طرح اس نے اور عابدہ نے داخلہ لے لیا عابدہ اس کی بہت اچھی سہیلی تھی اس کے گھر کے ساتھ اس کا گھر تھا اسکول کے بعد بھی اکثر عابدہ اسی کے ساتھ اس کے گھر آ جاتی تھی۔

رانی اور عابدہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت چاہتی تھیں اکثر عابدہ رانی کے ساتھ مل کر اس کے گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتی رہتی تھی، رانی کا باپ بھی بہت خوش تھا کیونکہ رانی عابدہ کے ساتھ بہت خوش رہتی تھی۔

وہ بہت شریف اور بزرگوں کا ادب کرنے والی لڑکی تھی اس کا باپ اس سے بہت پیار کرتا تھا وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا مگر رانی نے بدل تک پڑھا کیونکہ اس کے گاؤں میں صرف بدل تک اسکول تھا ہائی اسکول گاؤں سے باہر تھا۔ رانی نے ایک روز باپ سے بولی۔

”ابو میں آگے بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔“ اور رانی کے ساتھ ساتھ اس کا باپ بھی چاہتا تھا کہ رانی زیادہ پڑھے۔

مگر وہ سوچتا تھا کہ اتنی دور رانی اکیلی کیسے جائے گی۔ اور جب اس نے رانی سے ذکر کیا۔

”میری بچی تو اکیلی اتنی دور کیسے جائے گی؟“

تو رانی نے جواب دیا۔ ”ابو میری سہیلی عابدہ بھی جائے گی۔“ اس طرح اس نے اور عابدہ نے داخلہ لے لیا عابدہ اس کی بہت اچھی سہیلی تھی اس کے گھر کے ساتھ اس کا گھر تھا اسکول کے بعد بھی اکثر عابدہ اسی کے ساتھ اس کے گھر آ جاتی تھی۔

”مجھے چھوڑ دو.....“ کرمان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا انہوں نے زبردستی رانی کی عزت تار تار کر دی اور بعد میں اس کا گلاب کراسے مار ڈالا۔

☆.....☆.....☆

شام کا اندھیرا چکیل چکا تھا، رانی کا باپ رحمت رانی کو ڈھونڈ کر تھک چکا تھا مگر رانی نہ ملی۔ دوسرے دن جنگل میں ایک آدمی لکڑیاں کاٹنے گیا تو اس نے دیکھا کہ رانی درختوں کے پاس مردہ پڑی ہے رانی کو دیکھ کر وہ آدمی خوف زدہ ہو گیا کیونکہ وہ بہت بری حالت میں تھی اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھنے ہوئے تھے۔

وہ آدمی بھانپتا ہوا گاؤں میں آیا اور گاؤں والوں کو بتایا تو رانی کا باپ پاگلوں کی طرح اس جگہ کی طرف دوڑ پڑا جہاں رانی مردہ پڑی تھی رانی کا باپ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

”میری بیٹی تیرے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا.....“ گاؤں والے رانی کے باپ کو دلاسا دے رہے تھے اور گاؤں والوں کو یہ نہیں تھا کہ رانی کے ساتھ ایسا سلوک کن لوگوں نے کیا ہے اور پھر عابدہ نے اس خوبی واقعہ کے بعد اسکول جانا چھوڑ دیا وہ رانی کو یاد کر کے ہر وقت روتی رہتی تھی۔

پھر اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا تو ایک دن عابدہ کو رانی کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ عابدہ نے جلدی سے گھر کا کام ختم کیا اور اپنی امی سے اجازت لے کر قبرستان جانے لگی۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ہی قبرستان تھا جہاں رانی کی قبر بھی اسی قبرستان میں تھی ابھی رانی قبر پر پہنچی نہیں تھی کہ قبرستان کے ساتھ ہی گئے درختوں سے اسے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ آواز کسی لڑکی کی تھی جو دردمیری آواز سے آہستہ آہستہ سسک رہی تھی۔ عابدہ نے سوچا۔ ”کون ہو سکتا ہے ہلو دیکھوں تو کسی کون ہے وہاں؟“

وہ آواز کی سمت بڑھنے لگی۔ اور پھر وہ اس جگہ جا پہنچی اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی گھٹنوں میں اپنا سر

دینے رو رہی ہے عابدہ کا دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا۔

آخراً اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”کون ہوں اور کیوں رو رہی ہو.....؟“

عابدہ کی آواز سن کر اس لڑکی نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا تو اسے دیکھ کر عابدہ دہل گئی کیونکہ وہ لڑکی کوئی اور نہ ہی عابدہ کی سہیلی رانی تھی اور جب رانی پر نظر پڑی تو مارے خوف کے عابدہ کی چیخ نکلی گئی۔

اس کا پورا جسم پیسے سے تر ہو چکا تھا۔ خوف کے مارے اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا اور وہ بھاگنے لگی تو جھٹ سے رانی اس کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی۔

عابدہ نے کہا۔ ”چلیز رانی میرے قریب مت آؤ خدا کے لئے مجھے جانے دو۔“ عابدہ اتنی ڈر گئی تھی کہ گڑ گڑا کر اسے واسطے دینے لگی۔ تو رانی بولی۔

”عابدہ تم ڈرو مت میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی کیونکہ تم میری اچھی بہن اور ایک اچھی دوست تھی۔ تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے بس میری ایک بات سنو۔“

عابدہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”رانی تم تو سرگئی ہو پھر یہاں کیسے۔“

عابدہ اب بھی ڈر رہی تھی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا رانی نے کہا۔

”ہاں عابدہ تم ٹھیک کہتی ہو کہ میں سرگئی ہوں مگر مجھے یقین نہیں مل رہا اس لئے کہ میری روح بھٹک رہی ہے۔“

عابدہ نے کہا۔ ”کیوں.....؟“

پھر رانی بولی۔ ”تم میری سب سے اچھی دوست ہو اس لئے تمہیں بتا رہی ہوں۔“ اور پھر رانی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ سب عابدہ کو بتا دیا۔

عابدہ اس کی بات سن کر کچھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر بولی۔

”بتاؤ رانی میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

رانی نے کہا۔ ”عابدہ آج نہیں بلکہ کل میں ان دونوں سے انتقام لے لوں گی میں ان کو چھین نہیں دوں گی۔“ عابدہ کا سارا ڈر ختم ہو چکا تھا عابدہ اس کے پاس پہنچنے لگی پھر کچھ دیر کے بعد عابدہ نے کہا۔

”رانی تم مجھے روز انیل کہتی ہو؟“

تو رانی بولی۔ ”عابدہ کل کے بعد میں تمہیں کبھی نہیں آؤں گی کیونکہ کل میں ان دونوں کو انجام تک پہنچا دوں گی۔“ پھر رانی نے کہا۔

”عابدہ اب تم گھر جاؤ کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کرنا جب تک میں ان سے بدلہ نہیں لے لیتی۔“

کہہ کر رانی قبرستان کی طرف چل پڑی۔

قبرستان میں داخل ہونے کے بعد وہ ہوا میں چل ہو کر عابدہ ہو گئی تو عابدہ گھر کی طرف چل دی۔

اس کی داستان سن کر اسے بہت دکھ ہوا تھا وہ گھر جا کر بیٹھ گئی۔

”کل رانی سے ضرور ملوں گی۔ اس سے ہر باتیں کروں گی۔“

دوسرے دن دونوں لڑکے عارف اور حمید ایک گھر کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، حمید عارف کو گھر آیا تھا عارف وہی لڑکا تھا جو روزانہ رانی کو تنگ کیا کرتا تھا، اس کی اس حرکت میں حمید بھی برابر کا شریک

ہوئے تھے عارف کی امی اندر آئیں اور چائے پھیلانے لگی تو عارف اور حمید نے اپنے اپنے کپ اٹھالے

پھر حمید نے کہا۔

”آئی مبارک ہو کل حمید کی شادی ہو رہی ہے بہت خوش ہوں عارف کی شادی پر خوب دھوم

کا کروں گا۔“

وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے جب حمید نے لگا تو عارف نے کہا۔

”یار میں تجھے نہیں جانے دوں گا تو یہیں رک

یہ وقت.....!

کبھی لوگ غلام ہو جاتے ہیں اور کبھی زمانہ کبھی حالات اور کبھی اپنا آپ ہی مگر میرے خیال میں سب سے غلام چیز وہ ہے جو گزرتے سے اپنا احساس تک نہ ہونے اداے اور وہ ہے ”وقت“ یہ کبھی اتنا اچھا ہوتا ہے کہ برے رنگ، برے لوگ، برا موسم سب کچھ اچھا لگنے لگتا ہے اور ہم وقت کی خوش گمانی میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔

اور یہ وقت ہی ہے کہ جب برا ہو جاتا ہے تو اچھے رنگ، اچھے لوگ، اچھے موسم سب کچھ برا لگتا ہے۔ یہ وقت ایسا کرتا ہے کہ جن لوگوں کو سکراہٹ کی عادت پڑی ہو انہی کی آنکھوں میں ٹھنڈ دکھاتا ہے۔ جن سہاروں کے ساتھ زندگی گزارنے کی لگن دلاتا ہے، ان ہی کو کو تو ہم سے چھین لیتا ہے، اس وقت کی چالاک تو دیکھئے کہ دھیرے دھیرے دے پاؤں گزر بھی جاتا ہے، پھر بھی ہم سب اس کی قدر کرتے ہیں اور اسے کتنا احساس سے اپنے قیمتی ہونے کا۔

کاش ہم وقت کو روک سکتے لیکن یہ میرے ہاتھوں میں دہی ریت کی طرح پھسلتا چارہا ہے۔ یہ خالی جاتا تو ٹھیک تھا مگر اپنے ساتھ میرے سنہری خواب، میری آنکھوں کے روشن چراغ، میری دعاؤں کے سارے سپ، میرے ستارے، میرے استعارے، میرے دوست، میرے سگراتے رہنے کی ساری وجوہات اپنے ساتھ لئے جا رہا ہے۔ میں لمحہ ان سب چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہوں، کبھی کبھی کسی کو روکنا ہوں تو کبھی کسی کو، لیکن میری بے بسی تو دیکھئے کہ میں ان سے کسی بھی چیز کو روک نہیں پارہا ہوں اور نہ ہی اس وقت کو۔

(ایس اتیاراجہ۔ کراچی)



طوفانی رات

مریم فاطمہ - کراچی

اچانک بدروح نمودار ہوئی اور چشم زند میں خوبرو حسینہ کو دبوچ لیا کہ اتنے میں حسینہ کی زور دار آواز حلق سے نکلی کہ اتنے میں ایک انہونی ہوئی اور پھر.....

بدلے اور انتقام کی..... لرزہ بر اندام کرتی..... لہو پھوٹ کے لہا دے میں لٹی کہانی

وانگ کہاں رہ گیا.....؟ جگہ اوائے ہوتے ہوئے اپنے دوستوں سے سوال کیا۔
 ”ہاں پتا نہیں کہاں رہ گیا تلمہ.....“ ریشو بے زار لہجے میں کہا۔
 ”اب رہنے بھی دووانگ تمہاری طرح نہیں لگے وہ ایک اچھا اور ڈیفنس انسان ہے۔“ چٹاؤ ریشو کی طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ

ہمیشہ ریشو سے چپٹی تھی کیونکہ وہ ہر وقت اس سے فری ہونے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اور ریشو پورے گروپ میں وہ واحد لڑکا تھا جس سے چٹاؤ بدی طرح خار کھاتی تھی۔
 ”چٹاؤ آخر میں نے کیا کیا ہے کیوں تم میرے پیچھے پڑی رہتی ہو۔“ ریشو ضدی لہجے میں بولا۔
 ”اب تم لوگ پھر سے نہ شروع ہو جانا

تو اس لڑکی نے جب اپنا چہرہ ان دونوں کی طرف کیا تو خوف کے مارے دونوں کی جھنجھکی مٹی۔
 ”ت..... ت..... تم..... تو مر گئی تھی۔“ عارل نے کانپتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہاں میں مر چکی ہوں مگر مجھے جین آج۔“
 ”ما جب تم دونوں کی جان لوں گی۔“ وہ کوئی اور نہیں رانی تھی۔
 وہ دونوں بھاگے مگر فرش پر گر گئے پھر اٹھے تو ان کے سامنے آگئی دونوں خوف سے کانپ رہے تھے بار بار واسطہ دے رہے تھے اس نے کہا۔
 ”جب میں تمہیں واسطہ دیتی رہی تو تم میری بات مانی تھی؟“ اتنا کہہ کر اس نے قدم آگے بڑھا دیے اور اس کی شکل ایسی ہو گئی تھی کہ وہ دیکھ کر ہوش ہونے والے تھے کہ پھر اس نے ایک ہاتھ ایک کی اور دوسرے ہاتھ سے دوسرے کی گرا پکڑ کر اوپر اچھال دیا۔ دونوں کی چیخ سے کمرہ دہل رہا تھا مگر اچھے کی بات یہ تھی کہ ان کی آواز کمرے سے نہیں جاری تھی دونوں کے سرچھت سے لگے اس نے بعد وہ دونوں دھڑام سے نیچے فرش پر گر گئے تو دونوں اس مرد وحشوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔
 ”مج ان دونوں کی موت کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی عابدہ کو یاد آیا تو وہ قبرستان مٹی توڑال نے کہا۔
 ”عابدہ میں نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔ اب میں جاری ہوں۔“
 عابدہ نے کہا۔ ”پلیز اراانی مجھ سے ملتی رہنا“ مگر رانی نے کہا۔
 ”اب یہ نہیں ہو سکتا۔“ اور رانی نے قبرستان کی طرف اپنے قدم بڑھا دیے اور وہ قبرستان جا کر غائب ہو چکی تھی۔ عابدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے پھر عابدہ آہستہ آہستہ کھرکی طرف چل دی۔

کی ایک نہ سنی اور جلدی سے کال کر کے اس کے گھر بتا دیا۔
 ”حیدر آج میرے پاس رہے گا۔“
 اندھیرا کافی پھیل چکا تھا عارف کی امی نے آواز لگائی۔ ”آؤ بیٹا کھانا کھالو۔“
 تو دونوں نے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا پھر وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ باتیں کرتے کرتے انہیں تاہم کا پیہ ہی نہ چلا۔
 رات کے بارہ بج چکے تھے اتنے میں اچانک تیز ہوا چلنا شروع ہو گئی حیدر نے کہا۔
 ”ابھی تو موسم اچھا تھا اچانک یہ ہوائیں۔“ پھر بجلی اتنے زور سے گزری کہ دونوں کانپ کر رہ گئے۔ ساتھ ساتھ بارش بھی شروع ہو گئی۔
 کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔
 عارف بیٹا دروازہ کھولا۔ ”یہ اس کی امی کی آواز تھی وہ جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھولا تو سامنے کوئی بھی نہ تھا۔
 اس نے دروازہ بند کیا اور حیدر کی طرف دیکھا۔ ”حیدر امی کی آواز تمہیں سنائی دی تھی کیا؟“ اس نے کہا۔
 ”ہاں آواز تو میں نے بھی سنی ہے۔“
 ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی تو اس بار دروازہ حیدر نے کھولا مگر سامنے کوئی نہ تھا تو وہ دونوں گھبرا گئے، جلدی سے کمرے سے نکلے اور امی کے کمرے میں پہنچے تو وہ سوچتی تھیں۔
 اچانک بجلی پھر گزری تو لائٹ بھی چلی گئی۔ وہ دونوں واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر عارف نے موبائل کی لائٹ سے دروازہ بند کیا۔
 جب دونوں بیڈ کے قریب آئے تو کوئی لڑکی بیڈ پر پڑی ہوئی تھی اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔
 عارف کی خوف کے مارے جان لگی جاری تھی حیدر بھی ڈر رہا تھا عارف نے آخر پوچھا۔
 ”کون ہو تم.....؟“

پلیز۔“ جیانی نہیں روکا۔
 جنگو اپنے لاکر کے اندر دیکھ کر ایک دم چمکی۔
 ”ارے یہ کیا ہے.....“ اندر سفید رنگ کا ایک
 لٹافہ موجود تھا۔ اور لٹافے پر جنگو کا نام تھا۔
 ”لکھا تو واگنگ کی لگ رہی ہے۔“ اس نے
 کہا اور لٹافہ کھول ڈالا۔ اندر سے ایک کارڈ برآمد ہوا
 اس پر لکھا تھا۔
 ”فاریسٹ پارٹی..... واگنگ کی طرف
 سے۔“ جنگو نے سب کو وہ کارڈ دکھایا۔
 چٹاؤ نے بھی جلدی سے اپنا لاکر کھولا کہ شاید
 اسے بھی ویسا ہی دعوت نامہ دیا گیا ہو۔ اس کے لاکر میں
 بھی ایک ویسا ہی لٹافہ تھا۔ وہ خوش سے اچھلنے لگی۔
 ”واہ! بہت خوب بزدل دودوڑ کیوں کو ایک
 سات ڈیٹ پر لے جا رہا ہے۔“ ریشو انسوس سے
 ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔
 ”بکواس بند کرو یہ کوئی ڈیٹ نہیں ہے۔“
 چٹاؤ غصے سے بھنگائی جیانی کے لیے اور اس نے بھی اپنا
 لاکر کھولا تو توقع کے عین مطابق اس کے لاکر میں بھی
 دعوت نامہ تھا۔
 پھر ریشو نے غصے میں آ کر اپنا لاکر کھولا
 اور خوشی سے چلا اٹھا.....
 ”ہاں یہ ہوئی! ہاں بات یہ واقعی ڈیٹ نہیں
 ہے..... اسے بھی دعوت نامہ ملا ہے۔“
 اچانک واگنگ ایک طرف سے نکل آیا۔
 ”دوستو! کیا اس سر پرانز۔“ اس نے پوچھا۔
 ”تیرا جواب نہیں واگنگ۔“ ریشو اسے گلے
 لگاتے ہوئے بولا۔
 یہ پانچوں دوست چین کے باشندے تھے
 ۔ اور اس وقت اسکول سے چھٹی کا وقت تھا واگنگ نے
 جنگلات کی سیر کا پروگرام ترتیب دے دیا کل صبح انہیں
 جنگل کی طرف روانہ ہونا تھا اور شام سے پہلے واپس
 لوٹ آنا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز صبح کے وقت وہ پانچوں اکٹھے ہوئے۔
 اور وہ سب گاڑی سے سفر کر کے ایک مقام پر پہنچے
 پھر اس کے بعد آگے گاڑی بیل لے کر نکلتا تھا۔
 سردیوں کے دن تھے ہر طرف دھند چھائی
 ہوئی تھی آسمان پر بھی کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی موسم نے
 تیز بھی اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ انہوں نے سردی
 سے بچاؤ کے لئے گرم کپڑے وغیرہ پہن رکھے تھے۔
 ان لوگوں کو راستے کی بھی کچھ خبر نہ تھی بس ان کے پاس
 ایک نقشہ تھا جس میں سے وہ راستہ تلاش کرتے آگے
 بڑھ رہے تھے۔
 ”میں تو چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔“ چٹاؤ نے
 شکایت کی۔
 ”اگر میرے بس میں ہوتا تو تمہیں گود میں
 اٹھا کر یہ سفر لے کر دیتا۔“ ریشو نے ہمدردی سے
 کہا۔
 ”بکواس بند کرو کچھ..... میں تمہارا
 توڑ دوں گی۔“ چٹاؤ کو شدید غصہ آیا۔
 ”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کچھ دیر آرام
 کر لینا چاہئے۔“ جیانی رکتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں میں بھی بہت تھک گئی ہوں۔“ بکواس
 نے بھی اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھیک ہے..... اگر تم لوگ بھی چاہتے ہو
 ایسا ہی سہی۔“ واگنگ نے کہا اور پھر وہ سب ایک جگہ
 اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔
 ”اف کتنی سردی ہے۔“ جنگو نے ہاتھ ملاتے
 ہوئے کہا۔
 ”ایسا کرتے ہیں کہ لکڑیاں اکٹھی کر لے
 یہاں تھوڑی سی آگ جلا لیتے ہیں۔“ واگنگ نے
 مشورہ دیا۔
 ”ہاں یہ صحیح رہے گا مجھے بھی بہت سردی کا
 احساس ہو رہا ہے۔“ ریشو نے کہا اور پھر وہ اندر واک
 لکڑیاں اکٹھی کرنے لگے۔
 لکڑیاں اکٹھی کر کے انہوں نے آگ جلا

اور سارے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ تیز سرد ہوا چل
 پڑی تھی ان کے بال بری طرح ہوا سے اڑ رہے تھے۔
 ”اب کس طرف جانا ہے۔“ جیانی نے آگ
 تاپتے ہوئے پوچھا۔
 ”زیادہ دور نہیں بس تھوڑی دور اس طرف۔“
 واگنگ نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”یہ شاید واید کا چکر چھوڑو اور اپنی بات
 بناؤ۔“ جیانی نے پھر کہا تو واگنگ نے اثبات میں
 سر ہلا دیا۔
 اور اپنے پاس سے نقشہ نکالا اور دیکھنے لگا۔
 ”اس نقشے کے مطابق ہمیں مشرق کی طرف
 جانا ہے۔“ واگنگ نے اپنے سیدھی طرف اشارہ کیا۔
 ”لیکن وہاں سے تو ہم آئے ہیں۔“ ریشو
 نے حیرت سے بے یقینی سے کہا اور نقشہ چھپ کر واگنگ
 کے ہاتھ سے لے لیا اور غور سے پڑھنے لگا۔
 اچانک ہوا کا تیز جھوٹا آیا اور نقشہ اس کے
 ہاتھ سے چھوٹ کر سامنے طے آگ میں جا گرا اور پھر
 نقشے کو جھلنے میں دیر نہیں لگی اور یہ دیکھ کر ان پانچوں نے
 شور مچا دیا۔
 ”کچھ کرو آگ بجھاؤ۔“ چٹاؤ گھبرا کر بولی۔
 وہ سارے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے وہ ہاتھ
 مار مار کر آگ کو بجھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہزار
 کوشش کر ڈالیں مگر سب بے سود نقشہ لہجوں میں جل
 کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔
 ”اب کیا کریں نقشے کے بغیر ہم تو آگے نہیں
 بڑھ سکتے.....“ واگنگ نے ایک گہری سانس خارج
 کرتے ہوئے کہا۔
 ”سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے آگ
 انسان۔“ جنگو نے ریشو کو گھورتے ہوئے کہا۔
 ”آگ میں نہیں بلکہ آگ میں ہوا ہے..... بھلا اس
 میں میرا کیا قصور ہے اگر نقشہ ہوا سے اڑ گیا تو۔“ ریشو
 نے بھی ڈھٹائی سے جواب دیا۔
 ”سارا پروگرام چوہٹ کر کے رکھ دیا تم نے

سیر کا۔ اب چلو واپس۔“ چٹاؤ صبر سے بھر کر بولی۔
 پھر پانچوں دوست واپس کے لئے مڑ گئے۔
 ”ہم اس طرف سے آئے تھے..... ہے
 نا.....؟“ ریشو نے پوچھا۔
 ”نہیں ہم اس طرف سے آئے تھے۔“ واگنگ
 نے دوسری جانب اشارہ کیا اور پھر وہ پانچوں آہیں
 میں بحث کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔
 اب ہوا پہلے سے بھی تیز ہو گئی تھی۔ انہیں چلتے
 چلتے خاصی دیر ہو گئی تھی مگر اب تک وہ جنگل سے
 باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو پائے تھے۔ آخر ایک جگہ
 تھک کر وہ سارے رک گئے۔
 ”دوستو! ہم کہاں آ گئے اس جگہ تو ہم پہلے
 بھی آ چکے ہیں۔“ جنگو نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، وہ چل
 چل کر تھک چکی تھی۔
 ”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ ہم راستہ بھگ
 چکے ہیں۔“ ریشو نے ڈرتے ہوئے کہا۔
 ”ایسا مت کہو پلیز..... امیرا دل گھبراتا
 ہے۔“ چٹاؤ نے کہا۔
 ”اتنی جلدی ہارست مانو دوستو! ایک
 بار پھر یہاں سے نکلنے کی کوشش کر کے دیکھتے
 ہیں۔“ واگنگ نے ان کی ہمت بندھائی اور وہ سارے
 ایک بار پھر چل پڑے۔
 لیکن کالی دور چلتے کے بعد بھی وہ وہیں پہنچ
 گئے جہاں سے چلنا شروع کیا تھا۔
 ”کوئی فائدہ نہیں ہم بھگ چکے ہیں۔“ جیانی
 نے لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن اب کیا کریں گے ہمارے پاس
 تو کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔“ جنگو نے
 گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”تھوڑی دیر یہاں آرام کرتے ہیں اس کے
 بعد پھر سے واپسی کا سفر شروع کریں گے۔“ واگنگ
 نے کہا۔ وہ سب تھک ہار کر زمین پر بیٹھ گئے۔
 جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا سردی بڑھتی

جاری تھی۔

”میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہئے ورنہ رات ہو جائے گی۔“ جینا نے کہا تو وہ سب ایک بار پھر چل پڑے۔ آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شام سے رات ہو گئی سردی زیادہ بڑھ چکی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اچانک بجلی کڑکنے کی آواز سنائی دی اور موسلا دھار بارش بھی شروع ہو گئی اور وہ بارش طوفان میں بدل گئی تیز سرد ہوا سے پیڑ پری طرح بل رہے تھے۔ وہ لوگ پوری طرح پھنس چکے تھے اب وہ پانچوں بچتارہ تھے کہ وہ جنگل کی سیر کو کیوں آ گئے۔ وہ سب تیز بارش سے بچنے کے لئے ایک گھنے درخت کے نیچے جمع ہو گئے مگر بارش کا بے تحاشہ پانی وہاں بھی ان کا بچھا نہیں چھوڑ رہا تھا وہ لوگ پوری طرح بھیک چکے تھے۔

اچانک وانگ کے چہرے پر مسکراہٹ قفس کرنے لگی۔

”دوستو! دیکھو ہم لوگ فٹ گئے۔“ اس نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب کیسے فٹ گئے.....؟“ ریشو نے حیرت سے پوچھا اسے وانگ کی جتنی کیفیت پر شبہ ہونے لگا تھا۔

”اس طرف دیکھو۔“ اس کے کہنے پر سب نے اس سمت دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہا تھا تو ان لوگوں کی بھی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اندھیرے میں دور سے ایک گھر نما عمارت نظر آ رہی تھی۔

”چلو وہاں چل کر بارش سے پناہ لیتے ہیں۔“ وانگ نے کہا اور وہ چاروں اس کے پیچھے چل دیئے۔

نزدیک پہنچے ہی تھے کہ زور سے بجلی کڑکی..... اس کی روشنی میں انہوں نے اس گھر کے پاس ایک بورڈ لگا ہوا دیکھا۔ ”ہوٹل“ تحریر تھا۔

”ارے اس ویرانے میں بھلا کون ہوٹل کھولے بیٹھا ہے۔“ جینا نے حیرت سے پوچھا۔

”اس کو چھوڑو اور اندر چلو۔“ ریشو نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔

ہوٹل بہت خستہ حالت میں تھا وانگ نے دروازے کا پینڈل گھمانا چاہا مگر وہ اندر سے بند تھا مجبوراً اس نے دروازہ زور سے پیٹا تو ذرا سی دیر میں دروازہ چرکی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ تو سب نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولنے والے کی طرف دیکھا وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو گہرے سبز رنگ کے کپڑوں میں لیٹھی تھی۔

”کیا ہم اندر آ سکتے ہیں.....؟“ وانگ نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں بالکل، بچو! اندر آ جاؤ۔“ اس بوڑھی عورت نے ہمدردی سے کہا اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا تو وہ پانچوں آگے پیچھے ہو کر اندر داخل ہوئے اندر آئے انہیں سردی کا احساس کچھ کم ہوا لیکن پھر بھی وہ بارش میں بیٹھے ہوئے تھے اس لئے جسم پر کچھ ٹاری تھی۔

”تم لوگ اتنے طوفان میں باہر کیا کر رہے تھے ایسے موسم میں تو کوئی بھی اس جنگل کا رخ نہیں کرتا۔“ بوڑھی عورت نے پوچھا۔

”آئی ہم دراصل راستہ بھٹک گئے ہیں۔“ جینا نے سردی سے کانپتے ہوئے بتایا۔

”چلو کوئی بات نہیں اب تم لوگ یہاں آ گئے ہو جب تک طوفان ختم نہیں جاتا تم لوگ یہاں رہ سکتے ہو۔“ بوڑھی نے کہا۔

”ہم نئی کیا لائٹ مانی ہوئی ہے۔“ چتاؤ نے ہوٹل میں موم بتیاں جلتے دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں بیٹا یہ تو جنگلات ہیں یہاں بجلی جیسی کوئی چیز نہیں..... یہ ہوٹل یہاں سیاحت کے لئے آئے لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے تم سے پہلے بھی کئی بار یہاں کوئی بمولے بھٹکے مسافر آچکے ہیں مجھے اچھی

طرح یاد ہے وہ دونوں میاں بیوی تھے۔“ بوڑھی عورت نے بتایا۔

”تم لوگ اپنے کپڑے تبدیل کرلو پوری طرح بھیک چکے ہو۔ میں تمہیں اپنے پاس سے دوسرے کپڑے لا کر دیتی ہوں۔“ بوڑھی عورت نے نرمی سے کہا۔

ان پانچوں نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ کیلے کپڑوں میں واقعی انہیں بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ عورت کی اور ان سب کے پہننے کے لئے خشک کپڑے لے آئی ان سب نے غسل خانے میں کپڑے تبدیل کئے اور ایک کمرے میں جمع ہو گئے یہ غالباً وانگ روم تھا وہاں بیچ میں کڑی کی ایک میز اور اس کے گرد کرسیاں رکھی تھیں وہ پانچوں آرام سے بیٹھ گئے باہر سے منسل تیز بارش کا شور سنائی دے رہا تھا۔

اچانک تیز ہوا سے کڑکی کھل گئی بوڑھی عورت نے جلدی سے کڑکی بند کی۔

”یہ طوفان تو کسی کی جان لے کر رہے گا۔“ بوڑھی عورت بڑبڑائی۔

”آئی آپ کا نام کیا ہے.....“ جینا نے پوچھا۔

”میرا نام منکھیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تم لوگوں کو بھوک لگی ہوگی..... میں تم لوگوں کے کھانے کے لئے کچھ لے کر آتی ہوں۔“ منکھیا نے کہا۔

”بالکل آئی جلدی سے کچھ کھانے کو دیجیے صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے.....“

”ویسے اس وقت کیا وقت ہو رہا ہے۔“ ریشو نے کہا تو منکھیا نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولی۔

”اس وقت رات کے دس بجے ہیں پھر وہ کچن کی طرف چل دی۔

پیچھے یہ لوگ باتوں میں مصروف ہو گئے۔“

میرے گھر والے میرے لئے بے حد پریشان ہوں

گے میں نے ان سے کہا تھا کہ میں شام سے پہلے لوٹ آؤں گی۔“ جنگو انگر مندی سے بولی۔

”ویسے آئی منکھیا ہم پر بے حد مہربان ہیں۔“ وانگ نے کہا۔

ابھی یہ لوگ خرید کوئی بات کرتے کہ منکھیا ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لئے چلی آئی کھانے میں گرم گرم چکن کارن سوپ تھوڑی سی بھری اور نوڈلز تھے اتنا شاندار کھانا دیکھ کر سب کی بھوک جاگ اٹھی منکھیا نے کھانا ان کے سامنے میز پر رکھ دیا وہ سب مزے لے کر کھانے لگے۔

”آئی یہ طوفان ویسے کب تک ختم جائے گا۔“ چتاؤ نے پوچھا۔

”بیٹا یہ جنگل کا طوفان اور بارش اتنی آسانی سے نہیں ختم ہوتی۔ بعض اوقات کچھ دن بھی لگ جاتے ہیں۔“ منکھیا نے بتایا۔

”ارے نہیں جب تک کیا ہم یہاں پھنسے رہیں گے۔“ ریشو سوچتے ہوئے بولا۔

”بالکل نہیں کوئی نہ کوئی بندوبست تو ہوئی جائے گا۔“ وانگ نے تسلی دی۔

”کھانا واقعی بہت لذیذ ہے۔“ جینا نے کھانے کی تعریف کی۔

”شکریہ.....“ منکھیا نے کہا۔

جب وہ لوگ کھانا کھا چکے تو منکھیا نے برتن سمیٹ لئے ریشو نے اپنا چھوٹا سا بیگ جو کہ وہ کندھے پر لٹکائے ہوئے تھا نکالا اور اس میں سے شراب کی بوتلیں نکالیں۔

”سر پرانیہ میں نے تم لوگوں کے لئے چھپا کر رکھی تھیں۔“

”بڑے کمینے ہو میں خبر تک ہونے دی۔“ چتاؤ بولی۔

”آئی آپ بھی پیئیں گی؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں شکریہ میں نہیں پییتی.....“ اور پھر پارٹی شروع ہو گئی..... وہ لوگ ایک گلاس کے بعد ایک پے

جار ہے تب ہی جیانے انہیں روک دیا۔
 ”بس کرو دوستو..... ہم اس وقت کسی نائٹ کلب میں نہیں بلکہ ایک ہوٹل میں ہیں۔“ وہ بولی اور اس نے شراب کی بوتلیں ان کے سامنے سے ہٹالیں۔
 ”تم لوگ ضرور تھک گئے ہو گے میں تمہیں تمہارے کمرے دکھا دیتی ہوں تاکہ تم لوگ آرام کر سکو۔“ منکشیانے کہا اور انہیں ساتھ لے کر باری ان کے کمروں تک چھوڑ دیا۔
 رات کے بارہ بج چکے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی ابھی تک نہیں سو سکا تھا جیسا بھی اپنے کمرے میں اکیلی بے چین ہو رہی تھی اس نے کبل ایک طرف ہٹایا اور بستر سے باہر نکل آئی کمرے میں ہلکی موسیقی کی روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے کڑی کھول کر دیکھا تو باہر ابھی تک موسلا دھار بارش جاری تھی۔ اس نے جلدی سے کڑی دوبارہ بند کی اور چھتاؤ کے کمرے کی طرف چل دی۔ وہاں پہنچ کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔
 ”کھلا ہے آ جاؤ.....“ اندر سے چھتاؤ کی آواز سنائی دی جیانے دروازہ آہستہ سے کھولا اور اندر پہلی آئی۔
 ”مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو سوچا کہ تمہارے پاس چلی آؤں۔“
 ”ہاں مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔“ چھتاؤ نے تسکے تسکے انداز میں کہا۔
 ”سوچتی ہوں یہ طوفان آخر کب تھمے گا۔“ جیا نے بجلی کے کڑکنے کی آواز پر کہا۔
 ”جیا تم نے ہوا کا یہ شور سنا.....“ چھتاؤ نے پوچھا۔
 ”ہاں ظاہر ہے۔“ جیانے جواب دیا۔
 ”یہ شور آنے والے طوفان اور ہونے والی کسی انہونی کا پتا دے رہا ہے۔“ چھتاؤ نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”کیوں گھبرا رہی ہو کچھ نہیں دگا۔“ جیانے

تسلی دی۔
 ”جیا تمہیں اس بھیا تک رات اور گئے جنگل سے خوف محسوس نہیں ہو رہا.....؟“ چھتاؤ نے پھر پوچھا۔
 ”ہاں..... ایسی جگہ اور موسم سے ڈرنا تو فطری چیز ہے۔“ جیانے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔
 ”اچھا اب میں چلتی ہوں تم بھی سونے کی کوشش کرو۔“ جیانے کہا اور اٹھ کر باہر آ گئی۔
 رات کا نامعلوم کون سا پہر تھا جب جیا کی آنکھ کسی کے چیخنے کی آواز سے کھل گئی وہ گھبرا کر اٹھی اور بیروں میں چہل اڑتی کمرے سے باہر نکلی۔ باہر آئی تو دیکھا کہ ریٹھو، وانگ اور جگسوا بھی اپنے کمروں سے نکل رہے ہیں۔
 ”کیا ہوا یہ آواز کیسی تھی.....؟“ جگسوا نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔
 ”آواز چھتاؤ کے کمرے سے آئی تھی کہیں وہ مشکل میں نہ ہو۔“ ریٹھو نے گھبرا کر کہا،،، جلدی سے آگے بڑھ کر چھتاؤ کے کمرے کا دروازہ کھول دیا باقی سب بھی وہیں اکٹھے ہو چکے تھے اندر کا منظر بالکل نارمل لگ رہا تھا چھتاؤ بستر پر سونے لے انداز میں لیٹی تھی۔
 ”چھتاؤ کیا تم ٹھیک ہو.....؟“ وانگ نے پوچھا۔
 لیکن چھتاؤ نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ سب اندر چلے آئے جگسوا نے اس کے نزدیک جا کر دیکھا تو چیخ پڑی۔ چھتاؤ کے گلے میں بستر کی چادر بندھی ہوئی تھی جیسے کسی نے اس کا دم کھونٹنے کی کوشش کی ہو۔ وانگ نے جلدی سے آگے بڑھ کے اس کے گلے سے چادر کھولی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔
 ”یہ سب کس نے کیا.....؟“ ریٹھو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”جیا اور جگسوا ایک دوسرے کے ساتھ کئی

لکڑی تھیں۔
 ”ہونہ ہو ضرور کوئی ہوٹل میں کس آیا ہے نہیں چل کر منکشیانے کو خبردار کرنا ہوگا.....“ وانگ نے کہا پھر وہ سارے منکشیانے کے پاس پہنچے وہ اس وقت چکن ہیں ہی ایک طرف زمین پر بستر لگائے سو رہی تھی جیا نے اسے اٹھایا اور ہوٹل میں پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بتایا۔
 منکشیانے سن کر بہت پریشان ہوئی اس نے ان سب کو ساتھ لیا اور موسم بقی کی روشنی میں پوار ہوٹل مکان مارا لیکن وہاں ان پانچوں اور چھتاؤ کی ڈیڈ ڈیڈ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وہ سب بے حد پریشان اور اداس تھے سب کی نیند اڑ چکی تھی۔
 باہر بارش میں بھی کوئی کی نہیں آئی تھی اور جیسے جیسے رات گہری ہو رہی تھی سردی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ منکشیانے مشورہ دیا کہ وہ سب واپس اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں صبح دیکھی جائے گی کہ کیا گرا ہے۔ ان چاروں نے اس کی بات مان لی اور واپس اپنے کمروں میں آرام کرنے کی نیت سے چلے گئے۔
 رات کے ڈھائی بجے جیا پانی پینے کمرے سے اتر گئی اس کا رخ چکن کی طرف تھا تب ہی اس کی نظر ریٹھو پر پڑی وہ جگسوا کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس نے کوئی توجہ نہ دی اور پانی پی کر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ جگسوا کے کمرے سے اس کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ مارے اس کے کمرے کے باہر قہقہے ہو گئے۔ منکشیانے بھی گھر رہی تھی وہ بھی موقع پر پہنچ گئی۔
 وانگ نے بہت کمرے کے دروازہ کھول ڈالا پانچ فرس پر جگسوا آڑی تر جمی لیٹی ہوئی تھی اس کے پٹے میں جگر پیوست تھا۔
 جیا کے قہقہے سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی۔ ریٹھو پھر تمام کے فرش پر بیٹھ گیا جیانے رونما شروع کر دیا۔
 ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے ریٹھو.....“

میں نے آج اس واقعہ سے پہلے تمہیں جگسوا کے کمرے سے نکلنے دیکھا تھا اور آج نقشہ بھی تمہاری وجہ سے آگ میں جلا تھا ضرور تم نے جان بوجھ کر وہ نقشہ آگ میں پھینکا ہوگا تاکہ ہم یہاں بھٹک جا سکیں تو تم ہمیں ایک ایک کمرے مار سکو۔“ جیانے روتے ہوئے کہا۔
 ”کیا بکواس کر رہی ہو۔ بھلا میں ایسا کیوں کروں گا۔“
 ”یہ مجھے نہیں پتا۔“ جیا چیخی..... جیا کی بات سن کر وانگ بھی چکر میں پڑ گیا تھا۔
 ”ٹھیک ہے اگر تم نے یہ سب نہیں کیا اور تم واقعی ہمارے دوست ہو تو ہماری بھی ایک شرط ہے۔ ہم آج رات تمہیں تمہارے کمرے میں بند کر دیں گے اگر تم بے قصور ہو تو اس کام میں ہمارا ساتھ دو ورنہ دوسری صورت میں ہم یہ سب تمہیں گے کہ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔“ وانگ نے بات سنبھالنے ہوئے کہا۔
 ”ٹھیک ہے اگر تم لوگوں کو میری دوستی کا ثبوت چاہئے تو ایسے ہی سہی۔“ اور پھر وانگ نے اسے اس کے کمرے میں بند کر دیا۔
 پھر وانگ اور جیا ایک کمرے میں اکٹھے بیٹھ گئے تب ہی منکشیانے ان کے پاس آئی اور بولی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ صبح سویرے ہی تم لوگ میرے ہوٹل سے چلے جاؤ..... جب سے تم لوگ یہاں آئے ہو کچھ نہ کچھ برا ہو رہا ہے۔“
 ”ٹھیک ہے ہم صبح سورج کی پہلی کرن نکلتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“ وانگ نے جواب دیا۔
 منکشیانے وہاں سے چلی گئی تھوڑی دیر میں جیا اور وانگ کو ریٹھو کے کمرے سے ہاتھ پائی اور مزاحمت کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر ریٹھو کے کمرے کی طرف آئے وانگ نے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا سامنے ریٹھو کی لاش فرش پر پڑی تھی اس کی گردن پر کسی نے چھری پھیر دی

تھی جیا اور وانگ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے دروازہ باہر سے بند تھا پھر اسے کس نے مارا اور میں نے اسے بند کرنے سے پہلے کرے کو اچھی طرح چیک کیا تھا۔ یہاں کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا پھر یہ کیسے ہو گیا؟ کس نے کیا۔" وانگ نے کہا۔
 "میں بتاتی ہوں کہ یہ سب کیسے ہوا اور کس نے کیا۔"

پیچھے سے منکھیا کی آواز سنائی دی تو ان دونوں نے پلٹ کر دیکھا اور پھر جانک منکھیا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی چھری وانگ کے پیٹ میں گھونپ دی وانگ زمین بوس ہونا چلا گیا جیانے ایک ڈری ڈری چیخ ماری اور اپنی جگہ سے گر پڑی۔

"جانتی ہو میں نے ایسا کیوں کیا آج سے تیس سال پہلے تمہاری ماں اور میں کئی سہیلیاں تھیں ہم دونوں ان ہی جنگلات کی سیر کرنے آئے تھے۔ راستے میں طوفان آ گیا تمہاری ماں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا اور خود یہاں سے چلتی بنی میں طوفان اور اس کے جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے آخر اپنی جان گنوا بیٹھی اور تب سے میری آخر اسی جنگل میں بھٹک رہی ہے آج جب میں نے تمہیں یہاں بھٹکتے دیکھا تو مجھے لگا کہ بدلہ لینے کا یہ بڑا اچھا موقع ہے یہ ہوکل جو تم دیکھ رہی ہو اب بالکل ویران ہو چکا ہے اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ میں نے ہی تمہارے دوستوں کو ایک ایک کر کے ختم کیا ہے ایسے تمہیں بھی جان سے مار ڈالوں گی۔" منکھیا نے کہا۔

جیا اپنی ساری ہمت جمع کر کے اٹھی اور اوپر بیڑھیوں کی طرف بھاگی اور پہنچ کر سیدھے ہاتھ پر ایک کمرہ تھا کچھ پتھر نہیں آیا تو وہ اندر چلی گئی اور اپنے بچاؤ کے لئے کچھ ڈھونڈنے لگی لیکن کچھ نہ ملا وہ پریشان ہو گئی تب ہی اسے بیڑھیوں پر منکھیا کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ مجبوراً اسے ایک ہی حل سمجھ آیا کہ کھڑکی سے باہر کود کر اپنی جان بچالے ورنہ وہ بوڑھی آتما اس کے باقی ساتھیوں کی طرح اسے بھی مار دے گی وہ اپنے منصوبے کو مکمل جامہ پہناتے ہوئے کھڑکی

کی چوٹ پکڑ کے لٹک گئی اس نے نیچے زمین کی طرف دیکھا تو اسے پکڑ سا آگیا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نیچے کودے یا نہیں کہ منکھیا سر پہنچ گئی اسے دیکھ کر جیانے ایک چیخ ماری منکھیا نے چھری اس کے سیدھے ہاتھ پر ماری تو اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور بائیں ہاتھ سے چوٹ پکڑ کے لٹکی رہی۔ منکھیا نے اس کے بائیں ہاتھ پر چھری پھیرنی چاہی تو مجبوراً اس نے بائیں ہاتھ بھی ہٹا دیا اور نیچے جا گری کرنے کی وجہ سے اسے تھوڑی بہت چوٹیں آئی تھیں۔

وہ بارش کے پانی میں پوری طرح بھیگ چکی تھی وہ ہمت کر کے اٹھنے لگی تب ہی نامعلوم کہاں سے منکھیا آن پہنچی اور اس کے پیٹ میں ایک زبردست لات ماری جیا بری طرح کراہ کر رہ گئی پھر منکھیا نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا تو عین اپنی طرف کیا اور ہاتھ میں پکڑا آخر پوری قوت سے منکھیا کے سینے میں اتار دیا۔ منکھیا زمین بوس ہو گئی۔ اس کی روح کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وانگ جھٹکے جھٹکے انداز میں زمین پر بیٹھ گیا۔

"وانگ تم زندہ ہو۔" جیا خوش ہوتے ہوئے بولی۔
 "وانگ میں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔" جیانے اس گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

صبح تک امدادی ٹیمیں وہاں پہنچ گئیں جیا اور وانگ زندہ بچ کر نکال آئے تھے وہ ہوکل آج بھی اس جنگل میں موجود ہے لیکن اب وہاں کوئی نہیں جاتا۔ جیا اور وانگ نے تین سال بعد آپس میں شادی کر لی۔ آج بھی جنگل میں گزاری وہ طوفانی رات یاد کر کے ان دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔



قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

جو ہو سکے تو میری روح میں سا جاؤ
 دل و نگاہ کے رشتے تو ٹوٹ جاتے ہیں
 (ایس حسیب خان.....کراچی)

اس جہاں میں کب کسی کا درد اہٹاتے ہیں لوگ
 رخ ہوا کا دیکھ کر اکثر بدل جاتے ہیں لوگ
 (انتخاب: ہیرہ عباس.....حیدرآباد)

چوٹ پڑی ہے دل پر تو آہ لیوں تک آئی ہے
 یونگی چمن سے بول اٹھنا تو شیشے کا دستور نہیں
 (انتخاب: حافظ عابدی.....کراچی)

تہائیوں کا درد لئے میرے دل کے ساتھ
 شب بھر تیرے خیال میں جلتی ہے زندگی
 (انتخاب: ارشد خان.....کراچی)

روز نہ سہی کسی دن یاد کر لینا
 کبھی نیند نہ آئے تو ہمیں بھی جگا لینا
 کبھی بھی کچھ بھی کہنا ہو بلا جھجک کہنا
 اگر کچھ دینا چاہو تو ہمیں اپنے غم دینا
 (شرف الدین جیلانی.....ننڈوالہ یار)

عشق سے کہہ دو ابھی بات نہ کرے
 اس نگاہ کو ابھی جاننے کی عادت نہیں ہے
 عشق سے کہہ دو ابھی خواب نہ دے
 ابھی ستاروں پہ چلنے کی ہمت نہیں ہے
 (محمد بلال نصیر.....کراچی)

چری یاد نے ستایا دل ملنے پر آیا
 ہاں برسے یوں جیسے سادون جھڑی لایا
 (ڈاکٹر رانا عامر شہزاد.....نکا نہ صاحب)

کا سب تن کھائیوں اور جن جن کھائیوں ماس
 نیناں مت کھائیوں جنہیں پیا ملن کی آس
 (انتخاب: جس اسلمی.....نکا نہ صاحب)

کبھی نہ ہاتھوں سے ہاتھ چھوئے خیال رکھنا
 کبھی نہ چاہت کا مان ٹوٹے خیال رکھنا
 جو ہو محبت تو ریشوں سے گریز کرنا
 کسی کا نازک سا دل نہ ٹوٹے خیال رکھنا
 (شہر یار رفیق.....کچھروندہ سے)

ہم برسے کیا تھے کہ اک صدق کو سمجھے تھے ہر
 وہ بھی اچھے تھے کہ بس پار کہا وار کیا
 (مہر پرویز احمد دولو.....میاں چنوں)

رات گئے تک کھال نئے کرتے ہیں اعلان یہاں
 یہ دنیا ہے سنگ دلوں کی کوئی نہیں انسان یہاں
 پیار بھگ میں بھی مانگو کوئی پیار نہ ڈالے جموں میں
 بن مانگ مل جاتے ہیں رسوائی کے سامان یہاں
 (محمد حنیف شاہ.....بھاگدوالی، ننگنا نہ صاحب)

کیا لکھوں دل کی حقیقت آرزو بے ہوش ہے
 خط پر آنسو گر رہے ہیں مگر قلم خاموش ہے
 (انتخاب: عبدالحمید عرف پو.....دیپالپور)

میرے زخموں کا علاج کچھ اس طرح کیا اس نے اے موت
 مرہم بھی لگائی تو خنجر کی نوک سے
 (خضر حیات.....روڈہ قمل، خوشاب)

میں دیکھا میرا زندہ دیکھے میں نے نا دیکھا تے اوہ دیکھے
 پوسے یار دے مرے، اوہ دیکھے نہ یا نہ دیکھے
 (محمد دانیاں.....روڈہ قمل، خوشاب)

پہلے تو میری یاد سے آئی جیا انہیں
 پھر آئینے میں چوم لیا اپنے آپ کو
 (محمد سلیم.....بھیر سوڈیاں)

نہ وہ اقرار کرتا ہے نہ وہ انکار کرتا ہے
 ہمیں پھر بھی گمان ہے وہ ہمیں پیار کرتا ہے
 (ساجدہ بان خاں لے ڈی.....کھڑیاں خاص)

چرخوں سے دوستی کا یہ صلہ کم تو نہیں
 اک شکستہ آئینہ جو رہتا رہتا ہوں میں
 (اسحاق انجم.....نگن پور)

وہ فحش چھڑتا ہے تو برسوں نہیں ملتا
 ملتا ہے پھر ٹوٹ کے ملتا بھی بہت ہے
 (محمد کمال.....روڈہ قمل، خوشاب)

☆☆



تجھ سے سب کچھ کہہ کے بھی کچھ ان کہی رہ جائے گی
مفتگو اتنی بڑے کی کچھ کی رہ جائے گی
اپنے لفظوں کے سبھی تجھے دینے کے بعد
آخری سوغات میری خاموشی رہ جائے گی
کشتیاں مضبوط سب بہہ جائیں گی سیلاب میں
کانڈی اک ناؤ میری ذات کی رہ جائے گی
حرص کے طوفان میں ڈھے جائیں گے سارے محل
شہر میں درویش کی اک جھوپڑی رہ جائے گی
رات بھر جتا رہا ہوں میں سبیل اس آس میں
میں تو بچہ جاؤں گا لیکن روشنی رہ جائے گی
(انتخاب: ایس حبیب خان.....کراچی)

آکھ سے آلسو نمایاں نہیں ہوتے
تیری بے وفائی سے ہم پریشان نہیں ہوتے
تم سلامت رہو ہمیشہ پھولوں کی طرح
گزرے ہوئے لمحے پھر مہریاں نہیں ہوتے
تیری دید میں سبھی دشمن پائے ہیں
کسی طرح ہم یوں بھی حیراں نہیں ہوتے
بدلی ہے آسمان نے نگاہ ہم سے آج
اپنی سوچوں سے ہم جواں نہیں ہوتے
سحر ہوئی تو ہمیں نیند آنے لگی پھر
فاصلے وفا کے تیرے میرے درمیان نہیں ہوتے
فریب دے گیا کسی کا سایہ بھی ہمیں جاوید
بھولے سے تیری ذات سے ہم بدگماں نہیں ہوتے
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

رضائے خالق برحق بدل نہیں سکتے
جو حادثات مقدر ہیں مل نہیں سکتے
بہت سے لوگ ہیں کوشاں مگر یہ کون کہے

جراخ تیز ہواؤں میں جل نہیں سکتے
گزار زندگی اب قبر میں اسیر ہوں
یہ وہ بھنور ہے کہ جس سے نکل نہیں سکتے
جہاں تصرف شر ہو وہاں زمینوں سے
نہجی بھی خیر کے ختے اہل نہیں سکتے
ڈھلے بغیر نہیں ہے کوئی سبیل مگر
زمانے ہم تیرے سانچے میں وصل نہیں سکتے
رواں دواں ہے زمانہ انہیں کھلنے کو
گریں جو راہ سفر میں سنبھل نہیں سکتے
سمجھ میں آیا نہ واجد نظم بارغ جہاں
شجر کچھ ایسے یہاں ہیں جو کھل نہیں سکتے
(پروفیسر ذاکر واجد گنوی.....کراچی)

بارش کی تیز ہوندوں نے جب دستک دی دروازے پر
محسوس ہوا تم آئے ہو انداز تمہارے جیسا تھا
ہوا کے ہلکے جھوکے کی جب آہٹ ہوئی کھڑکی پر
محسوس ہوا تم آئے ہو انداز تمہارے جیسا تھا
میں تھا چلا جب بارش میں اک جھوکے نے میرا ساتھ دیا
میں سمجھا تم ہو ساتھ میرے احساس تمہارے جیسا تھا
پھر رک گئی وہ بارش بھی رہی باقی نہ آہٹ بھی
میں سمجھا مجھے تم چھوڑ گئے انداز تمہارے جیسا تھا
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

رم	جسم	کرتی	بادل	آکھیں
ترے	پیار	میں	پاگل	آکھیں
کسے	پتے	پتے	پتے	دیکھیں
روٹی	روٹی	کاہل	کاہل	آکھیں
کس	نے	آخر	روگ	اکا
کیوں	ہیں	تیری	جل	تھل
تیری	یاد	میں	جاگ	رہی
میری	پوچھل	پوچھل	پوچھل	آکھیں
مجھ	کو	فلک	یاد	ہے
اس	کی	قائل	قائل	آکھیں

(فلک زاہد.....لاہور)

پورا ہو جائے وہ کام کیا
آدھا رہ جائے وہ انتقام کیا
کام نہ آئے وہ پڑھنا کیا
اس میں منزل نہ ہو وہ آگے بڑھنا کیا
راہ سے ہٹک جائے وہ راہی کیا
اس میں ہمت نہ ہو وہ سپاہی کیا
چھوڑ جائے وہ سہارا کیا
بچھپ جائے وہ بنانا کیا
پورا ہو جائے وہ خواب سہانا کیا
دے اس فانی دنیا کو اے الماس
ہمت نہ دے وہ حوصلہ کیا
(الماس خویہ.....لاہور)

کرتے رہے ہم پہ ستم کرنے کی تمنا
کرتے رہے ان پہ سدا سرنے کی تمنا
دل نے خود کشی کو ڈبونے کی ہے غنائی
تی کو ہے موجوں پہ ابھرنے کی تمنا
بڑے تیرے شانوں پہ دلفنوں کی گھٹائیں
میرے ہاتھ سے ان کو بھی سنوے کی تمنا
اس کی تمنا ہے کہ میں توج لوں اس کو
کی ہے کچھ روز گھرنے کی تمنا!!
سر کبھی اونچوں کو دکھاتا رہا نیچا
سر کو ہے اب جاں سے گزرنے کی تمنا
دل کی محبت کی قسم کھائے نہ بدلے
گام ہے دل کو مرنے کی تمنا
یہ الگ بات کہ خود گل ہی اڑا دے
کب کرتی ہے بکھرنے کی تمنا!
(محمد حنیف شاہر.....بھاگدالی ننگا نہ صاحب)

کی سمت نظر جائے تو کیا ہوتا ہے
کسی کی یاد میں گزر جائے تو کیا ہوتا ہے
معلوم ادا سے وہ مجھ سے پوچھتا ہے یارو
کوئی دل میں اتر جائے تو کیا ہوتا ہے

اے میرے مولا ذرا سا تو بتا دے اس کو
آدی جیتے جی مرجائے تو کیا ہوتا ہے
کوئی انجان سے محض کا پھر کسی پچھلے پھر
عکس آنکھوں میں ٹھہر جائے تو کیا ہوتا ہے
ورد دے کر وہ مجھے ہنستا رہا اور بولا
ورد جب حد سے بڑھ جائے تو کیا ہوتا ہے
عشق میں جان چلی جاتی ہے چلی جائے گی
اس راہ گزر کا تو آصف شہزاد مکی انجام ہوتا ہے
(محمد آصف شہزاد الہ آبادی.....قصور)

ہر وقت تیری ہی باتیں، تیرا ہی ذکر کرنا
اب کام ہمارا ہے تیری ہی فکر کرنا
کبھی تو تم ہم غریبوں کی صدا سنا کرو
کس جرم کی سزا ہے اتنا تو بتا دو
مانا کہ ہوئی خطا، جو چاہا تجھے خود سے زیادہ
اقرار جرم کر لیا ہے، در گزر ہماری خطا کرو
یہی سوچ رہے ہیں، ہم آفرین
کریں مفتگو کی کہاں سے ابتدا
کوئی گستاخی نہ ہو جائے کرنے میں الفاظ ادا
وہ میرا اور ہم کونکہ ہیں وہ کہاں اور ہم کہاں!
کریں ہم مفتگو ساتھ ان کے آفرین
ہماری اتنی اوقات ہے کہاں!
جی چاہتا ہے آنکھوں میں چھپا لوں تم کو
بسا کے دل میں پلکوں پہ سجا لوں تم کو
(راہجہ آفرین.....لاہور)

محبت چیز کیا ہے سوچتی ہوں میں
کبھی مدوش ہو جاتی ہوں اس کو کھوجتی ہوں میں
کبھی شک کی نظر سے دیکھتی ہوں میں
محبت جان بھی ہے اور دشمن جان کی بھی
کبھی یہ چین دیتی ہے کبھی یہ درد کا ٹھنڈا دیتی ہے
کلیجہ پھاڑ دیتی ہے یہ کبھی ہمدرد ہوتی ہے
ہمارے ساتھ ہستی ہے ہمارے ساتھ روتی ہے

کبھی یہ سایہ بن کر ساتھ چلتی ہے
کبھی یہ آگ بن جاتی ہے
اور جسم و جاں میں بھتی ہے
ہمارے ہی لہو کو لپی کر لیتی ہے
محبت چڑ کیا ہے سوچتی ہوں میں
(رنگ نور..... فیصل آباد)

گلی دل گلی ہو تو کیا کیجیے
اگر غم خوشی ہو تو کیا کیجیے
بنوں کھل کھلا کے یہ سوچا تو نے
ہنسی چچ سی ہو تو کیا کیجیے
یہ دل رو رہا ہے مگر درد سے
لیوں پر ہنسی ہو تو کیا کیجیے
ترے پاس سب کچھ ہے فضل خدا
وقا کی کسی ہو تو کیا کیجیے
پتنگ کی طرح کٹ کے اڑتے رہے
ہوا سر پھری ہو تو کیا کیجیے
اقتیاد یاں حسرت تڑپ اور غم
یہی شاعری ہو تو کیا کیجیے
(ایس اقبال احمد..... کراچی)

جتنے لے ہم سز سب مہیاں لے
جتنے بھی دُغم لے سب بے نشان لے
پیاے تھے جب تو ایک قطرہ بھی نہ ملا
اب کے تو دریا بھی سب بے کراں لے
یوں تو رہے ساتھ وہ سائے کی طرح
مگر جب آواز دی رستے دیہاں لے
بھولنا بھی چاہیں نہ بھول پائیں گے
ہم کو اپنوں سے ایسے کچھ احساں لے
رو رو کے سنائیں گے یہ میری کہانی
میرے لفظوں کو کبھی جو زباں لے
جاں اس لیے دی ہم نے وفا کے نام پر
میدانِ عشق میں ہماری داستان لے
(انتخاب: ڈاکٹر اناعامر شہزاد..... ننکانہ صاحب)

دل کی بات لیوں پر لا کر لب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا ہے اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں
بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں
ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دینا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں
جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کیلئے بدنام ہو نہ
آج وہی ہم سے پیگانے پیگانے سے رہتے ہیں
وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزر اٹھا
اس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں
(انتخاب: نجم اسحاق انجم..... سکسٹن ہاؤس)

میں نے تمہیں بہت چاہا مگر تم نے ہی نہیں
بہت کوششیں کیں مگر یہ فاصلے مٹے ہی نہیں
جھولی پھیلا کر تمہیں مانگا خدا سے میں نے
مگر خدا نے میری کسی دعا کو سنا ہی نہیں
ہر ایک سے پوچھا تیرا نہ ملنے کا سہرا
ہر ایک نے بتایا وہ تیرے لئے بنا ہی نہیں
میں نے تمہیں بہت چاہا مگر تم کسی اور کے ہر لمحہ
شاید کے اس جہاں میں وفا کس سلسلہ ہی لیں
(محمد شیریں یونس..... مہرٹ والا)

پیری نظر سے اس وطن کو
رنگین پھولوں کی بہاروں کو
پیاں صحراؤں کی سیراب میں
پانچ دریاؤں کو آبشاروں میں
مبا پنجاب کے کشور میں
صورت جنت کی اس کی شیا میں
مذہب کا جمال ظہور
دروازہ آمد اسلام کا وہ
موسموں کی تو بہار
باد صبا اور زت بہار
طلطنہ چاروں صوبوں کے
آدرش گوکب کوہ کوہ
شام سہانی لاہور شہر میں

من من دھن دھن
کبھی 65 کبھی 71 کی جٹوں کے جذبات دیکھو
اب تو اور بھی دشمن کو منہ توڑ جواب دیکھو
اپنی دھماکہ یا پھر غوری میزائل کا شاب دیکھو
(غلام مصطفیٰ بادل۔ قصور)

نئے زندگی کا شعور تھا تیرا کیا بنا
خاموش کیوں ہے کچھ تو بتا تیرا کیا بنا
نصیب سے جو تیری جنگ تھی میری بھی تو تھی
تو کامیاب نہ ہو سکا تیرا کیا بنا
منزلوں کی تلاش تھی سو چھوڑ گئے
چمڑ کے تھ سے بھگ گیا تیرا کیا بنا
تو مقابلے میں شریک ہوا تھا اس لئے
لی مجھ سے آکر پوچھتا تیرا کیا بنا
معلوم تھا شکایت میرا نصیب ہے
تو امیدوار تھا نصیب کا تیرا کیا بنا
(محمد انبال۔ روڈہ محل، خوشاب)

تیرے بارے میں سوچتی ہے یہی بہت ہے
جو میں دیکھوں تو وہ دیکھتی ہے یہی بہت ہے
خود کو میرا نہیں سمجھتی تو کوئی غم نہیں
مجھ کو اپنا تو مانتی ہے یہی بہت ہے
دل میں اس کا مجھ سے ملنا ضروری نہیں
تھ سے خوابوں میں ملتی ہے یہی بہت ہے
وہ میری نہیں ہوتی تو یہ میرا مقدر
میں تو اس کا ہوں یہی بہت ہے
اداسی کو نہیں چاہتی تو کوئی بات نہیں
چاہت کو تو مانتی ہے بس یہی بہت ہے
(عجب گل اداسی۔ ٹنڈوالہ یار)

لاؤ مجھ کو
جگہ کبھی یاد بھی نہ کیا
رنگاؤ مجھ کو

جگہ کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھا
دول کا پہرہ کچھ اس طرح تھا مجھ پر
راگی میں، صبح و شام اس میں رو کر

درد بڑھتا ہی گیا اور
کبھی کم نہ ہوا
میری سانسیں تنم گئیں پراس کا
انتظار بھی ختم نہ ہوا
لکڑیاں مجھ پر رکھ کر سب نے
مردہ مجھ کر گئے جلادیا
اور اس کے اعتبار کی قبریں
مجھ کو فنا دیا!
مجھ کو فنا دیا!

(کائنات رنگ نور۔ لاہور)

تجھے عشق ہو خدا کرے
کوئی تھ کو اس سے جدا کرے
تیرے ہونٹ مسکرانا بھول جائیں
تیری آنکھیں پر غم رہا کریں
تیرے خواب ٹھہریں ٹوٹ کر
تو کرجی کر کہنی چتا کرے
تجھے عشق ہو پھر یقین کرے
اسے تسلیوں پر بڑھا کرے
میں کوں عشق ڈھونگ ہے
تو نہیں نہیں کہا کرے
تجھے عشق ہو خدا کرے

(نضر حیات۔ روڈہ محل)

تیری جانب اگر چلے ہوتے
ہم نہ یوں در بدر ہوتے ہوتے
ساری دنیا ہے میری مٹی میں
کون آئے گا اب تیرے ہوتے
اور اب کیوں نہیں نبھاتے تم
اتنے وعدے نہیں کیے ہوتے
پالیا میں نے ساری دنیا کو
گوئی خواہش نہیں تیرے ہوتے
اس کی آنکھوں میں بار پانے کو
کاش ہم خواب بن گئے ہوتے
(انتخاب: ناسر محمد خالد عباس۔ ننکانہ صاحب)
☆☆

ویران مندر

شہزاد خان - صادق آباد

سادھو کے مرتے ہی عجیب و غریب آوازیں تہہ خانے میں گونجنے لگیں، کان پھاڑ آوازیں جسم و جان پر سکتہ طاری کر رہی تھیں اور پھر سادھو کا سیدھایا ہوا جادوئی انسانی بھیڑیا چیخنے لگا اور پھر.....

دل دہلائی ہوش اڑاتی رگوں میں لہو نچھوڑ کر تیرا انگیز اور حیرت ناک کہانی

چاند گھوڑوں کی ہنسی پر سیاہ لبادہ لوٹھے اور لمبا گھونٹ نکالے ایک پراسرار شخص تیزی سے چابک لہراتے گھوڑوں کو بھاگنے چلا جا رہا تھا۔ درات کا آخری پہر تھا اور چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب سے حیرت ناک بات یہ تھی کہ زمین پر گھوڑوں کے قدموں کے نشان نہیں بن رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں اڑتے جا رہے ہوں۔ آسمان پر کھینک کھینک سیاہ دھول لہراتے پھر رہے تھے اور جب کبھی چاند کے سامنے آ جاتے تو بل بھر کے لئے اندھیرا چھا جاتا ایسا بار بار ہو رہا تھا لیکن گھوڑوں کے بھاگنے کے انداز میں ذرا برابر فرق نہیں آتا تھا۔ راست کچا تھا اور ان کا رخ سامنے نظر آنے والے کھنے جنگل کی طرف تھا۔ باوجود اس کے کہ ان کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے لیکن وہ اپنے پیچھے گرد و غبار کا ایک گہرا طوفان چھوڑتے جا رہے تھے۔ بڑی عجیب و غریب قسم کی سواری تھی۔ کہ چوان وقفے وقفے سے چابک لہرا کر ان کی پیٹھ پر مارتا تو بل بھر کے لئے وہ چابک کی آواز سن کر اچھلتے پھر اور زور لگا کر دوڑنے لگتے۔ کچھ ہی دیر میں وہ جنگل کے نزدیک پہنچ گئے۔

رات کی تاریکی میں جنگل کا منظر اچھوں اچھوں کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور موسم میں قدرے شہدک کا احساس ہو رہا تھا۔ جنگل

کے نزدیک پہنچتے ہی کوچوان نے انہیں دائیں طرف نظر آنے والے راستے کی طرف موڑ دیا۔ گھوڑے اس کا اشارہ پاتے ہی اس طرف مڑ گئے۔ تقریباً تین فٹ چوڑا راستہ تھا۔ گھانا جنگل کے اندر جا رہا تھا جس پر وہ بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ فاصلے کرتے جا رہے تھے وہ پہلے دور بہت دور ایک پرانی عمارت کے آثار واضح ہو جا رہے تھے۔ چونکہ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا اس لئے جنگل کے اندر تک بھی پہنچی ہوئی تھی۔ درختوں کے حساب سے چند منٹوں میں وہ اس عمارت کے نزدیک پہنچ گئے۔ کہانی نے لگا میں کھینچ کر انہیں روک دیا۔ گھوڑے یوں رک گئے جیسے چابی ختم ہونے پر کھلنے۔

شکل سے عمارت کوئی بہت ہی پرانا مندر تھا۔ سال دس رہی تھی۔ کسی دور میں شاید یہ کوئی شاندار مندر ہو گا لیکن موجودہ گردش حالات میں اسے دیکھ کر خوف طاری ہو گا تھا۔ عمارت کی لگ بھگ پچیس کے قریب بیڑھیاں اور ان کے دروازوں کی طرف دو کول ستون بنے ہوئے تھے۔ ان پر مانوس زبان میں الفاظ کندہ تھے۔ مندر کے مین گم کے عین درمیان ایک پرانی وضع کا گھنٹہ لٹکا ہوا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا یا شاید اندھیرے کی وجہ سے۔ اس کا اصل دسے رہا تھا۔ کوچوان نے نیچے اتر کر کھنسی کے پتے پھاڑے۔

منہوں میں تیز ہوا کی نظر ہو گئے تھے۔ گرد و غبار کے طوفان میں آنکھیں تک کھولنا بہت مشکل ہو رہا تھا منہ اور ناک میں تیزی سے مٹی چسپائی جا رہی تھی۔ لاجپت سنگھ نے اس کی آواز سن کر اس کی آغوش میں ایسا کرنا نامکن دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ اس کے کان میں ایسا آواز سنائی دی جیسے کوئی اسے دائیں طرف جانے والے راستے کی طرف بڑھنے کا کہہ رہا ہو۔ پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم خیال کیا لیکن بار بار اسے ایک ہی آواز سنائی دی جانے لگی تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیلوں کا رخ اپنے دائیں طرف موڑ دیا۔ تیل بڑی مشکل سے سیدھے راستے سے ہٹ کر دوسرے راستے کی جانب بڑھنے لگے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ طوفان کی رفتار میں کمی آنے لگی اور پھر اچانک طوفان یوں ر ک گیا جیسے کسی آبیائی نہ ہو۔

جھڑپتی تیزی سے آتی آتی ہی تیزی سے غائب ہو گیا اور سامنے ایک بہت ہی پرانا مندر دکھائی دیا۔ سات کی تاریکی چھیننے سے اس کی عمارت انتہائی خوفناک لگ رہی تھی۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں ڈوبا اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اسے بہت زور سے کسی نے دھکا دیا وہ اچھل کر تیل گاڑی سے نیچے زمین کی طرف گرا اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی مندر کی سامنے کی دیوار چوٹی اور ایک خوفناک عورت کا آدھا دھڑ باہر نکلا جس کی آنکھوں کی سیاہ چٹیلں غائب تھیں۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ نے پلک چپکتے ہی اس نے بوڑھے کی گردن و بوجھ لی۔ اتنا فاصلہ ہونے کے باوجود اس ہاتھ نے اس کی گردن کو یوں و بوجھ لیا تھا جیسے وہ اس کے انتہائی قریب موجود ہو۔

یہ دیکھ کر تیل گاڑی میں موجود اس کی بیٹی دہشت زدہ ہو کر چیخنے چلانے لگی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی طرح اس عفریت سے اپنے بوڑھے باپ کو بچائے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت نے اس کے باپ کو گردن سے دبوج کر عمارت کے اندر گھسٹ لیا اور دیوار برابر ہو گئی۔

رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تھا اور اس

دہشت ناک تنہائی میں اس کے چیخنے چلانے کی آوازوں کی بارگشت در در و تک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اس کی مدد کے بجائے بہت سی چکاؤں اپنے پر بٹھ پڑتی ہوئیں مندر سے نکلیں اور فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ ابھی اس کی آواز کی بازگشت شمع بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے کپڑوں میں شعلے بھڑک اٹھے وہ گھبرا کر تیل گاڑی سے نیچے کودی اور نہ چاہتے ہوئے بھی سیدھی سامنے نظر آنے والے مندر کے دروازے کی جانب بھاگنے لگی اس کے کپڑوں سے اٹھنے والے شعلے اس کے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ اسے مندر کے اندر لیٹانے کے لئے ہی ایسا کر رہے تھے۔ وہ جتنی چلائی مندر کی بیڑھیاں ہتھی ہوئی سیدھی جن میں کچھ تھکی۔ سامنے کے رخ ایک تنگ ساراستہ دکھائی دے رہا تھا جس کے آگے خشک چٹوں کا ڈھیر بڑا تھا جس پر ایک کالا بلا بیٹھا اپنے بچوں پر لگا خون چاٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ شعلے اب بچے تھے وہ خوف زدہ نظروں سے اس کا لے بلے کی طرف دیکھ رہی تھی اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور اس کے جسم کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔

بلا یوں خون چاٹنے میں مصروف تھا جیسے اسے صرف اسی کام کے لئے رکھا گیا ہو۔ وہ ہولے ہولے ایک جانب کھٹکتے لگی۔ "بھاگ کر کہاں جا رہی ہو یہاں آنے کا راستہ ہے لیکن واپسی کے لئے جان کی قربانی دینی ہوگی۔" بلے کے منہ سے انسانی آواز سن کر اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ باہر مندر کے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

رات کے تقریباً دو بجے کا وقت ہو گا جب ایک تاریک تہہ خانے میں ایک کھوئی سے ایک انسانی بھیڑیا لوہے کی زنجیروں سے بندھا غرا رہا تھا اس کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بھی وقت زنجیروں کو توڑ کر فرار ہو جائے گا اس کے جسم پر رینگھ کی طرح بھورے بال تھے جو گرد و غبار سے اٹے پڑے تھے تہہ خانے میں صرف ایک روشندان بنا ہوا تھا جس میں سے چاند کی چاندنی ایک فٹ چوڑے چکر ہالے کی صورت میں فرش پر پڑ رہی تھی اس کے

علاوہ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ چاند ہولے ہولے اپنی منزل طے کر رہا تھا اور پھر جیسے ہی اس کے آگے آنے والے بادل سر کے اس نے زنجیروں کو ایک زوردار جھکا دیا اور زنجیروں کے ٹوٹنے ہی وہ تیزی سے اچھلتا کودتا تہہ خانے کی بیڑھیوں کی جانب بھاگ گیا۔ جن زنجیروں سے وہ بندھا کچھ دیر پہلے انتہائی بے بس دکھائی دے رہا تھا وہی لوہے کی مضبوط زنجیریں چاند کے پوری طرح نمودار ہوئے ہی کچھ دھماکوں کی مانند ثابت ہوئیں۔

یہ اسی مندر کے تہہ خانوں میں سے ایک اور تہہ خانے کا منظر تھا جہاں کچھ دیر پہلے ایک کالا بلا موجود تھا اور وہاں کچھ ان ایک تابوت کے گرد اٹھ رہا تھا۔ اس عجیب و غریب مندر میں نہ جانے کتنے تہہ خانے تھے اور وہاں کیسے کیسے اسرار جنم لے رہے تھے۔ یہ تو خدائی بہتر جانتا تھا۔ لیکن جس طرح بے درپے واقعات پیش آ رہے تھے اس سے یہ یقین ضرور ہو گیا تھا اس پر اسرار اور دیران مندر میں بہت خوفناک اور گھناؤنا کھیل کھیل رہا تھا۔ اس مقام پر بنے ہوئے اس بڑے مندر میں نہ جانے کیسے حالات پیش آئے ہوں گے کہ لوگوں نے اسے یوں دیران چھوڑ دیا تھا۔ کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ انتہائی مقدس اور قابل احترام ہوتی ہے جس کا احترام ہر مذہب کا پرچار کرنے والوں پر لازم ہوتا ہے نہ جانے ایسے کیا نامساعد حالات پیش آتے ہیں کہ لوگ اپنی عبادت گاہوں کو یوں دیران چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور بعد میں آسیب اور بری آتماں ایسی دیران پڑی ہوئی عمارتوں یا عبادت گاہوں میں بسیرا کر لیتی ہیں اور بعد میں خدا کی خلق کو خشک کرتی رہتی ہیں۔

اس دیران پڑے مندر میں بھی کچھ ایسی بری آتماں بسیرا ڈالے ہوئے تھیں جن کے کالے کقوت آہستہ آہستہ سامنے آتے جا رہے تھے۔ بیڑھیوں کے نزدیک پہنچتے ہی اس انسانی بھیڑیے نے ایک زوردار نگر سے لکڑی کے دروازے کو نگر مار کر گرا دیا اور اچھل کر باہر نکل گیا۔ چاروں طرف چاندنی کا سحر پھیلا ہوا تھا جس کی دودھیا روشنی میں ہر چیز گھسری گھسری لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے ہر چیز پر سفید پاؤڈر چھڑک دیا ہو۔ تہہ خانے

سے باہر نکلتے ہی اس انسانی بھیڑیے کا حلیہ ایک دم تبدیل ہو گیا اس کی ہاتھوں سے دو لمبے لہجے بانات باہر نکل کر اس کی ٹھوڑی تک لٹکتے گئے اور اس کی آنکھیں لیوڑی اور تڑپتی ہو گئیں جن میں سفیدی بڑھ گئی اور ہاتھوں کے ناخن کسی خونخوار بھیڑیے کے پنجوں کی مانند ہو گئے ایک نظر میں وہ کوئی خون آشام بھیڑیا ہی لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور دائیں طرف بھاگنے لگا اس کی رفتار درختوں کی بھول بھلیوں میں بھی اسی طرح تھی جیسے وہ کسی درختوں کے جھنڈ میں بھاگنے کی بجائے کسی سرک پر بھاگ رہا ہو۔ ٹھوڑی دیر میں درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور سامنے ایک انسانی آبادی نظر آنے لگی۔

تقریباً تیس چالیس گھروں پر مشتمل آبادی میں سے چند ایک مکانات میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ باقی گھروں میں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ درندہ بھاگتے بھاگتے ایک گھر کے قریب جا کر رک گیا اس کے منہ سے ہلکی ہلکی غراہٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں یوں لگتا جیسے کہیں قریب ہی دو کتے آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ کر غرار رہے ہوں۔ کچھ دیر تک کھڑے رہنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ ایک گھر کے دروازے کی جانب قدم بڑھائے اور اس کے نزدیک پہنچتے ہی ایک زوردار نگر سے لکڑی کا کھڑور دروازہ توڑ دیا۔ زوردار نگر کے سامنے دروازہ ریت کی دیوار ثابت ہوا اور مکان کے اندر کی جانب گر گیا۔

دروازہ ٹوٹنے کی آواز سنتے ہی محن میں لیٹے ہوئے افراد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کچھ دیر تک تو ان کی کچھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

لیکن جیسے ہی ان میں سے ایک بچے کی نظر اپنے سامنے نظر آنے والے ایک انسانی درندے پر پڑی تو اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اس کی دیکھا دیکھی گھر کے دیگر افراد نے اس درندے کو دیکھتے ہی چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس انسانی درندے نے ان کے چیخنے چلانے کی پرواہ کئے بغیر لپک کر اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھے ایک دس بارہ سالہ بچے کو اپنے پنجوں میں دبوجا اور لمبی لمبی چھلانگیں بھرتا دروازے کے کونے کے کونے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر تک تو گھر کے افراد کو کچھ ہی نہیں آیا کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں دم توڑ چکی تھیں لیکن جیسے ہی ان کے لاشعور نے انہیں اصل حقیقت دکھائی وہ دہشت سے چیخنے ہوئے اس درندے کے پیچھے گھر سے نکل گئے لیکن آگنی دیر میں وہ انسانی بھیڑیا ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور سامنے دو در و در تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا حالانکہ چاند کی روشنی میں ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی اور بہت دور جنگل کے درخت کسی دیو یوں کی مانند سر اٹھائے نظر آرہے تھے لیکن وہ انسانی بھیڑیا کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ یوں ہو کر وہ واپس گھر لوٹ آئے ان کے چیخنے چلانے کی وجہ سے آس پاس کے دیگر گھروں کے افراد بھی اٹھ کر ان کے گھر کے محن میں آ گئے ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ پیش آنے والے حالات کا سن کر دہشت زدہ نظروں سے مکان کے ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے آگنی دیر میں کسی نے وہاں کے خبردار کو بھی اطلاع دے دی جس کے نتیجے میں وہ اپنے دو محافظوں کے ساتھ اس وقت اس متاثرہ گھر کے محن میں بیٹھا ان سے پیش آنے والے حالات کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔

واقعہ سننے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سر کو بھی ہلارہا تھا اسے اس سارے واقعہ میں یہ بات کچھ نہیں آرہی تھی کہ جس قسم کے انسانی بھیڑیے کے بارے میں وہ لوگ باتیں کر رہے تھے اس قسم کے درندے کے متعلق اس نے آج تک نہ سنا تھا اور نہ ہی کسی اور شخص نے اس کی وہاں کے علاقے میں موجودگی کا ذکر کیا تھا۔ اور اسے یہ بھی پریشانی تھی کہ اب وہ اپنے گھروں کی حفاظت کیسے کر سکیں گے کیونکہ جس قسم کا حلیہ اسے بتایا جا رہا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انتہائی خونخوار اور طاقتور ہے اس کے باوجود اس نے تمام حالات جاننے کے بعد اپنے کچھ بندوں کو اسلحہ وغیرہ دے کر جنگل کی طرف جانے والے راستے پر روانہ کر دیا اس امید پر کہ شاید ابھی تک اس درندے نے اس معصوم بچے کو اپنی درندگی کا نشانہ نہ بنایا ہو اس کے آدمی اسلحہ لے کر جنگل کی طرف بھاگ گئے اور خبردار باقی بچ جانے افراد کے

ساتھ باتیں کرنے لگا۔

گھر سے باہر نکلے ہی وہ انسانی بھیڑیا اپنے بچوں میں بچے کو بوچے سپردی سمیت جانے کی بجائے اپنی باتیں جانب جانے والی ایک بکلی سی مگنڈری پر بھاگنے لگا۔ بکلی زمین ہونے کی وجہ سے اسے بھاگنے میں کوئی وقت نہیں ہو رہی تھی۔ خوف کی وجہ سے بچہ شاید بے ہوش ہو گیا تھا اور کسی بے جان کینچوے کی طرح اس درندے کی باتوں میں جھول رہا تھا۔ کھیتوں میں چاروں طرف گندم کی فصل کے خوشے لہرا رہے تھے اور سوندی سوندی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

چاند اپنے سر میں گن تھا چاند کی کاحر اسی طرح ہر چیز کو اپنے محرم میں جکڑے ہوئے تھا۔ ستارے خوف سے اپنی آنکھوں سے زمین پر بھاگنے والی مخلوق کو تک رہے تھے تقریباً آدھا میل تک بھاگنے کے بعد اس درندے نے اپنا رخ موڑا اور سامنے نظر آنے والے ایک بڑے سے برگد کے پتھر کے نیچے جا کر رک گیا۔ برگد کا پتھر دیکھنے میں انتہائی پرانا اور عمر رسیدہ لگ رہا تھا جس کی جڑیں جنہیں عموماً پتھیل ڈاڑھی کہا جاتا ہے زمین تک لگ رہی تھیں۔ بچے کو ایک جانب لٹا کر وہ درندہ زور زور سے اپنی گردن کو ایک دائرے میں یوں گھمانے لگا جیسے اس کی گردن میں غل پڑ گیا ہو۔ اس کے منہ سے نکلنے والی بھیا تک آوازیں بہت ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت سی چیزیں مل کر بین کر رہی ہوں۔

رات کا آخری پہرہ بیابان جنگل اور صحرا یوں پرانا برگد کا بوڑھا پیڑ ہے سوچتے ہی جسم پر کچھ طاری ہوتی تھی۔ منظر اچھے اچھوں کے ہوش اڑا دینے کے لئے تھا۔ اگر یہ منظر وہ نصیب بچا جاتی آنکھوں سے دیکھ لیتا تو شاید دہشت سے وقت سے پہلے ہی مر جاتا۔ اپنی گردن کو مسلسل دائرے میں گھماتے ہوئے اسے ابھی چند منٹ ہی ہو ہوں گے کہ یکدم جنگل میں بہت سے افراد کی آوازیں آئی دینے لگیں یوں لگتا تھا جیسے بہت سے افراد بھاگتے ہو۔ اسی طرف آرہے ہوں جنہی کبھی ٹارچوں سے نکلنے والی روشنیاں لہرائی ہوئیں دکھائی دیتیں۔ آوازوں سے پتہ چلا

تھا کہ وہ افراد زیادہ دور نہیں اور جیسے کچھ ہی لمحوں میں وہ وہاں پہنچ جائیں گے۔ آوازیں سنتے ہی اس درندے کے کپوترے کان آسمان کی جانب اٹھ گئے۔ وہ اپنا منہ اٹھا کر فضا میں مسلسل کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا پھیلا ہوا ناک تیزی سے سٹکار اور پچک رہا تھا اور پھر چند ہی لمحوں میں اس کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی اور اچھل کر چند افراد اس کے سامنے نمودار ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں ایک چٹائی پر وہ آڑھے ترچے انداز میں پڑی تھی یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بڑی بے دردی سے اسے زمین پر لا کر پک دیا ہو۔ اس کا ایک انگ بند سے تڑپ رہا تھا اسے صرف اتنا یاد تھا کہ اس کے سامنے ایک بھیا تک کالا انسانی آواز میں باتیں کر رہا تھا اور وہ یہ دیکھ کر وحشت سے بے ہوش ہو کر مندر میں تہہ خانے کے فرش پر ڈھیر ہو گئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے خود کو اس کمرے میں موجود پایاد ماخ میں پھنسا لیا۔ آگنی دیر وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی اور چاروں طرف نظریں گھمانے لگی۔ کمرے میں صرف اس چٹائی کے کوئی اور شے موجود نہ تھی حتیٰ کہ پینے کے لئے پانی تک موجود نہ تھا۔ پیاس سے اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور اسے اپنے حلق میں کاٹنے جیسے محسوس ہو رہے تھے۔ اور پھر یہ دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ کمرے کا کوئی دروازہ ہی نہ تھا چاروں طرف پاٹ دیواریں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کی چاروں دیواریں ایک دوسرے کی جانب چلنے لگی ہوں یہ محسوس کرتے ہی اس کا سانس بند ہونے لگا وہ سمجھ گئی کہ اگر یہی صورتحال رہی تو وہ ان دیواروں کے درمیان دب جائے گی اور اس کی ہڈیوں کا رمدہ بن جائے گا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگی لیکن اسے کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا۔

دیواریں باقاعدہ یوں چل رہی تھیں جیسے کوئی دور سے انہیں ریسموت کے ذریعے چلا رہا ہو۔ آہستہ آہستہ مسلک ہوتا جا رہا تھا اور پھر اس کچھ ہی منٹوں میں اس قدر کم کیا کہ اسے ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں یوں لگتا تھا

جیسے کوئی دور بیٹھا چرخ حرکت رہا ہو۔ اس نے دل ہی دل میں موت کو یاد کیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور کچھ دیر تک یوں بیٹھی رہی لیکن جب کانی دیر تک کچھ نہیں ہوا تو اس نے ہلکے سے اپنی آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دیواروں کا وہاں دور دور تک کوئی وجود نہ تھا اور کمرہ اسی طرح تھا جیسے اس نے پہلی بار دیکھا تھا اس نے اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور خاموشی سے ایک جانب بیٹھ کر آئندہ آنے والے حالات کا انتظار کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

اس عفریت کا پچھا کرتے کرتے بیس افراد کی ٹولی میں سے سات افراد ایسے تھے جو اس جانب نکل آئے تھے۔ کھیتوں میں چلتے چلتے وہ مسلسل باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ لالٹینوں کی روشنی میں مگنڈریوں پر چلنے کوئی مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ کچھ ہی قاصطے پر انہیں ایک بہت بڑا برگد کا درخت نظر آیا۔ پھر ایک خیال کے تحت انہوں نے اپنا رخ اس جانب موڑ دیا اور پھر جیسے ہی محسوس کر وہ اس پیڑ کے سامنے پہنچے تو دہشت سے ان کی جھپٹیں نکل گئیں۔ ان کے سامنے ایک بھیا تک شکل مخلوق اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی۔ اس سے کچھ دیر پہلے وہ خود اسے ڈھونڈ رہے تھے اور اب جبکہ وہ ان کے سامنے موجود تھی تا خوف سے ان کے تدم من من کے ہو گئے تھے اور انہیں اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔

انہوں نے سوچا کہ فوراً بھاگ کر اس عفریت سے اپنی جانیں بچائیں لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ ان کے قدموں نے زمین کو یوں بکڑ رکھا تھا جیسے متناطیس کی لوہے کو پکڑتا ہے۔ یہ دیکھ کر اس مخلوق نے ان کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔

☆.....☆.....☆

اس نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا ایک زوردار دھماکے سے پتیل کا گلاس اس کی پیشانی سے ٹکرایا وہ اس اچانک افتاد پر لوٹھا گیا اور فوراً اپنی پیشانی پر دایاں ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی اک تیز لہر اس کے سر میں اٹھ رہی تھی اور جہاں گلاس لگا تھا وہاں ایک سرخ گوشت خیزی سے ابھر گیا تھا۔ اس

نے درد سے کراہتے ہوئے محن میں کن انھیوں سے دیکھا تو روز کے معمول کی طرح اس کی زبان دراز بیوی اس کی ماں سے ابھی دکھائی دی۔ رشید بیٹے کے لحاظ سے ایک دوکاندار تھا جس کی شہر میں ایک چھوٹی سے دوکان تھی جس پر جزل اسٹور کے ساتھ ساتھ کریانہ کی چیزیں بھی تھیں۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی اسے ایک لمحے کے لئے بھی سکون کا سانس نہیں ملا تھا۔ ایک جاننے والے دور کے رشتہ دار کے توسط سے ایک غریب گھرانے میں اس کی شادی ہو گئی تھی۔

سر سال میں ساس اور بیوی کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ ساس اپنے مرحوم خاوند کی پیشین گوئی پر گرا کر کرنی تھی اور دو کمروں کے مکان میں سکونت پذیر تھی۔ شادی کے شروع کی دنوں میں اس کی بیوی نے انتہائی فرماں برداری سے کام لیا اور اس کا ہر کام پس منظر کر کرتی رہی۔ لیکن جیسے ہی اس نے محلے میں کچھ تاپ نہیدہ عورتوں کے ساتھ میل جول شروع کیا ویسے ویسے اس کی عادات اور رویہ تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اب وہ بات بے بات رشید سے جھگڑنے لگتی اور کبھی کبھی تو ایسا لگتا جیسے وہ اس کی بیوی نہیں بلکہ کوئی بیوی شیریں ہو جو کسی بھی لمحے موقع ملنے ہی اسے چہرہ ہار کر ہڑپ کر جائے گی۔ اور بیچ بات تو یہ تھی کہ رشید بھی کبھی کبھی اس کے سلوک سے خوف زدہ ہو جاتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کر لیتا۔

لیکن آج تو حد ہو گئی اور اس کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا جس کے نتیجے میں وہ اپنا سر پکڑے گھر کی دلیز پر بیٹھا اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ اسے یوں زمین پر بیٹھے دیکھ کر وہ دفتوں جھگڑتا بند کر کے کپکپ کر اس کی طرف بھاگیں اور اس کی ماں نے دوا لیا جاتے ہوئے اسے پکڑ کر زمین سے اٹھایا اور اپنے ہاتھ سے اس کی پیشانی مسلتے لگی۔ کمر پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی ہپکو کو کوسنے دینے لگی۔ بعد میں رشید کو سہارا دیتے ہوئے اندر کمرے میں بڑے ایک روٹھی پٹنگ پر لٹا دیا۔ اس کے لیٹنے ہی اسے دوپٹے کو ایک ٹولے کی شکل دے کر منہ سے ہونک مار کر گرم کیا اور جلدی سے اسے اس کی پیشانی سے لگا دیا۔

رشید درد سے تڑپ رہا تھا اس کا پس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہندو تھا نہ لڑکھائی اور وہ گریاں اپنی بیوی کے سینے میں ڈال کر

تا کہ ہمیشہ کے لئے یہ قصہ ختم ہو جائے۔ لیکن ایسا وہ صرف سوچ سکتا تھا اور عملاً ایسا کرنے سے قاصر تھا۔ ماں کے ہاتھ سے گرم کپڑے کی گھڑ سے اسے کچھ سکون ملا اور اس کی آنکھ گھٹی گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔ اسے سنا دیکھ کر اس کی ماں نے سکون کا سانس لیا اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے روز وہ محن میں بیٹھی سبزی بھاری تھی کہ اس کے گاؤں سے ایک عورت ملنے اس کے گھر آئی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی اور فکر مند دیکھ کر اس نے اس کی خبریت جاننا چاہی تو جیسے وہ کب سے گہری بیٹھی تھی کہ ہمدردی کے دو بول سننے ہی اس نے روتے روتے جیسے جیسے اس حالات تفصیل سے اسے بتا دیے۔ وہ عورت جیسے جیسے اس کے منہ سے باتیں ملتی جا رہی تھی ویسے ویسے اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی رام کہانی سن کر اس نے اسے شاہ بابا سے ملوانے کا کہا۔

"شاہ بابا!..... کیون ہے؟ رشید کی ماں نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے پوچھا۔" شاہ بابا..... ایک بہت پیچھے ہوئے بزرگ ہیں جو بھی اپنا دکھ ان کے پاس لے کر جاتا ہے وہ اس سے بہت فائدہ حاصل کر کے لوٹتا ہے۔ اس کے قبضے میں مہول ہیں جن کی مدد سے وہ بگڑے کام ستوارتے ہیں اور کبھی لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو ان سے مل کر اپنا مسئلہ بیان کر دو اور مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ اور اچھی بات یہ ہے کہ وہ اپنے کام کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لیتے۔" اس عورت نے تفصیل بتائی۔

"لیکن میں ان سے کیسے اور کہاں مل سکتی ہوں؟"..... رشید کی ماں نے جواب پوچھا۔ "اس کی تم فکر نہ کرو ان سے ملنے کی ذمہ داری تم مجھ پر چھوڑ دو میں ایک دوبارہ ان سے مل چکی ہوں اور میرے ساتھ تم آسانی ان سے مل سکتی ہو۔ تم جب چاہو میں تمہیں ان سے ملوانے لے جا سکتی ہوں۔" عورت نے جواب دیا۔ پھر کچھ دیر یونہی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے آپس میں شاہ بابا سے ملاقات کا وقت طے کیا اور بعد میں وہ عورت اس سے رخصت ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

اس کی نظر جیسے ہی نمودار ہونے والے افراد پر پڑی اس نے فوراً جنگل کی جانب دوڑ لگا دی۔ غالباً وہ اسے سارے افراد اور شور سن کر گھبرا گیا تھا اس لئے بھاگنے میں ہی عاقبت بھی سا اور دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ان میں سے دو تین افراد شور مچاتے اس کے پیچھے دوڑے لیکن پھر اپنے پیچھے سے واپس بلائے جانے کی آواز سن کر واپس پلٹ گئے۔ برگد کے درخت کے نیچے آڑے ترچھے انداز میں پڑے بیچے کو دیکھ کر وہ جلدی سے اس کی جانب بڑھے پہلے تو انہیں یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہو لیکن پھر ایک آدمی نے جب اس کی بغض پر ہاتھ رکھا تو یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ دی وہ زندہ تھا اور صرف بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ دو افراد نے اسے اٹھایا اور تیزی سے گاؤں کی جانب جانے والے لہجے سے پوچھ لیا۔

گاؤں میں ابھی تک ستارہ گھر میں کھرام چا ہوا تھا بیچے کے والدین پر خوش طاری تھی اور سارا محن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ گاؤں کا نمبر دار بھی کچھ محنتوں کے ساتھ وہیں موجود تھا اور اس کے والدین کیسلیاں دے رہا تھا۔ لیکن اسے اپنے بچے کا کھوکھلا دل واضح محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس خوشی و عفت کے سامنے بے بس تھا۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ باہر سے شورا اٹھا اور ایک آدمی تیزی سے بھاگتا ہوا ٹوٹے ہوئے دروازے سے نکل کر محن میں آن پہنچا۔ اس کے منہ سے خوشی کے مارے آواز نہیں نکل رہی تھی کچھ دیر سانس بحال کرنے کے بعد جب اس نے یہ بتایا کہ جنگل کی طرف سے کچھ افراد ہاتھوں میں بیچے کو اٹھائے چلے آ رہے ہیں تو یہ سن کر بہت سے لوگ بھاگ کر گھر کے باہر جمع ہو گئے اور بیٹھنے سے ان کا انتظار کرنے لگے۔ اور پھر انہیں چاند کی دودھیا روشنی میں جنگل کی طرف سے آنے والے راستے پر وہ سب نظر آ گئے۔ اور کچھ ہی دیر میں ان کے نزدیک پہنچ گئے انہوں نے بیچے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا ہوا تھا اور وہ ایک بیچے کی مانند ان کی باتوں میں جھول رہا تھا۔ محن میں داخل ہوتے ہی ان کے لئے ایک چار پائی بچھادی گئی تھی جس پر انہوں نے بیچے کو لٹا دیا۔

کچھ افراد بیچے کے والدین کو ہوش میں لانے کی

کوشش میں ان کے منہ پر پٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔ اور پھر چند ہی لمحوں کی محنت سے انہیں ہوش آ گیا اور جیسے ہی انہیں اپنے بیچے کی واپسی کا پتہ چلا وہ خوشی سے لہراتے اپنے بیچے کے پاس پہنچ گئے لیکن بیچے کو بے حس و حرکت دیکھ کر خوف زدہ نظروں سے گزرا اور کو دیکھنے لگے۔ نمبر دار کو جنگل سے آنے والے افراد نے پہلے سے ہی سب کچھ بتا دیا تھا کہ خوف کی وجہ سے بیچے بے ہوش ہے۔ نمبر دار نے انہیں تلی دی اور ایک شخص کو گاؤں کے حکیم کی طرف دوڑ لیا۔ ٹھوڑی ہی دیر میں حکیم اپنا تھیلہ سنبھالے نمودار ہوا۔ آتے ہی حکیم نے اس بیچے کی بغض ٹوٹی اور سر ہلاتے ہوئے تھیلے میں سے ایک پڑیا نکالی جس میں سفید رنگ کا سفوف تھا۔ اس نے پانی منگوایا اور پڑیا میں موجود تمام سفوف بیچے کا منہ کھول کر اس میں انڈیل دیا اور ساتھ ہی ٹھوڑا سا پانی بھی منہ میں ڈال دیا۔ پھر دمٹ تک اپنے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا۔

ابھی اسے منہ بند رکھے دمٹ بھی نہ ہوئے تھے بیچے نے ایک زوردار جھرمجری لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلتے ہی اپنے آس پاس ہجوم دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن تھاقت سے دوبارہ چار پائی پر گر گیا۔ اس کی والدین نے جیڑی سے آگے بڑھ کر اسے دوبارہ چار پائی پر لٹا دیا۔ اسے ہوش میں دیکھ کر دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ لوگ بعد تھے کہ ابھی اس طرح دوبارہ جنگل کی طرف چلایا جائے اور اس درندے کو تلاش کر کے موت کے گھاٹ اتارا جائے تاکہ وہ دوبارہ گاؤں میں داخل نہ ہو سکے۔

لیکن نمبر دار نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا کیونکہ اتنی رات گزر چکی تھی اور ان حالات میں جنگل میں داخل ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا کیونکہ ایسا نہ ہو کہ اس درندے کے چکر میں وہ لوگ اپنا کوئی نقصان کروائیں۔ پھر یہ فیصلہ طے پایا کہ کتنے دن کے اجالے میں جنگل کی طرف نکلا جائے اور اس موذی درندے کو تلاش کر کے ختم کر دیا جائے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی نمبر دار کے کہنے کے بعد تمام افراد اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔

آپا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

صبح کے تقریباً آٹ بجے کا وقت ہوگا جب اغیارہ افراد کا ایک دستہ ہاتھوں میں رائفلیں اور ٹارچیں لئے جنگل کی طرف جانے والے راستے پر چلا رہے تھے۔ یہ سب اسی مشابہ گاؤں کے افراد تھے جہاں گزشتہ شب ایک انسانی درندے نے ایک بچے کو اٹھالیا تھا لیکن گاؤں والوں کی ہمت اور بہادری کی وجہ سے وہ بچہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس وقت زندہ سلامت اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر میں موجود تھا۔

رات بچاغت میں یہی فیصلہ ہوا تھا کہ صبح ہوتے ہی اس انسانی درندے کو جنگل میں جا کر پکڑا لیا جائے اور اسے موت کے گھاٹ اتارا جائے تاکہ پھر کبھی وہ دوبارہ گاؤں میں آنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اور اسی نتیجے میں آج صبح وہ سب گاؤں کے نمبردار کی سربراہی میں اسلحہ سے لیس ہو کر جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گاؤں والوں کی پیشیاں انہوں نے اپنی اپنی کمرے سے لے کر لے کر لیں۔ اور کسی خطرے کے پیش نظر کہ کہیں انہیں جنگل میں رات نہ ہوجانے انہوں نے ٹارچیں بھی پکڑیں ہوئی تھیں۔ یہ تقریباً چار یا پانچ کے قریب پھیلا ہوا جنگل تھا جس میں جا بجا سفیدے اور سمنیل کے درخت تھے۔

گھمان ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں درختوں میں سے سورج کی روشنی زمیں پر پڑ رہی تھی۔ درندہ ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ درختوں پر چھپاتے پرندے اپنی اپنی دلیلیاں بول رہے تھے۔ چونکہ قریب کا جنگل تھا اس لئے کبھی کبھی انہوں نے یہاں کوئی خوشخوار جانور یا درندہ نہیں دیکھا تھا۔

لیکن گزشتہ رات اس انسانی درندے کی آمد نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ درندہ کہاں سے آیا ہے اور اب بھی جنگل میں موجود ہے یا راتوں رات کہیں اور چلا گیا ہے۔ ان سب سوالوں کا جواب تو انہیں اسی وقت ہی مل سکتا تھا جب وہ جنگل کے اندر جا کر اسے تلاش کرتے۔ یہ سب باتیں سوچتے ہوئے وہ جنگل کے کنارے کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ زمیں مٹی ہونے کی

مخالف سمت میں دھکیل دیا۔ ہاتھوں کے ناخن لمبائی کی وجہ سے مڑ گئے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کے منہ سے خوف کے مارے چیخ نکلی گئی۔ اس کے اچانک چپٹنے سے کمرے کی خاموشی میں بھونچال اُٹھ گیا۔ اور اس کی چیخ کی بازگشت کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ اس کا اس طرح چپٹنا اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا۔ اور ایک لخت وہ دونوں ہاتھ دوبارہ دیوار کے دوسری طرف غائب ہو گئے اور دیوار پھر سے برابر ہو گئی۔ وہ جو خوف سے اپنی آنکھیں بند کئے چیخ جا رہی تھی۔

جب اس نے کافی دیر تک یہ محسوس کیا کہ اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے تو اس نے یکدم اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تو کمرے کی چاروں دیواریں پہلے والی حالت میں تھیں اور وہاں اس کے علاوہ کوئی اور ذی روح موجود نہ تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور دوبارہ چٹائی پر بیٹھ گئی۔ بھوکے پیٹ ہونے کی وجہ سے اس پر غماز طاری ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں پوچھل ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ لہری ہوئی فرش پر ہی ڈیر ہو گئی۔ اس کے ذہن پر گرتے ہی سامنے کی دیوار میں ایک اچانک ایک دروازہ نمودار ہوا اور مرچ پر پائے جانے والی مخلوق سے ملتی جلتی شکل کے دو بونے آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور جلدی سے آڑھی ترچھی پڑی صغراں کو خاموشی سے اٹھایا اور دیوار میں نمودار ہونے والے دروازے میں سے لے کر نکل گئے۔

دیران مند زمین نہ جانے کیسے کیسے اسرار چپے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے اور خالی مکان بھی شیطانی روحوں کا گھانا گھنا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مندر کافی عرصہ سے دیران پڑا ہوا تھا اس لئے اس میں بھی بہت سی خبیث روحوں نے ڈیرے بجالائے تھے۔ جن کے اثرات آہستہ آہستہ کھلتے جا رہے تھے۔ لیکن سب سے عجیب بات تو یہ تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی کسی کو کسی کے کرواتوں کے بارے میں پتہ نہیں چلا رہا تھا۔ ایسا کیسے ممکن تھا اس مندر میں پائے جانے والی کوئی بھول بھلیوں کا کوئی کمال تھا۔ کہ وہ سب ایک دوسرے کے سامنے نہیں

جہ سے انہوں نے سوچا کہ شاید اس درندے کے قدموں کے نشان انہیں مل جائیں تاکہ ان پر چلتے ہوئے انہیں اس کا کوئی سراغ مل جائے لیکن یہ سب ان کی خام خیالی تھی کیونکہ مٹی زمیں ہونے کی وجہ سے اس پر مختلف جانوروں اور انسانوں کے قدموں کے نشان گنڈے ہو رہے تھے اس لئے ان میں یہ پہچان کرنا تقریباً ناممکن لگ رہا تھا کہ اس درندے کے نشانوں کو پہچانا جائے۔ اس پر وقت ضائع کرنے کے بجائے انہوں نے دائیں طرف دکھائی دینے جانے والے ایک کھدائے کی طرف نظریں دوڑائیں۔

وہ راستہ سیدھا جنگل کے اندر کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کافی عرصہ تک کسی نے اس پر سفر نہیں کیا ہو کیونکہ اس پر مٹی ہوئی تھی اور دھول کی چیخ بھرتا ہی تھی کہ اسے ابھی تک کسی انسان یا جانور کے قدموں نے نہیں چھوا۔ وہ بڑی حیرت سے اس راستے کو دیکھ رہے تھے۔ انسانی عقل سے بالاتر بات تھی جو اپنی پوری سچائی کے ساتھ ان کے سامنے تھی۔ کیونکہ جس جگہ وہ گھڑے تھے وہاں تو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی قافلہ یہاں کچھ دیر کے لئے ٹھہرا ہو لیکن اس کے ساتھ جڑے ہوئے راستے کو دیکھ کر وہ سب حیرت سے آنکھیں پھاڑے وہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک بت بنے رہنے کے بعد نمبردار کی آواز سنتے ہی وہ سب کتے کی کیفیت سے باہر آ گئے۔ نمبردار انہیں آگے بڑھنے کے لئے کہہ رہا تھا اس کی بات سنتے ہی وہ سب اس راستے کی طرف بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

رشید کی ماں اس عورت سے فارغ ہوتے ہی دوبارہ تاکہ پکڑ کر گھر واپس لوٹ آئی تو عید اس نے دوپٹے کے ساتھ باندھ لیا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی اس کی بو شاید باورچی خانے میں کھانا پکانے میں معروف تھی اس لئے اس نے اسے اندر آتے تو دیکھ لیا تھا لیکن وہ آتے ہی اندر کمرے میں کیوں گھس گئی تھی اس پر غور نہیں کیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی رشید کی ماں نے جلدی سے تعویذ کھول کر صندوق میں رکھ دیا۔ اور خاموشی سے واپس آ کر گھر میں بیٹھے تخت پر بیٹھ گئی۔ کسی کو کانوں کان

خبر نہ ہو سکی کہ وہ گاؤں میں کیا لیتے گئی تھی۔ پہلے تو رشید کی ماں نے سوچا کہ اکیلے ہی اس کا کام کوسر انجام دے لے لیکن وہ چونکہ ایک عورت تھی اور شاہ بابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اسے یہ تعویذ ایک پرانے قبرستان میں موجود بہت پرانی قبر پر رکھے ہوئے جلتے چراغ کے تیل میں ڈیونا تھا۔ اور پھر دس منٹ تک وہیں بیٹھ کر چراغ میں ڈوبے ہوئے تعویذ کی طرف دیکھتے رہتا تھا۔ تاکہ چراغ بجھ نہ جائے ورنہ اس کا اثر بے کار ہو جانے کا خطرہ تھا۔ یہ بات بھی اسے اس عورت کی رہائی معلوم ہوئی تھی۔ وہ سخت پریشانی میں سوچ رہی تھی کہ اس کام کے لئے اسے کس کو اعتماد میں لے ایک بار تو اسے خیال آیا کہ وہ اپنے بیٹے رشید سے مشورہ کرے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ وہ اس کام کے لئے ہرگز راضی نہ ہوگا اس نے یہ خیال جھٹک دیا۔

خیالوں کی خیالوں میں وہ اپنے محلے میں کسی ایسے شخص یا بچے کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی جو کچھ رقم کے عوض اس کے ساتھ قبرستان میں جا کر اسے یہ کام سر انجام دینے میں مدد دے سکے۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں ڈوبی ہوئی تھی کہ یکدم جمپا کے کی طرح ایک خیال اس کے دماغ میں ابھرا اور اسے فیکہ مہر کی کاچھو سامنے نظر آنے لگا۔ اس کی جوان بیٹی کی شادی نزدیک تھی اور ابھی پچھلے ہی دنوں جب وہ اپنی چہل چڑوانے اس کے پاس گئی تھی تو باتوں ہی باتوں میں اس نے ذکر کیا تھا کہ اسے بیویوں کی سخت ضرورت ہے اور اس نے اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے ایک بڑی مٹی خریدی ہے۔ یہ ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو ابھر آئے تھے۔

یہ خیال آتے ہی اس نے نیکے موچی کو اس کام کے لئے ماضی کرنے کا سوچا۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں غرق تھی کہ اس کے بہنے اس کے سامنے روٹی یوں لاکر رکھی جیسے تیل میں قیدیوں کو کھانا دیا جاتا ہے اس نے خون کے گھونٹ بھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور روٹی کی چٹکر میں رکھی روٹی کھانے لگی۔ وہ دل میں اس سے پچھا چھڑانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

دلچسپ سنگھ بہت خوش تھا کیونکہ ٹھیک دو دن بعد اس کی شادی اپنی پسند کی لڑکی پریت کو رہے ہوئے والی تھی۔ پریت کو وہاں کہ ایک کھیا دار سنگھ کی چھوٹی بیٹی تھی۔ اس سے بڑی دو اور لڑکیاں اور تھیں جو اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ اور بہت آسودہ زندگی گزار رہی تھیں اور اپنے گھروں میں بہت خوش تھیں۔ کوئی بھائی تھا نہیں اس لئے چھوٹی ہونے کے باعث پریت کو ان سب میں لاڈلی تھی۔ خاندان بھر کے سب افراد اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے نہ جھکتے تھے۔ بچکانے والے اس کے نین نقش اور رنگ روپ بھی ایسا دیا تھا کہ جو بھی اسے ایک بار دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اتنے حسن کی بدولت بھی پریت کو بہت باخلاق اور جادواری لڑکی تھی۔ خاندان بھر کے وہ افراد بھی جنہیں کبھی اسے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا اس کی پاکدامنی کی قسمیں کھاتے تھے۔ اس میں شک والی کوئی بات نہ تھی کیونکہ پریت کو حقیقت میں ایک بہت معصوم اور پاکدامن لڑکی تھی۔ اس کی انہی اچھائیوں کی بدولت خاندان بھر میں ہر کوئی اسے اپنی بہو بنانے کا خواہشمند تھا۔

بہت سے لوگ تو اس سلسلہ میں کئی بار رشتے بھی بھجوا چکے تھے۔ جن میں بہت سے ڈاکٹر، انجینئر اور پرنس مین بھی تھے لیکن کہتے ہیں تاکہ جوڑے آسمانوں پر پہنچے ہیں اس لئے ہر بار کوئی نہ کوئی روکاوٹ کھڑی ہو جاتی اور اس کے گھر والوں کی طرف سے ہی یا تو سوچنے کا وقت مانگ لیا جاتا یا پھر فوراً انکار کر دیا جاتا۔ دن بوی بھی ضرور ہے تھے کہ ایک دن گاؤں کے کھیا دار سنگھ کے گھر سے ان کے بیٹے دلچسپ سنگھ کا رشتہ آیا۔ دلچسپ سنگھ کہنے کو تو ایک مرد تھا لیکن اس کی ادائیں لڑکیوں سے بھی کہیں زیادہ تھیں وہ اس طرح شرماتا جیسے کوئی نئی ٹوبلی ڈھن کھونکھٹ میں شرماتی ہے۔ انتہائی پاکر دار اور باجیا لڑکا تھا۔

گاؤں میں ہر کوئی اس سے دوستی کا خواہشمند رہتا تھا۔ بہت سی لڑکیاں اس سے شادی کا ارادہ رکھتی تھیں لیکن اس نے کبھی بھی ان کی طرف جلی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ گاؤں کی تمام لڑکیوں کو اپنی بہنوں کی طرح سمجھتا تھا سوائے پریت کو کہ۔ پریت کو وہ ادا سنی لڑکی تھی جسے وہ چاہتا تھا

اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ پریت کو کونسی یہ احساس تک نہ ہوا تھا کہ کوئی اسے پانگی کی حد تک چاہتا ہے۔ ایک بار گاؤں میں بیساکھی کا میلہ تھا جس میں آس پاس کے گاؤں سے بہت سے افراد جن میں عمرتیں بچے اور بوڑھے بھی تھے میلہ دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ یہ میلہ ہر سال ان کے گاؤں رام گڑھ میں لگتا تھا یہ پورے تین دن ہوتا تھا اور خوب خوب روٹیں لگی رہتی تھیں۔ مختلف قسم کے کھانوں اور مٹھائیوں کے اسٹال لگتے تھے جن پر کئی رنگ پر کئی مٹھائیاں اور چیزیں لوگوں کا دل بہاتی اور وہ انہیں خرید کر لوہ کھا کر حمرے کرتے۔ لوگوں کی تفریح کے لئے مختلف قسم کے جھولے بھی لگائے جاتے جن پر مناسب ٹکٹ ہوتے تھے تاکہ ہر فرد اس سے لطف اندوز ہو سکے اس کے ساتھ وہاں تلوار بازی اور کشمی کے مقابلے بھی ہوتے جن میں کامیاب ہونے والے بہادروں کو گاؤں کا کھیا دار سنگھ خصوصی انعامات سے نوازتا۔ اور مقابلوں میں ہارنے والوں کی جگہ ہنسائی ہوتی اور وہ دوبارہ اس گاؤں میں آنے کا تصور بھی نہ کرتے۔

گاؤں کی آبادی تقریباً ڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن کی روزی کا ذریعہ زمین پڑتی تھی۔ بہت سے گھرانے کھیا کی زمینوں پر کام کاج کر کے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔ کھیا چونکہ ایک نیک دل انسان تھا اس لئے گاؤں کے ہر دکھ درد میں بھر پور ساتھ دیتا اور کبھی بھی کسی ضرورت مند کو اپنے گھر کی دلہیز سے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ اس سے بہت خوش تھے اور ہمیشہ اس کی لمبی زندگی اور صحت کے لئے دعا مانگتے تھے۔ گاؤں کے کھیا نے اس بار بھی بیساکھی کا میلہ بڑی دھوم دھام سے منانے کا بندوبست کیا تھا جس میں شرکت کے لئے اس نے آس پاس کے گاؤں کے تمام بچوں کو دعوت نامے بھجوائے تھے تاکہ وہ انہیں پڑھ کر اپنے اپنے گاؤں کے افراد کو اس میلہ میں شرکت کے لئے کہہ سکیں۔ جھولے والوں اور مختلف اسٹال لگانے والوں کو حسب دستور ہمیشہ کی طرح پیٹیا بات بھجوائے گئے تھے تاکہ وہ اپنی اپنی تیار یوں میں لگ جائیں اور کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو پائے۔ اس میلے میں ہر آدمی کی دلچسپی کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا اور اپنے طور پر کھیانے کچھ

افراد کو جو کھیا داری کی ذمہ داری بھی سونپی ہوئی تھی تاکہ وہ اس میلے میں کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کو جنم لینے سے پہلے ہی چل دیں۔ اس بار میلے میں دلچسپ سنگھ نے بھی تلوار بازی کے مقابلے میں حصہ لینا کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلہ میں اس نے اپنے باپو تارا سنگھ کو کہہ دیا تھا اور اسے اس کی اجازت آسانی سے مل گئی تھی کیونکہ تارا سنگھ کو اس کی مہارت کا بخوبی اندازہ تھا ایسا پہلی بار ہونے جا رہا تھا کہ دلچسپ سنگھ تلوار بازی کے مقابلے میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ نہ پہلے وہ صرف دیکھنے کی حد تک ہی ان مقابلوں میں شرکت کرتا تھا اور جیتنے والوں کی بھر پور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

دوسری جانب پریت کو اپنی بہنوں اور چند سہیلیوں کے ساتھ اس میلے میں شرکت کا پروگرام بنانے بیٹھی تھی اور اس سلسلہ میں اس نے اپنے باپو سے اجازت بھی مانگ لی تھی۔ وہ بڑی بے چینی سے بیساکھی کے میلے کا انتظار کر رہی تھی۔ تین دنوں کی مناسبت سے اس نے مختلف لباس بنائے تھے جسے دیکھ دیکھ کر اس کی دیگر بہنیں رشک کر رہی تھیں وہ سب حقیقت میں اس کی دیوانی تھیں۔ انہیں اپنی بہن پریت کو بہت سے بے انتہائی لگاؤ تھا۔ کبھی وہ بھی کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ باقاعدگی سے اس سے ملنے اپنے منکے آتی رہتی تھیں۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ان سب نے مل کر اس میلے میں شرکت کا پروگرام بنایا تھا۔ پھر ایک دن صبح کا سورج نکلنے ہی گاؤں میں شور مچا ہوا کہ میلے کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ لوگ تیل گاڑیوں، اور مختلف سواریوں پر سواریاں گڑھ کی جانب رواں دواں تھے۔ بہت سے افراد بیل ہی سفر کے لئے نکل پڑے۔ رام گڑھ چونکہ تین کلومیٹر تھا اس لئے اتنا فاصلہ بیل طے کرنا گاؤں کے لئے معمول کی بات تھی اس لئے وہ خوش گپیوں میں مصروف میلے کی جانب جا رہے تھے۔ پریت کو کہنے لگے اس کے باپو نے ایک بہترین سواری کا بندوبست کر دیا تھا جس میں ایک شاندار کبھی شامل تھی۔ وہ سب اس وقت خوش گپیوں میں مصروف کبھی میں سواریاں گڑھ کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ کبھی دھمے دھمے قدموں سے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تقریباً آدھا

محنت مسلسل سفر کرنے کے بعد وہ رام گڑھ پہنچ گئے۔ گاؤں میں بہت رش تھا۔ مختلف قسم کے کھانے پینے کے اسٹال لگے ہوئے تھے۔ ایک جانب بہت بڑا سٹج بنایا گیا تھا جو کہ وہاں کے سربچوں اور کھیاؤں کے لئے تھا۔ لوگوں کی تفریح کے لئے مختلف قسم کے جھولے بھی لگائے گئے تھے۔ کبھی کو ایک جانب کھڑا کر کے وہ سب اس سے اتر کر ایک جانب بنے ہوئے ایک حویلی نما گھر کی جانب بڑھ گئیں۔ اس حویلی میں اس کے باپو کے پرانے جانے والے رہتے تھے جب بھی گاؤں میں بیساکھی کا میلہ لگتا تھا تو وہ یہیں آن کر ٹھہرتے تھے۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنے اور تیار ہونے کے بعد وہ سب مل کر میلے میں نکلتے تھے۔ حویلی کے کینوں کو ان کے آنے کی خبر پہلے ہی کر دی گئی تھی اس لئے ان کے وہاں پہنچنے ہی اس کے کین ان کے استقبال کے لئے آنکھیں بھجائے کھڑے تھے۔ پریت کو کہنے کے باپو ہر سال اس حویلی کے کینوں کو سال بھر کا راشن ڈلوایا دیتے تھے جس میں چاول، مٹنم، مختلف قسم کی دالیں اور دسی گھی شامل ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ سب پریت کو کہنے کے باپو کے احسان مند تھے۔ اور بدلے میں جب بھی میلے میں پریت کو اور اس کے دیگر عزیز و اقارب کی شرکت ہوتی تو وہ بھی ان کی خاطر مددات میں کوئی کسر باقی نہ رہنے دیتے اور دل کھول کر ان کی خدمت کرتے اور اس طرح وہ ان کے احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش کرتے۔ پریت کو کہنے انہیں کبھی بھی ان کی حیثیت کا احساس تک نہ ہونے دیا تھا ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھی کیونکہ اس کی ذمہ داری طبیعت اور معصومانہ پن اس بات کا تین ثبوت تھا۔

شام ہو گئی تھی اور کچھ دیر تک حویلی میں سستانے کے بعد وہ سب میلے میں سیر و تفریح کے لئے نکل پڑے۔ میلہ لوگوں سے سمجھا چکے بھڑا تھا کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ سب گھومتے گھماتے اور آپس میں فی مذاق کرتے جا رہے تھے اور پھر ایک ایسے پنڈال کے سامنے جا کر رک گئے جہاں بہت سے لوگ ٹھہرا بیٹے کھڑے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انہی کچھ ہی دیر میں وہاں تلوار بازی کا مقابلہ ہونے جا رہا ہے جس میں آس پاس کے بہت سے گاؤں

کے سورا حصہ لے رہے تھے جن میں کچھ لوگ دلچسپ نگاہ کا نام بڑے صلاب اور فخر سے لے رہے تھے۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ دلچسپ نگاہ پاس کے گاؤں کے کھانا تیار کئے گا پینا تھا اور کھانا بازی میں اپنا جانی نہ رکھتا تھا۔ ان کی باتوں نے انہیں تجسس میں مبتلا کر دیا تھا اور انہوں نے وہیں ایک جگہ بیٹھ کر مقابلہ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

ابھی انہیں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک جانب سے شور مچا اور لوگوں کے جھرمٹ میں دس بارہ لمبے ترنگے افراد ہاتھوں میں تلواریں اٹھائے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ تلواروں کی دھماکہ دہن نہ ہونے کے باوجود خوب چمک رہی تھی نہ جانے کس قسم کی تلواریں تھیں۔ وہ سب تلواروں کو اپنے ہاتھوں میں لہراتے بہت پر جوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے پنڈال میں پہنچتے ہی ڈھول والوں نے زور شور سے اپنے ڈھول پیٹنے شروع کر دیے اور پھر ایک جانب سے ہل کی ہماری آواز گونجی جسے سنتے ہی پنڈال میں نظر آنے والے تمام افراد وہاں سے ہٹ گئے۔

باقی رہ جانے والوں میں صرف دس بارہ افراد ہی رہ گئے جنہوں نے مقابلے میں حصہ لینا تھا۔ پھر سر پہنچوں کے رد مال لہراتے ہی دو افراد اچھل کر پنڈال میں بنے ایک دائرے میں داخل ہو گئے اور ایک دوسرے کو خوشخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا۔ دیکھنے میں لگتا تھا جیسے وہ دونوں اپنے اپنے کام میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ دونوں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے اور چونکہ دونوں ماہر تھے اس لئے دونوں لکڑی کی زخم آئے تھے۔

مسلسل ایک گھنٹہ تک لڑنے کے بعد دونوں تھک ہار کر زمین پر گر گئے اور اس طرح ہارجیت کا فیصلہ کئے بغیر یہ مقابلہ برابر رہا۔ یکے بعد دیگرے سورا میں پنڈال میں آتے رہے اور اپنے اپنے ناؤ آزما رہے۔ ان میں سے دو سورا کامیاب رہے اور سر پہنچوں نے انہیں قانع قرار دیتے ہوئے نقد انعامات کا اعلان کر دیا۔ اعلان سنتے ہی کامیاب سورا کامیابی کے نشے میں دھست چلے گئے کہ ہل پنڈال میں اگر طعنہ دینے لگے اور لڑاکا نہ لگے کہ بھری پنڈال میں اگر کوئی مرد کاچہرہ ہے تو ان کے سامنے آئے اور انہیں شکست

دے کر دکھائے۔

لیکن تمام افراد تو یوں کھڑے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ابھی انہیں لڑاکا نہ چھوڑا تھا کہ کڑے ہوں گے کہ ایک خیر بدو جوان جس نے بڑا نہیں لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی ہاتھ میں تلوار پکڑے پنڈال میں داخل ہوا۔ اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر لڑاکا مارتے دونوں سورا چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ نو جوان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ان کے قریب آن کر رک گیا اور مخاطب ہوا۔ "..... تم میں دونوں کو پہنچ کرنا ہوں کہ اگر تم دونوں مجھے شکست دینے میں کامیاب ہو گے تو میں دو بیگھر زمین تم دونوں کے نام لکھ دوں گا اور اگر تم دونوں ناکام رہے تو تم خود اپنے ہاتھوں سے اپنے اپنے سر کے پال موٹھ دھو گے اور دوبارہ بھی اس گاؤں میں نہیں آؤ گے۔"

دلچسپ نگاہ نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "..... اس کی یہ بات سن کر وہ دونوں ہنس پڑے انہیں اس کی دماغی حالت پر رشک ہونے لگا کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ نو جوان چند منٹ پہلے ہی ان کے سامنے نہیں ڈٹ سکے گا۔ یہ نو جوان دلچسپ نگاہ تھا جو پہلے ہی تلوار بازی کے مقابلے میں حصہ لینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ان دونوں سوراؤں کی باتیں سن کر جوش میں پیدا ہوا پنڈال میں داخل ہو گیا تھا۔ سرخ جو مقابلہ ختم سمجھ کر کچ پرستہ ٹھننے والے تھے کہ ایک نو جوان کو پنڈال میں جاتے دیکھ کر دوبارہ اپنی اپنی نشست پر براجمان ہو گئے تھے۔ لیکن اتنی دور سے انہیں ان کی گفتگو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن ان کے انداز سے یہ ضرور ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی بات پر بحث کر رہے ہیں اور پھر کچھ ہی دیر میں ان دونوں نے آگے بڑھ کر اپنی اپنی تلواریں نضا میں لہرائیں اور یکدم اس نو جوان پر حملہ آور ہو گئے ان کے تیور دیکھتے ہی اس نو جوان نے بھی جلدی سے اپنی تلوار سنبھالی اور اگر وہ کافرہ فضا میں بلند ہوا اور ہلکی کی کوئندہ کی مانند اس کی تلوار چمکی اور ایک ہی وار میں ایک سورا کی تلوار لکڑی کی طرح آدمی کٹ کر ایک جانب گر گئی اور آدمی تلوار دے سمیت اس کے ہاتھ میں موجود تھی جسے وہ حیرت سے دیکھی اسے دیکھتا اور کبھی زمین پر پڑی تلوار کے ٹکڑے کو

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ایسا کیا ہوا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے منوں دھڑی ہتھوڑا اس کی کلائی پر مار دیا ہو۔ کچھ لمحوں تک تو کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ کیا ہوا لیکن معاملہ بھاپتے ہی فضا تالیوں سے گونج اٹھی۔ سورا کے پاس چونکہ اب لڑنے کے لئے کچھ نہیں تھا اس لئے وہ سکتے ہی کی حالت میں کھڑا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھتے ہی دوسرے سورا نے زوردار نعرہ مارتے ہوئے اس نو جوان پر حملہ کر دیا، حملہ اتنا شدید تھا کہ نو جوان کو سنبھالنے کا موقع ہی نہیں ملا اور تلوار کی نوک اس کے کندھے کو گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ چوٹ اتنی گہری نہیں تھی صرف کندھے کی تھوڑی سی کھال ہی چمک گئی تھی لیکن اس نو جوان اب سنبھل گیا تھا اس نے خود کو سنبھالنے ہوئے تیزی سے سینٹر بدلنا اور پلٹ کر جوابی وار کر دیا اس نے تلوار کا ہاتھ گھماتے ہوئے اس سورا کی کلائی پر وار کرنا چاہا۔

لیکن دوسری طرف بھی تلوار بازی کا ماہر تھا اس نے خود کو اس کے حملے سے بچاتے ہوئے جھکا کر دی اور ہاتھ لو پر اٹھا کر تیزی سے دوبارہ وار کیا اس بار اس کا نشانہ چوک گیا اور وہ گرتے گرتے بچا اور اس بات کا فائدہ لیتے ہوئے نو جوان نے تیزی سے اس کے سینے پر وار کر دیا۔ تلوار کی نوک دھار سے اس کے سینے پر پڑی اور سیدھی اس کو چیرتی ہوئے اندر گھس گئی سورا کے منہ سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور خون کا فوارہ بہہ نکلا خون تیزی سے بہنے کی وجہ سے اس پر نقاہت طاری ہونے لگی۔ پنڈال لوگوں کے زوردار نعروں سے گونجنے لگا اور کچھ لوگ بھاگ بھاگ کر پنڈال میں آئے لگے اور اس نو جوان کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔

پریت کو بھی سانس دھوکے کی تلوار بازی کا مقابلہ دیکھ رہی تھی اسے اس نو جوان کی بہادری بہت اچھی لگی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں سوراؤں کو چوٹ کر دیا تھا جو اپنے غرور کے نشے میں نہ جانے کیا کیا کر رہے تھے۔ بعد میں لوگوں کی باتوں سے اسے معلوم ہوا کہ اس نو جوان کا نام دلچسپ نگاہ ہے اور وہ ساتھ کے گاؤں کے کھانا کاسپیٹ ہے۔ پریت کو دل ہی دل میں اس نو جوان کی گرویدہ

ہو چکی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگی تھی۔ پھر کچھ وقت بیتا کہ وہ سب واپس اپنے گاؤں واپس پہنچ گئے۔ پریت کو اس بات کا اندازہ تک نہ ہوا کہ کھانا کھانے کے اس جھوم کوئی اسے بھی نظر بھر کر دیکھ چکا تھا۔ نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ اپنے دوستوں سے اس کے بارے میں معلومات بھی حاصل کر چکا تھا۔

دلچسپ نگاہ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی لڑکی کو نظر بھر کر دیکھا تھا اور نہ وہ بھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا لیکن نہ جانے اسے اس لڑکی میں کیا کشش تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی آنکھوں کو اس کے معصوم چہرے سے ہٹا نہ سکا۔ پریت کو اس کے پڑوس کے گاؤں میں ہی رہتی تھی اور فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا اس لئے وہ جب چاہتا اس کے گاؤں جاسکتا تھا۔ ان گزرنے لگے اور اس دوران وہ کئی بار پریت کو کے گاؤں ہو آیا تھا لیکن اسے پھر لگانے کے باوجود اسے صرف دو بار ہی اس کا چہرہ نظر آیا تھا اور اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ پایا تھا۔ تھک ہار کر اس نے اپنا رشتہ اس کے گھر بھجوانے کا ارادہ کر لیا۔ چند ہی دنوں میں بزرگوں کے میل جول سے یہ رشتہ بخیر و خوبی طے پایا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں اور گھر کے سب افراد بات لے کر پریت کو کے گاؤں جانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ گھمبیروں میں جتے ہوئے سفید کھوڑے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ اپنے ہاتھوں پر سجے ہوئے زور رنگ کے تاج پہننے بہت حسین دکھائی دے رہے تھے۔ گھر کے تمام افراد سمیت تقریباً چالیس کے قریب افراد تھے جو کہ بات میں شامل تھے۔ جن میں بچے بڑھے اور خواتین بھی تھیں سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ وہ سب دین کے گاؤں جلد از جلد پہنچ کر اس حسین چہرے کو دیکھنا چاہ رہے تھے جس نے ان کے شہزادے جیسے دلچسپ نگاہ کا دل جیت لیا تھا۔ وہ دلچسپ نگاہ جس نے بھی سینے میں بھی کسی لڑکی کو نہ دیکھا تھا نہ جانے کیسے اس لڑکی کا دلوانہ بن گیا تھا کہ چٹ مٹکئی پٹ بیابہ والا معاملہ ہو گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے شادی جیسے بندن

میں بندھنے جا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

سب افراد سکتے کی ہی کیفیت میں اس جگہ کھڑے حیرت سے اس راستے کو دیکھ رہے تھے جس پر بھی دھول سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اب تک کسی جانور یا انسانی پاؤں نے بھی چھوا تک نہ ہو۔ ابھی وہ سب اسی سوچ میں غرق تھے کہ انہیں یکدم خبردار کی آواز نے جیسے چونکا دیا ہو۔ خبردار انہیں اس جڑے ہوئے راستے کی طرف بڑھنے کی تلقین کر رہا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بڑھنے لگے انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی نا دیدہ قوت انہیں اس راستے پر سفر کرنے کے لئے اکسار ہی ہو۔ خبردار ان سب کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جس کی وجہ سے انہیں کچھ حوصلہ ہوا تھا۔ لیکن اندرونی طور پر وہ سب سہمے ہوئے تھے کہ نجانے کب اور کہاں سے وہ خونی عفریت نمودار ہو جائے اور انہیں آکر دیوبچ لے لے راستے پر چلتے ہوئے ان کے قدموں کے نشانات پختے جا رہے تھے وہ سب محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

لیکن ان سب کو اس بات کا قطعی احساس تک نہ تھا کہ ان کے پیچھے بننے والے ان کے قدموں کے نشانات تیزی سے مٹنے جا رہے تھے ان نشانات پر پھر سے دھول جتنی جا رہی تھی۔ یہ سب اتنی خاموشی اور پراسرار طریقے سے ہو رہا تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی توفیق نہ ملتی تھی۔ تقریباً آدھا میل تک مسلسل چلنے کے بعد وہ جنگل میں داخل ہو گئے۔ مختلف قسم کے پرندے درختوں پر اپنی اپنی آواز میں چہارہ تھے۔ جنگلی کھاس میں دوڑتے ہوئے اور اصرار پھرنے کے پھر رہے تھے۔ سنبل کے درختوں کی بہتات تھی جن پر لگے بڑے بڑے سرخ پھول بہت بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ اور ان پر پھرنے کی گہریاں اچھلتی کودتی پھر رہی تھیں۔ درختوں کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور تک تو درخت کھلے کھلے فاصلے پر تھے لیکن جیسے جیسے وہ سب آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے جنگل گہنجاں اور درختوں کا فاصلہ بھی قدرے کم ہوتا جا رہا تھا اور

ایک جگہ تو انہیں باقاعدہ ایک ایک کر کے درختوں کے درمیان سے لگتا پڑا۔

وہ سب خاموشی سے ہاتھوں میں اسلحہ اٹھائے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے جا رہے تھے اس دوران انہوں نے چند افراد کو اپنے دائیں بائیں نظر رکھنے کا کبھی یا تھا اور دو افراد باقاعدہ اپنے پیچھے نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ سب بہت چوتھے انداز میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد درختوں کے اندر سے انہیں کسی پرانی اور بوسیدہ عمارت کے آثار نظر آنے لگے وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔

عمارت کو سامنے کی طرف سے جنگلی جھاڑیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ شکل سے وہ کوئی بہت ہی پرانا مندر لگ رہا تھا جس کے رنگ و روغن اور عمارت سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے یوں دیران پر سے دس گزرنے کی ہوں۔ لوہے کے ایک بڑے گیٹ کے دونوں طرف ستون بنے ہوئے تھے جن کی حالت بھی کافی خستہ تھی ایک نظر میں یوں لگتا جیسے کسی بھی وقت وہ اچانک زمین یوں ہو جائیں گے۔

گیٹ کے عین درمیان میں جیل کا ایک گھنٹا دھول رہا تھا شاید وہ بھی جیل کا رہا ہوگا لیکن اس وقت اس کا رنگ زیادہ تر سیاہ ہی نظر آ رہا تھا۔ مندر کے اندر جانے کے لئے بہت سی سیڑھیاں تھیں جن کی بہت سی انہیں اکھڑی ہوئی تھیں اور بہت سی خستہ حالت میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ سب عمارت کے سامنے موجود چند درختوں کے جھنڈ میں موجڑا تھے اور آپس میں سرگوشیوں میں بات چیت کر رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق شاید وہ انسانی بھیڑ یا اسی عمارت میں چھپا ہوگا کیونکہ وہ جب سے جنگل میں چلے آئے تھے۔ اس وقت سے کوئی انہونی بات واقع نہ ہوئی تھی اور نہ انہیں سے انہیں اس انسانی بھیڑیے کی موجودگی کے کوئی آثار نظر آئے تھے وہ سب اس بات پر بھی متفق تھے کہ شاید اس دیران مندر میں داخل ہونے کا کوئی اور خفیہ راستہ بھی موجود ہو اور وہ درندہ اسی راستے سے ہی آتا جاتا ہو۔ خبریہ سب اس آرائیں ہی معلوم ہو رہی تھیں اصل حقیقت تو اس مندر اندر جا کر ہی معلوم ہو سکتی تھی۔

کافی دیر تک صلاح مشورہ کرنے کے بعد خبردار نے اپنے چند آدمی اس مندر میں بھیجے کا فیصلہ سنایا جس کے مطابق ان میں سے چار آدمی اس عمارت میں داخل ہو گئے اور وہاں کا جائزہ لے کر انہیں بھی اندر آنے کا اشارہ دیں گے۔ اس فیصلے پر سب نے اتفاق کیا اور پھر چار آدمی جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں بندوقیں اٹھائی ہوئی تھیں اس مندر کے میں گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ سیدھے جانے کی بجائے ایک جانب سے آگے بڑھ رہے تھے اس لئے کہ اگر کوئی اندر موجود ہو تو انہیں سامنے سے نہ دیکھ پائے۔ خبردار ان کے ساتھ جانے کی بجائے وہیں رک گیا تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ حالات کے مطابق وہیں رہ کر کوئی اقدام کر سکے۔

شام کا وقت ہو چلا تھا اور درختوں پر شرور چاتے پرندے بھی خاموش ہو گئے تھے اور جنگل میں یوں خاموشی طاری تھی جیسے جنگل کے تمام چند پرندہ ہجرت کر کے کہیں اور جا رہے ہوں۔ یا شاید آرام کر رہے ہوں لیکن زمین پر چلنے والے انسان اپنے آرام کی خاطر اس عفریت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے جس نے ان سب کا سکون برباد کر دیا تھا۔ خبردار اور باقی پیچھے چھ جانے والے افراد سادھے اپنے ساتھیوں کو اس مندر کی جانب بڑھتے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں ان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔

وہ چاروں آہستہ آہستہ چلتے اس کے میں گیٹ کے سامنے پہنچ گئے پھر ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ہی دو افراد ہاتھوں میں پکڑی بندوقوں کا رخ سامنے کی طرف رکھتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے باقی دو افراد نیچے بیڑھیوں کے پاس ہی رک کر ان کے اندر جانے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ دونوں افراد بیڑھیاں چڑھ کر اس مندر کے اندر میں پہنچ کر ٹھہر گئے۔ دائیں جانے خشک پتوں کا ایک پھر موجود تھا اور وہاں اس قدر کنگری اور غلاظت تھی کہ جیسے مندر کی بجائے کوئی کوڑے دان ہو۔ لیکن سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس خشک پتوں کے ڈھیر کو دیکھ کر یوں لگتا جیسے کسی نے بڑی نفاست سے اسے اکٹھا کیا ہو۔

ابھی وہ بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک ایک ساہ بٹنے نے انہیں اس ڈھیر سے باہر نکالا اور ان سے مخاطب ہوا۔ "اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی اندر بلاؤ جو بیڑھیوں سے کان لگائے نیچے کھڑے ہیں۔" بٹنے کے منہ سے انسانی آواز سننے ہی ان کے رنگ فق ہو گئے اور ان کے جسم یوں ہو گئے جیسے کالو تو بیڑھیں۔

پوری دنیا میں تحقیق کے مطابق اب تک صرف دو پرندوں کو انسانی آواز میں بولنے کا شرف حاصل ہے جس میں ایک مینا ہے اور دوسرا طوطا۔ ان دونوں کی زبانیں انسانی زبان سے ملتی ہیں اس لئے ان دونوں پرندوں کو انسانی لہجے میں سکھانا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور یہ بہت جلدی انسانی آواز میں بولنا سیکھ لیتے ہیں۔ اس لئے اس بٹنے کو انسانی آواز میں بولنا دیکھ کر ان کی حیرت بجاتی تھی۔ اور پھر ان دونوں کے قدم تو مندر کے فرش سے یوں چپک گئے تھے جیسے لوہا کسی سطح طیس سے چٹ جاتا ہے۔ وہ بے بسی سے کھڑے اس بٹنے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

اچانک اس بٹنے نے ایک لمبی جھلاٹ لگائی اور سیدھا ان بت بنے جسموں سے کسی توپ کے گولے کی مانند آگھرایا۔ وہ دونوں جس طرح سکتے کی حالت میں کھڑے تھے شاید قیامت تک کبھی ہوش میں نہ آتے لیکن اس خوفناک بٹنے نے انہیں چند منٹوں میں ہی ہوش دلادیا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے سینوں پر کسی نے بہت بھاری تھوڑا مار دیا ہو اور جس کی ضرب سے انہیں اپنی پسلیاں ٹوٹی محسوس ہوئیں۔ اور پھر اچانک ٹھکانے سے وہ دونوں تیزی سے زمین کی جانب گرنے لگے لیکن پھر یکدم انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نا دیدہ قوت نے پیچھے سے انہیں سہارا دے دیا ہو۔ وہ آدھے کھڑے اور آدھے گرنے کے انداز میں وہیں رک گئے۔

بلا بھی ٹھکانے ہی تیزی سے زمین پر گرے اور انہیں اس انداز میں کھڑے دیکھ کر لہنا بچے بڑے زوردار انداز سے ایک نوجوان کے سینے پر دے مارا۔ دارا تازہ زوردار تھا وہ سیدھا اس کا سینہ چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ پچھ

کے دار سے اس کا سینہ پھٹ گیا تھا اور اس کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور یوں محسوس ہوا جیسے کسی زندہ انسان کو کسی کندھ چھری سے ذبح کیا جا رہا ہو۔ وار سے سینے میں سے انسانی اعضاء نکل کر باہر گر گئے جس کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی زمین پر جا پڑا۔

بلنے نے جھپٹ کر دل کو اپنے پنجوں میں دبوچا اور ایک ہی لمحے میں ہڑپ کر گیا۔ دوسرا نوجوان اپنے ساتھی کا بھیا تک انجام دیکھ کر تیزی سے پلٹ کر مندر کی سیڑھیوں کی جانب بھاگ نکلیں مگر اسے اتنی تہمت کہاں دینے والا تھا اس نے بھاگتے ہوئے نوجوان کو پیچھے سے ہی دوبارہ پنجہ مارا اور اس ہار پنجوں کی پیٹھ میں گھس گیا اور اس کا بھی وہی انجام ہوا اور اس کا دل بھی اچھل کر پیچھے ہی زمین کی جانب گر پڑا۔ جھپٹ کر اسے تھا اور اسے بھی جٹ کر گریبا دونوں نوجوانوں کی چیخیں سن کر پیچھے کھڑے ان کے ساتھی ان کے مدد کے لئے ایک کر سہریاں چڑھنے لگے اور جیسے ہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو اپنے ساتھیوں کا بھیا تک انجام ان کے سامنے تھا۔ دلائل میں خون ٹھہرا ہوا تھا یوں لگتا جیسے کسی نے بڑی سی گائے ذبح کر دی ہو۔ ان کے ساتھیوں کے کٹے ہوئے جسم زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ اور ان کے نزدیک ایک کالا بٹا بیٹھا خون سے بھرے اپنے پنجے چاٹ رہا تھا۔ ان کے اوپر پہنچتے ہی اس بلنے نے بھی ان کی طرف دیکھ لیا تھا لیکن وہ براہ راست اپنے پنجے چاٹنے میں مصروف تھا۔

وہ دونوں سکتے کی حالت میں تھے اور پھر جیسے اچانک انہیں ہوش آ گیا اور وہ اس کیفیت سے باہر نکل آئے اور واپس پلٹنے کے لئے مڑے اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر واپس جنگل کی جانب دوڑے لیکن شاید ایسا کرنے میں انہیں دیر ہو چکی تھی اس لئے وہ جیسے ہی مندر کے عمارت سے باہر نکلے۔

مندر کے سامنے کی دیوار پٹی اور ایک عورت کا آدھا دھڑ اس میں سے باہر نکلا جس کی بے نور آنکھیں سیاہ چٹیلوں سے عاری تھیں اور اس کا بڑا سارا ہاتھ تیزی سے لہراتا ہوا ان دونوں کی گردنوں تک پہنچا اور انہیں دبوچ کر واپس مندر کی دیوار میں غائب ہو گیا۔ اندر کا منظر تو باہر جنگل میں موجود

جیسے ہوئے لوگ شاید زندہ کچے پائے تھے لیکن یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ سب خوف سے چیختے ہوئے واپس جنگل میں بھاگ گئے۔

نمبردار پر بھی خوف کی کیفیت طاری تھی ظاہر ہے وہ بھی ایک انسان تھا اس لئے اپنے ساتھیوں کا لرزہ دینے والا حشر دیکھ کر خوفزدہ ہونا فطری عمل تھا۔ دوسرا وہ سب ان کے محافظ کے طور پر بھی ساتھ آیا تھا اس لئے ان کے بھیا تک انجام کا خود کو ذمہ دار سمجھ رہا تھا لیکن چونکہ حقیقت سب کے سامنے تھی اس لئے وہ کم از کم اس طرف سے مطمئن ضرور تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے ان کے ہوش پنجوں کا بھی خیال آ رہا تھا جس کی وجہ سے وہ افسردہ تھا۔ اس لئے اپنے ساتھیوں کو بھگاتا دیکھ کر انہیں روکنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ وہ اس کی کوئی بات سننے کی پوزیشن میں نہ تھے اس لئے انہیں واپس جاتا دیکھ کر وہ بھی تیزی سے ان کے پیچھے لپکا۔

☆.....☆.....☆

دونوں بولنے آدمیوں نے ہاتھوں میں جھاتی مفران کو لے جا کر ایک تہہ خانے میں رکھ کر کھڑکی کی ننگی پر لٹا دیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو سائیز میں لٹکے چڑھنے کے بیٹھوں سے کس کر باندھ دیا اور یہی عمل اس کے دونوں پاؤں پر دہرایا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ تہہ خانے میں موجود ایک سوراخ میں داخل ہو گئے۔ اس سوراخ جیسے تین اور چوکور سوراخ جن کی لمبائی اور اونچائی تقریباً تین فٹ ضرور ہوگی موجود تھے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دائیں طرف والی دیوار سے ایک عجیب الخفقت شکل کا گور یا ٹانہ انسان برآمد ہوا جس کے سر کے لمبے بال اس کے شانوں تک جمبول رہے تھے۔ چہرے پر گوریلے کی مانند موٹی ناک جس میں ایسا مصلی جیسا زور پڑا ہوا تھا اور اس نے سیاہ رنگ کا ٹکٹو بھی کسا ہوا تھا جس پر زرد رنگ سے دھندلیاں بنی ہوئی تھیں۔ جس کے سین اور میان ایک سفید چھوکی تھوڑی ہوتی تھی اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک چمک دار تھوڑی پکڑی ہوئی تھی۔ وہ سوراخ سے نکلتے ہی سیدھا پٹا پر لپکا مفران کے نزدیک آن کر ٹھہر گیا۔ وہ اسے یوں لپکائی ہوا

نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گا۔ مجروحہ اپنے لبوں پر زبان کھاتے ہوئے اس کے بازو کی جانب بڑھا اور تیز دھار چھری سے اس کے ننگے بازو پر وار کر دیا۔

مفران کے منہ سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی اور تہہ خانے اس کی چیخ سے گونجنے لگا۔ اور اس کے چہرے پر انتہائی کرب کے آثار پھیل گئے چوں کہ وہ کسی تکمیل کے زیر اثر نہ تھی اس لئے چھری کا وار سے ہی فوراً ہوش میں آ گئی اور تکلیف سے اپنا سر دائیں بائیں گھمائی۔ پھر اپنے سامنے ایک گور یا ٹانہ انسان کو پا کر دوبارہ ہوش ہو گئی۔ بازو کٹنے ہی خون کا ایک فورانہ سے نکلا اور اس کے تازہ تازہ خون بچ سے ہوتا ہوا نیچے زمین پر گرنے لگا۔ کتا ہوا بازو اٹھا کر اس کو دیکھا مگر انسان نے ایک زوردار چیخ ماری یوں لگا جیسے کسی نے بہت تیز دلا سا ٹرن بجا دیا ہو۔

ابھی اس کی چیخ کی بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی تہہ خانے کی باقی دیواروں میں موجود دیگر سوراخوں سے دوسرے مکروہ صورت انسان برآمد ہوئے انہوں نے بھی اپنے اپنے ہاتھوں میں مختلف قسم کے اوزار پکڑے ہوئے تھے۔

مفران جو کہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو چکی تھی اور اپنے ساتھ آئندہ آنے والے حالات سے بے خبر بچنے پر پڑی تھی۔ ان دونوں مکروہ صورت افراد نے اپنے اپنے اوزاروں سے بچ پر پلٹی مفران کے جسم سے اپنے اپنے سن پسند گوشت کے ٹکڑے کاٹے اور ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ ان سوراخوں میں گھس گئے جہاں سے وہ کچھ دیر قبل نکلے تھے۔

تہہ خانے کے فرش پر دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ابھی ابھی وہاں کوئی گائے ذبح کی ہو۔ مفران کا جسم ہولے ہولے کاٹنے کا تھا۔ ایک ویران مندر کے تہہ خانے میں ایک زندہ انسان کے کٹے ہوئے جسم کا منظر ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا جسے دیکھ کر لرزہ طاری ہوتا تھا۔ ان دونوں افراد کے غائب ہوتے ہی ایک بھیا تک شکل عورت جس نے اپنی پیٹھ پر ایک مشین باندھ رکھی تھی جیسے عموماً فٹپول پر پہرے کرنے والے باندھتے ہیں اور اس کی لمبی آنکھوں میں اپنے دائیں ہاتھ میں تھام رکھی

تھی۔ اس کے سیاہ چہرے پر لٹکتے ہوئے سرخ بال بہت برے لگ رہے تھے۔ اپنے حلیے سے وہ کوئی چمیل ہی لگ رہی تھی جسے دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی بچ پر پلٹی مفران کے قریب آئی اور نوزل کا رخ اس کی طرف کر کے اپنے ہاتھ سے مشین کی سائیز پر لگا ہینڈل اوپر نیچے ہلانے لگی اس کے ایسا کرتے ہی سبزی مائل پانی کی ایک موٹی دھار مفران کے اٹھڑے جسم پر پڑنے لگی۔ جہاں جہاں اس پانی کی پھوار پڑ رہی تھی وہاں سے اس کا جسم مرکزی کی مانند پھل پھل کر نیچے پہنچنے لگا۔ پھر کچھ ہی دیر میں وہاں تہہ خانے کے فرش پر پانی ایک ڈھیر کی صورت اکٹھا ہو گیا۔

نیجانے اس سبزی مائل میں کیا ایسی تاثیر تھی کہ اس نے چند لمحوں میں ایک انسانی جسم کے گوشت اور ہڈیوں کو یوں نکال دیا تھا جیسے ان کا بھی وجود ہی ہو اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس بری شکل عورت نے اپنی پیٹھ پر بندھی مشین اتار کر تہہ خانے کے فرش پر رکھ دی۔ اور دائیں طرف نظر آنے والے کاٹھ کباڑ میں سے ایک برائیاں کپڑا اٹھا اور اس سے زمین پر بکھرا ہوا مفران کا خون صاف کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں خون کا ایک دھبہ تک نہ تھا اس نے کپڑا ایک جانب اچھالا اور دوبارہ سوراخ میں گھس گئی۔

☆.....☆.....☆

بیرات کے تقریباً گیارہ بجے کا وقت ہو گا جب دو سائے سیاہ چادریں اوڑھے شہر سے دور ایک پرانے قبرستان کے دروازے کی جانب بڑھے جارہے تھے جسماں خدو خال سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان میں ایک مرد ہے اور ایک عورت ہے۔ وہ دونوں بہت محتاط انداز میں اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بڑی خاموشی سے قبرستان کے دروازے کی جانب جا رہے تھے۔

دروازے کے قریب پہنچ کر انہوں نے آہستہ سے لوہے کا پتھر گیٹ دھکے سے کھولا۔ دروازہ چونکہ مقفل نہ تھا اس لئے دھکا لگتے ہی فوراً کھل گیا ویسے بھی اسے بند کرنے کا کوئی جواز نہ تھا تو کونسا کسی نے وہاں سے کوئی خزانہ چرا کر لے جانا تھا۔

قبرستان کے سامنے کی دیوار کی انٹوں سے بنی ہوئی تھی اور اس کے چاروں طرف جنگی جھانپیاں اور گھس پھوس لگی ہوئی تھی۔ جھانپیاں ایک ہاڑ کی صورت اختیار کر چکی تھیں جس کی وجہ سے دور سے وہ دیواریں ہی محسوس ہوتی تھیں۔ دروازہ کھلتے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے اور دوبارہ دروازہ بند کر دیا۔ قبرستان میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی کبھی کبھی نزدیک سے کسی جھینگری کی آواز سنائی دیتی تو لمحہ بھر کے لئے خاموشی میں ارتعاش سے پیدا ہوتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

یہ قبرستان لگ بھگ تین ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا جس میں دور دور تک بہت سی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں بہت سی قبریں سرمست اور کچھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے خستہ حالت میں تھیں اور بہت سی قبریں گڑبڑ کی صورت میں تھیں یہ ان کے وارڈوں کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ کبھی کبھی دور سے گیدڑوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے جاتیں تو دل دھل جاتا کہتے ہیں کہ رات میں آسانی بلائیں دیش پر اتاری ہیں تو زمین پر چرند پرند اور جانوروں خصوصاً بلی اور کتوں کو وہ نظر آتی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ روتے اور چلاتے ہیں۔

ایک حدیث پاک میں ہے کہ ”اپنے بچوں کو مغرب کے وقت گھروں سے باہر نہ نکالا کرو کیونکہ ایسے وقت میں بلائیں باہر نکلتی ہیں اور انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ جب کبھی کسی کسی جانور کو روتے ہوئے دیکھیں تو فوراً آیت الکرسی کا ورد کرنا چاہیے کیونکہ اس کے بڑھنے سے بری بلاؤں کو الگ لگ جاتی ہے اور وہ نقصان انہیں پہنچا سکتیں۔ آیت الکرسی پڑھنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر فرمادیتا ہے جو اس کے بڑھنے والے کی حفاظت کرتا ہے۔“

وہ دونوں خاموشی سے قبرستان میں ایسی قبر کی تلاش میں تھے جو پرانی ہو اور اس پر چلتا ہوا چراغ بھی موجود ہو۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں قریب ہی قبرستان کے گھر کن کا مکان تھا جس کے اندر سے دیے کی روشنی اس کی دیوار میں بنے ایک گول روشندان سے باہر آنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

چونکہ رات کا وقت تھا اس لئے وہ بھی خواب غموش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اور ویسے بھی کسی نے قبرستان سے بھلا کیا لینا دینا تھا اس لئے وہ بے لگری کی نیند سو رہا تھا۔ مکان سامنے دیکھ کر وہ پلٹ کر دوبارہ دوسری جانب بڑھنے لگے۔

شاہ بابا نے انہیں بہت مشکل کام سونپا تھا کیونکہ ایک ایسی قبر جو پسیدہ بھی ہو اور اس پر چراغ بھی جل رہا ہو تقریباً ناممکن لگ رہا تھا۔ کیونکہ زیادہ تر لوگ ان قبروں پر ہی چراغ جلاتے ہیں جو تازہ بنی ہوں ورنہ پسیدہ اور خستہ قبر جس کا کوئی پرسان حال نہ ہو بھلا اس پر کوئی چراغ کیوں جلائے گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک امید کے سہارے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ پھر کچھ دیر تک بھٹکنے رہنے کے بعد وہ واپس ہو گئے۔ اور دل برداشتہ ہو کر واپس جانے کے لئے سوچنے لگے۔

یہ دونوں قریکا موچی اور رشید کی ماں تھے جو شاہ بابا کے حکم کے مطابق اس وقت قبرستان میں موجود تھے۔ رشید کی ماں نے بڑی مشکل سے فیکے موچی کو ایک ٹھکری رقم دینے کا وعدہ کر کے اس کام کی تکمیل کے لئے رضا مند کیا تھا پہلے تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا لیکن جب اسے اس کی بیٹی کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات کا احساس دلایا تو اس نے بھی ساتھ دینے کی حاضری بھری تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کا بھی وعدہ کرنا پڑا تھا کہ یہ راز مرتے دم تک کسی کو نہ بتایا جائیگا۔ یہ سب باتیں طے کر کے وہ آج اس کام کو سرانجام دینے کے لئے اس وقت اس پرانے قبرستان میں موجود تھے۔

لیکن یہاں پہنچ کر انہیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ جس کام کو وہ آسان سمجھ رہے تھے وہ اتنا آسان نہ تھا بلکہ بہت مشکل کام تھا۔ اور اب ایک پرانی قبر پر چلتا ہوا چراغ و صوفنا ان کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

تقریباً آدھا گھنٹہ تک تلاش جاری رکھنے کے بعد وہ دونوں ایک جگہ رک کر آپس میں بات چیت کرنے لگے۔ ”گلتا ہے اس قبرستان میں کوئی ایسی قبر نہیں ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔ اس لئے ہمیں آج واپس لوٹ جانا

چاہئے اور پھر کسی مناسب وقت میں کسی اور قبرستان میں جا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہئے۔“ رشید کی ماں نے سرکشی کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”نیک ہے جیسے تمہاری مرضی اچھا ہوتا اگر آج ہی ہم یہ کام انجام دے لیتے کیونکہ روز بروز آدمی رات کے بعد اپنے گھروں سے نکلنا کون سے آسان بات ہے اور پھر اگر گھر کے افراد میں سے کسی کو شک ہو گیا تو ہمارا راز کھل سکتا ہے اور ہم مشکل میں بھی پڑ سکتے ہیں۔“ فیکے نے بھی جواب دیا۔۔۔۔۔

”لیکن جب ہمیں ایسی قبر ہی نہ ملے گی تو ہم کیسے یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں؟ کیونکہ شاہ بابا کے مطابق اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے تو ہم اپنا مقصد نہیں پاسکتے۔“ رشید کی ماں نے جواب دیا۔

ایسی وہ آپس میں کھڑے سرکشوں میں معروف تھے اچانک انہیں اپنے قریب ایک آہٹ سنائی دی۔ وہ دونوں ہم کر اس طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر ایک گونج دار آواز نے خاموشی کا ظلم توڑ دیا۔ دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ایک زوردار ہلچل کے کانوں کے قریب لاکر ایک تخت بچا دیا ہو انہیں یوں لگا جیسے یہ گونجدار آواز ان کے کانوں کے پردے پھاڑ کر رکھ دے گی۔ لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لئے ہوا اور پھر یکدم دوبارہ یوں خاموشی چھا گئی کہ انہیں اپنے سینوں میں دھڑکتے دل کی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔

وہ دونوں خوف و ہراس میں ڈوبے کھوٹی کھوٹی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے وقت نے انہیں پتھر کا بنا دیا ہو۔ کچھ دیر تک اسی کیفیت میں رہنے کے بعد جیسے یکدم انہیں کسی نے جھجھوڑ دیا ہو اور وہ ہوش میں آگئے ہوں۔ ان کے چاروں طرف گپ اندھیرا ڈیرے ڈالے ہوئے تھا اور قبرستان اسی طرح اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ان کے سامنے تھا اور وہ اس کے نیچوں بچ کھڑے آگے کا لاکھ عمل سوچنے لگے۔

اس خوفناک آواز نے انہیں بہت خوفزدہ کر دیا تھا اور انہوں نے اپنا پلان ملتوی کر کے اپنے گھروں کی راہ

لی۔ راستے میں وہ دونوں خاموش ہی تھے اور گھروں کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے سرکشی میں کچھ بات کی اور قریکا موچی اپنے گھر کے اندر گھس گیا اور رشید کی ماں بھی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

نمبردار کے ساتھ آئے اس کے آدمی خوفزدہ ہو کر واپس گاؤں کی طرف جانے والے راستے کی جانب بھاگتے چلے جا رہے تھے جو کہ جنگل کے اندر سے ہو کر جا رہا تھا جنگل رات کے اندھیرے میں اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں دیواروں جنت اپنے سر اٹھائے ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہوں۔ نمبردار چونکہ خود بہت ڈر گیا تھا مندر کے اندر جو کچھ اس نے اپنی چاچا کی آنکھوں کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوتا دیکھا تھا وہ اس کے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھا وہ ان کے تعاقب میں ان کے پیچھے ہی بھاگتا چلا جا رہا تھا خوف کی وجہ سے اس کے پاؤں اس کا ساتھ دینے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ان کے پیچھے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انہیں مسلسل آوازیں دینے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن جیسے کسی نے اس کے حلق میں کانٹے گاڑ دیئے ہوں کہ جو اس کی آواز کو اس کے حلق میں قید کرنے میں لگے ہوں۔

تقریباً بیس بجیں منٹ تک مسلسل بھاگتے رہنے کے بعد وہ اس جڑے ہوئے راستے پر پہنچ گئے۔ رات کے وقت بھی راستے کی مٹی فاسفوس یا ریڈیم کی مانند چمک رہی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس پر کسی قسم کے چلنے کا نشان اب بھی واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا اور اس بار بھی انہیں یہ بہت عجیب لگا تھا۔ نجانے اس میں قدرت کا کیا عجیب تھا۔ بحر حال اس وقت ایسی باتوں پر غور کرنے کی بجائے انہیں اپنی جان بچانے کی فکر زیادہ تھی اور وہ اندھا دھند اس راستے پر بھاگتے چلے گئے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے ان کے پیچھے بننے والے ان کے قدموں کے نشان بڑی تیزی سے مٹنے جا رہے تھے۔ ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ان کے چہرے چاندنی میں یوں لگ رہے تھے جیسے کسی نے

سفید رنگ ان کے چہروں پر بھیر دیا ہو۔

چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا اور راستے کے دونوں طرف لگی جھاڑیوں میں جیسے درندے بڑی حریت سے انہیں سرپٹ بھاگتے دیکھ رہے تھے۔ جھاڑیوں میں سے ان کی سرخ سرخ آنکھیں چمکتی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ مسلسل سرپٹ بھاگتے رہنے کے بعد کچھ ہی دیر میں وہ کھیتوں میں پہنچ گئے اور ان میں موجود پگڈنڈیوں پر بھاگ گئے۔ اور ٹھوڑی دیر میں وہ سب گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے۔ گاؤں کے نزدیک پہنچ کر وہ پہنچنے چلانے لگے اور ان کے اس طرح پہنچنے کی آوازیں رات کے اندھیرے میں گاؤں ان لوگوں کو صاف سنائی دیں جو ان کے جنگل میں جانے سے لے کر ابھی تک ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کا شور سن کر گاؤں کے بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور ان کو اس طرح رات کے اندھیرے میں گاؤں کی طرف بھاگتے دیکھ کر وہ بھی خوفزدہ ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

گاؤں کے لوگوں کو اپنے سامنے دیکھ کر خبردار اور اس کے قریب جانے والے آدمی ان کے قریب آ کر یوں زمین پر ڈھیر ہو گئے جیسے کسی نے آٹے کی بوریاں زمین پر لا دی ہوں۔

☆.....☆.....☆

دلچسپ منظر دیکھ کر سب کے لباس میں کوئی شہرہ آلودی نہ رہا تھا اس کے تمام رشتے دار اس کے گرد گھیر ڈالے اس سے باتیں اور جھجھکاؤ کرتے رہے۔ وہ بھی اپنی پریت کوڑے کے تلے کی خوشی میں ان سب کی چھیڑ چھاڑ سے محفوظ ہو رہا تھا لیکن شاید وہ اپنے آنے والے برے وقت سے بے خبر تھا جو اس کی تاک میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے والدین ان رات لے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ ان کی یہ کوشش تھی کہ وہ بارات کے رگڑیوں میں اپنے سہمی کے گاؤں پہنچیں تاکہ وہ سومات کی ادا ہو سکے اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد جلدی سے اپنی بہو کو لے کر رات کا اندھیرا اچھلتے سے پہلے پہلے واپس اپنے گاؤں پہنچ جائیں۔ لیکن ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی بارانی ابھی پوری طرح تیار نہیں

ہوئے تھے ہر کوئی بلا وجہ ہی ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے ان کے چہروں پر بے بسی چھائی ہوئی تھی اور ہاتھوں پر اپنے غمے کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے جو کہ ان کے نزدیک بہت محبوب بات تھی۔ اس لئے وہ بے جا رگی سے ان کی تیاریوں کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ پھر کافی دیر کے بعد کسی نے آواز لگائی کہ بارات چلنے کے لئے تیار ہے اور یہ سن کر انہوں نے بھی کچھ کھانسنے لیا۔

یہ صبح کے تقریباً کیرا بے بجے کا وقت ہو گا جب ایک بچی کھائی بھی پر دلچسپ منظر دیکھنے والے اور دو تین قریبی رشتہ داروں کے ساتھ براجمان تھا۔ بھی میں جسے سفید گھوڑے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ بھی کے پیچھے چند اور گھوڑوں اور بچی ہوئی تھیں گاڑیوں پر دیگر بارانی سوار تھے۔ یہ قافلہ پریت کوڑے کے گاؤں کی جانب رواں دواں تھا جو کہ ان کے گاؤں سے تقریباً پندرہ میل کی مسافت پر تھا ان کے اعزاز کے مطابق انہیں پریت کوڑے کے گاؤں پہنچنے میں تقریباً دو گھنٹے لگ سکتے تھے اور وہ سب مطمئن تھے کہ شام کے سائے گہرے ہونے سے پہلے پہلے وہ واپس اپنے گاؤں پہنچ جائیں گے۔

لیکن یہ سب ان کی خام خیالی تھی کیونکہ جب بارات چلی تو راستے میں بچوں اور عورتوں کی ضرورتوں کی وجہ سے ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں کم از کم چار پانچ گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔

بھی میں جسے گھوڑے آہستہ چلنے پر خوش نہیں تھے لیکن تیل گاڑیوں کی رفتار کی وجہ سے انہیں بھی اپنی چال آہستہ رہی پڑی تھی۔ پھر جیسے ہیہ کر کے وہ پہرے کے وقت گاؤں پہنچ ہی گئے گاؤں میں ان کے استقبال کی تیاریاں عروج پر تھیں چونکہ گاؤں کی برعورت اور مرد بھی اس نوجوان کو دیکھنے کی حسرت تھی جس نے ان کے گاؤں کی سب سے خوبصورت دوشیزہ کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اس لئے وہ سب بھی بڑی بے چینی سے بارات کا انتظار کر رہے تھے۔ گاؤں کے داخلی راستے پر وہ سب اکٹھے کھڑے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لے کر ان کے استقبال

لے تیار کھڑے تھے اور پھر جیسے ہی ان کی نظر بارات پر پڑی وہ سب خوشی سے چیخنے چلانے لگے۔ گاؤں کے نزدیک پہنچ کر ان سب کا پر زور انداز میں استقبال کیا گیا اور ان کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ دلچسپ منظر دیکھنے سے نہال سب کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے سر اٹیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہاتھوں کے ساتھ ساتھ ان سب کو لے جا کر ایک بڑی سی چوٹی میں لے گیا۔ سرخ اینٹوں سے بنی یہ چوٹی اپنی خوبصورتی کی مثال تھی۔ جس کا بڑا سا منٹش دروازہ کار میز کی صحت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

چوٹی کے پتھروں میں ایک بڑا دلان تھا جس میں جا بجا تخت پوش تھے۔ جن پر سرخ رنگ کی چادریں بھی ہوئیں تھیں۔ ان سب کو لے جا کر ان تخت پوشوں پر بٹھایا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ان کی خدمت میں ایک ذائقہ دار شربت پیش کیا گیا جس کے منفرد ذائقے کی ہر کسی نے دل کھول کر دلا دی۔ عورتیں زنان خانے میں چلی گئی تھیں اور بچے دوسرے بچوں کیساتھ کھیلنے کوڑے میں لگ گئے۔

پریت کوڑے کے لباس میں لمبوس کوئی آسمان سے اتری ایسا لگ رہی تھی۔ اسٹین اور مہندی نے اسے پہلے سے کپڑے زیادہ خوبصورت اور حسین بنادیا تھا۔

شادی کے سرخ جوڑے میں وہ کسی اور دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ شرم سے اس کے اندر کی کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر اپنے محبوب کو دیکھنے کی تمنا بڑی بے چینی ہو۔ اس کی بچپن کی سہیلیوں نے اس کو اپنے گھرے میں لیا ہوا تھا اور وہ اس سے جھجھکاؤ میں مصروف تھیں اور وہ بھی کبھی ان کے مذاق پر کھل کھلا کر ہنس دیتی جس سے اس کے سوتیلوں جیسے سفید دانت بہت بھلے لگتے تھے۔ غرض یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے بھی اسے بڑے پیار سے تخلیق کیا ہو۔

چوٹی کے برابر میں ایک بڑے احاطے میں ہماراتیوں کے سوا گت کے لئے کھانے کا انتظام کیا جا رہا تھا جس میں مزے مزے کے پکوان تیار کئے جا رہے تھے جن کی بھنی بھنی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ چوٹی کے اندر ایک بڑے سے کمرے میں پریت کوڑے کو روک دینے والا جھیز رکھا ہوا

تھا جس میں ضرورت کا تقریباً ہر سامان دیا گیا تھا تاکہ شادی کے بعد اس کے قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چھوٹا موٹا سامان بڑے بڑے ٹرکوں میں رکھ کر ان پر تالے لگا دیئے گئے تھے۔ جن کی چابیاں پریت کوڑی والدہ نے اپنی حفاظت میں رکھی ہوئی تھیں۔ جھیز والا کمرہ چوٹی کے ایک کونے کی طرف بنا ہوا تھا جس کی طرف کبھی کوئی نہیں جاتا تھا اس کمرے کا س لے بھی منتخب کیا گیا تھا کیونکہ دوسرے کمروں میں شادی میں شرکت کرنے والوں کو رکھا گیا تھا اس وقت پریت کوڑی والدہ کے ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹھوڑی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس میں کپڑے بندھے ہوئے ہوں شاید مہمانوں میں سے کسی نے کوئی رسم کی ادائیگی کی ہو۔ وہ ٹھوڑی ہاتھ میں لئے جھیز والے کمرے کی جانب بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے نزدیک جا کر اس نے ٹھوڑی زمین پر رکھ کر اس پر لگا تالا کھولا اور ٹھوڑی زمین سے اٹھا کر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بڑے سے زور سے سانس لی ہو اور ایک گرم ہوا کا جھوٹکا اس کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ ہولکائی لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر سر جھک دیا کہ شاید کمرہ بند رہنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو کیونکہ اس کمرے میں تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور کہیں سے ہوا کا گزر نہیں تھا اس لئے ٹھنڈی کی وجہ سے اچانک کمرہ کھلنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹھوڑی ایک بڑے سے ٹرک کے نزدیک رکھ کر اس کا قفل کھولنے لگی۔ قفل کھول کر اس نے جیسے ہی اس کا ڈھکن اوپر اٹھایا اس میں سے ایک بڑا سا کالا پتھر لگا ہوا تھا اور اس سے اسے حیران ہوتا چھوڑ کر کمرے کے لاکھ کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ حیران وہ پریشان ساکت نظروں سے اسے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ایسا کیونکہ ہوا کمرہ میں رکھا ٹرک تو اس نے خود مقل کیا تھا اور کمرے کا دروازہ بھی بند تھا اور اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخلے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا پھر ایسا کیسے ہوا کہ ایک سیاہ بلا اس ٹرک میں بند ہو گیا ہو اور زندہ حالت میں اس کے

سامنے موجود ہو۔ کچھ دیر تک وہ بت بنی کھڑی رہی اور پھر تیزی سے بھگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور خوف کی وجہ سے اسے کمرہ بند کرنا بھی پانڈیش رہا۔

☆.....☆.....☆

مسلل کوششوں کے باوجود بھی رشید کی ماں اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہیں ہو پائی تھی ایک دو بار رشید کو بھی اس پر شک ہوا کہ جیسے اس کی ماں اس سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو لیکن اس نے زیادہ غور نہیں کیا لیکن کل تو حد ہو گئی جب اس کو پیاس کی حاجت ہوئی تو اس نے پانی پینے کے لئے جب صحن کا رخ کیا تو اس وقت اس کی ماں گھر کا باہر کا دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہو رہی تھی اس کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ سوئی ہوئی تھی جب اسے گھر کے باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی آری تھیں اس لئے وہ صرف یہ دیکھنے کے لئے باہر نکلی تھی لیکن اس کے دیکھنے کے باوجود اس کو کئی میں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا لیکن جس طرح وہ نظریں چرا کر اس کے برابر کچا جواب دے رہی تھی اس سے اس کے دل میں اس کا گمان کے شک میں بدل گیا تھا۔ اور وہ راتوں کو جاگ جاگ کر اپنی ماں کے کمرے میں جھانک رہا تھا لیکن دوسری طرف اس کی ماں بھی شاید غلط ہو گئی تھی اس لئے وہ بھی کافی دنوں سے جیسے گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔

لیکن دل ہی دل میں تھماتی رہتی تھی کہ کوئی کھڑی ہو جب وہ شاہ بابا کا دیا ہوا تحویذ جلدی سے کسی پرانی قبر میں دبا دے تا کہ اس کی بہو سے اس کی جان چھوٹے۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے مذموم مقاصد میں ناکام ہی رہی تھی اور سارا سارا دن اپنی بہو کے کاموں میں کیڑے نکالتی رہتی تھی اور شاید اس کی بہو بھی اب ڈھیٹ ہو گئی تھی کہ اس کے ڈانٹنے ڈھینچنے اور کوسنے ایک کان سے کن دوسرے کان سے نکال دیتی تھی جس کی وجہ سے رشید کی ماں اور چڑتی تھی۔

رات کو رشید کے گھر آنے پر اس کی بیوی دن بھر کی کارگزاری اس کے سامنے رکھ دیتی جس میں اس کی ماں کے رویے کو نمایاں حیثیت حاصل ہوتی۔ رشید خود ان دنوں کی روز روز کی نوک جھونک اور شکایتوں سے تنگ

آگیا تھا اس لئے وہ بھی ہر وقت پریشان رہتا کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ خود کٹی کر لے تاکہ روز روز کی ان مصیبتوں سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ اپنا ارادہ بدل دیتا۔

ایک روز دو پہر کے وقت اس کے ایک دوست کی شادی تھی جس میں اس نے اس کو اس کی فقیہی کیا تھا مدعو کیا تھا اور وہ اس اچھا دوست تھا جس کی شادی میں شرکت لازمی تھی اس لئے اس نے اپنی ماں اور بیوی کو شادی میں جانے کے لئے کہا رشید کی ماں کو یہ موقع نصیب نہ لگا اور اس نے جلدی سے اپنی طبیعت کی ناسازگی کا بھانڈا بنا کر انکار کر دیا اور ان دنوں کو شادی میں جانے کا کہا۔

رشید نے کچھ دیر ہمارا کیا لیکن پھر اپنی بیوی کو لے کر دوست کی شادی میں شرکت کے لئے گھر سے نکل گیا۔ ان دنوں کے گھر سے نکلنے ہی رشید کی ماں نے جلدی سے شاہ بابا کا دیا ہوا تحویذ کمرے میں چھپائے ہوئے ایک لوہے کے بس سے نکالا اور اپنے دوپٹے سے باندھا اور گھر کو تالا لگا کر قبرستان کی طرف جانے والے راستے پر نکل پڑی۔ اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دیکھے موچی کو بغیر بتائے ہی اس مسئلے کا حل تلاش کرے گی اور اس طرح اسے دیکھے موچی کو پیسے بھی نہیں دینے پڑیں گے اور وہ خاموشی سے اپنا کام بھی مکمل کر لے گی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ بڑی رازداری سے قبرستان کی طرف جانے والے راستے پر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

دو پہر کی وجہ سے اس راستے پر زیادہ لوگوں کا رش نہیں تھا۔ اس کا دلگداس اس راستے پر آج بھی رہے تھے لیکن کی نے بھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ قبرستان کے قریب پہنچ گئی اور وہاں رک کر اوپر ادر دیکھ کر اندر داخل ہو گئی۔ قبرستان میں ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا کر ہوئی تھی۔ قبروں پر اگی ہوئی جھاڑیاں ان میں فتن انسانوں کے رشتہ داروں کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے عزیز و اقارب انہیں وہاں دفن کر بھول چکے ہوں۔ کچھ جنگلی حیروں کی جھاڑیاں بھی دکھائی دیں جن پر سرخ سرخ حیر بہت بھلے لگ رہے۔

تھے اس نے لپکاتے دل کے ساتھ کچھ پیر توڑ کر منہ میں ڈالے تو ان کا ذائقہ بیٹھا محسوس ہوا وہ پیر کھائی اور ادر دیکھتی آگے بڑھنے لگی اسے کوئی ایسی پرانی قبر کی تلاش تھی جس پر دیا بھی رکھا ہو۔

اس وقت وہ دن میں اس لئے قبرستان آئی تھی تاکہ دن کی روشنی میں اپنی مطلوبہ قبر تلاش کر کے اس پر کوئی نشانی لگا سکے تاکہ رات کے وقت اسے مزید وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ رات کے وقت ایسی قبر تلاش کرنے میں بہت وقت ہوئی تھی اس لئے آج گھر میں کسی کے نہ ہونے کی وجہ سے موقع ملے ہی وہ پرانی قبر کی تلاش میں نکل آئی تھی اور پھر جلد ہی اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔

ایک نیم کے رخت کے نیچے ایک کچی قبر کھائی دی اور اس کے سر ہانے ایک پرانا چراغ بھی دھرا تھا جس میں رکھے تیل سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے روزانہ جلایا جاتا ہے اس نے اچھی طرح اس قبر کی نشانی کو اپنے ذہن میں بٹھایا اور ابھی کی راہ لی۔

☆.....☆.....☆

یہ ایک چھوٹا سا ہل نما گھر تھا جس کے وسط میں ایک کمرہ بہت اچھل انسان جس کے جسم پر گہرے رنگ کا لباس تھا ہاتھ میں ایک ترشول تھا۔ بیٹھا تھا ترشول کے تینوں تیروں پر بندروں کے تازہ رنگ رک رہے تھے جن سے خون بہہ بہہ کر سامنے رکھے ایک پتیل کے تھال میں اکٹھا ہو رہا تھا۔ وہ شخص شکل اور چلنے سے کوئی سادھو لگ رہا تھا۔ اس کا گھنجر کر سے میں لگے ایک بلب کی زبردستی میں خوب چمک رہا تھا یوں لگتا جیسے اس نے اپنے سر میں سروس کے تیل کا خوب استعمال کیا ہو۔

تھال میں جمع ہوتے خون میں اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں ڈبو ڈبو کر وہ اپنے ماتھے پر پھیر رہا تھا جس سے اس کے ماتھے پر خون ایک پوڑی کی صورت میں جا رہا تھا اور ایک موٹی تھلی تھی جا رہی تھی۔ یہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے منہ میں کچھ پڑھ پڑھ کر بندوں کی کھوپڑیوں پر بھی پھونک جا رہا تھا ناگاہ کہ کوئی منتر پڑھ رہا تھا لیکن کوئی ناٹانوس ہی زبان تھی جس کا ایک لفظ بھی پہلے نہیں پڑ رہا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ جیسے ہی وہ ان بندوں کی کھوپڑیوں پر منتر پڑھ کر پھونکتا ان کی مردہ آنکھیں ایک جھلکے سے کھلتی اور پھر بند ہو جاتیں۔ کمرے میں اس وقت اس کے سوا کوئی اور جاندار موجود نہیں تھا۔ کچھ دیر تک یہ تماشا کرنے کے بعد اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے ترشول پر لٹکتی ایک بندر کی کھوپڑی کو پکڑا اور کمرے کے ایک کونے کی طرف اچھال دیا۔

کھوپڑی جیسے ہی فرش سے ٹکرائی ایک زوردار آواز پیدا ہوئی اور یکدم ایک انسانی بھینڑ یا اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ایک اگڑائی لیتا ہوا اس کے سامنے نمودار ہو گیا۔ نمودار ہونے والے اس بھینڑیے کے تمام جسم پر لمبے سیاہ بال تھے اور اس کا بھیا کچھ چہرہ بھی سیاہ بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا جس سے اس کے چہرے کو واضح طور نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

شلماک حاضر ہے مہاراج۔ بھینڑیے کے منہ سے ایک باریک سی آواز سنائی دی۔ غالباً وہ سادھو کو ہی مہاراج پکار رہا تھا کیونکہ اس کمرے میں ان دنوں کے علاوہ اس وقت کوئی اور موجود نہیں تھا۔ سادھو جو اس دوران ترشول زمین پر رکھ کر اسی طرف دیکھ رہا تھا بولا۔ "میں نے تمہیں ایک انسانی بیجٹ لانے کے لئے بھیجا تھا لیکن اتنا سا گزرنے کے باوجود بھی تم نے کام نہیں کیا۔ سادھو غصے سے لال پیلا ہو کر اس سے مخاطب ہو رہا تھا۔

"مہاراج! میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن عین وقت پر گاؤں کے لوگوں نے میرا پیچھا کیا اور مجھ سے میرا شکار چھین لیا۔" شلماک نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ سادھو کو جواب دیتے وقت اس کے جسم پر یوں لرزہ طاری تھا کہ جیسے کسی بھی وقت سادھو اس کو منتر سے محسوس کر دے گا۔

"لیکن یہ تو ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے جو تم مجھے آج بتا رہے ہو۔" سادھو نے جوابا کہا۔

"ہی مہاراج! آپ سچ کہہ رہے ہیں لیکن ان سات دنوں میں، میں دوسرے شکار کی تلاش میں تھا۔" شلماک نے دوبارہ گھبراتے ہوئے جواب دیا۔ یہ بات

مستند اکٹروں، حکیموں، ماہرین طب کی ہدایات مشوروں سے لکھی گئی مفید کتاب

قیمت - 100 روپے

دل کی بیماریاں

اس کتاب میں، دل کی دھڑکن، خون کے دباؤ کی زیادتی، شریانوں کی سختی، دہائی بلڈ پریشر، غذائی تبدیلیاں جو آپ کی زندگی بدل دیں گی، امراض دل کا بڑا سبب صدمات، تنہائی اور خود غرضی ہے، دل کی جزیں دماغ میں ہیں، بچپن کی تھخیاں اور ہارٹ ایک، مرض دل کا سن کر اوسان خطا نہ کریں، ایک حکیم کا تجربہ خون کا عطیہ دینے سے نہ گھبرائیں، سقوط قلب کیا ہے؟ دل کا دورہ زندگی بچائے، خواتین میں ہارٹ ایک کی علامات، غصے سے بچیں دل کے دورے سے بچیں غصے کے عالم میں جسم کی کیا حالت ہوتی ہے؟ غصہ آئے تو کیا کریں، غصہ کم کرنے کے لئے چند تجاویز، بچوں میں دل کی بیماریاں، بائی پاس سرجری اور فرائیڈ چکن، ایمرجنسی تدابیر، صحت مند دل کے لئے دس قیمتی مشورے، امراض قلب کا نباتاتی علاج، پیدل چلنے کے فوائد، دل کی دھڑکن بڑھنے کا غذا سے علاج، دل کی جلن کا غذا سے علاج، دل کے غلاف کی سوچن، ورم غلاف القلب جیری کارڈائٹس، دل کی سوچن، ورم قلب، دل کی عضلہ کی سوچن کارڈائٹس۔ اور بہت سی دل کی بیماریوں کے بارے میں چلے لو! ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

شیخ حبیب ایجنسی
نوید اسکوٹ کرچی
اردو بازار

Ph: 32773302

کہتے ہوئے اس کے جسم پر مزید زہر ماری ہو گیا تھا۔
سادو کچھ دیر تک غصے سے اس کی طرف دیکھتا رہا
پھر فراتے ہوئے اس کو دوبارہ جلد شکار تلاش کرنے کا کہہ کر
منہ ہی منہ میں ایک منتر پڑھ کر اس کی طرف پھونک دیا۔ ایسا
کرتے ہی انسانی بیضرا یکدم کمرے سے غائب ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

یہ فیصلہ کرتے ہی قافلہ جنگل کی طرف جانے
والے راستے پر چل پڑا۔ جنگل اندھیرے میں اپنی تمام تر
وحشت کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھا۔ ہلکی ہلکی دھواں
رہی تھی جس سے درختوں کے پتوں سے سرسراہٹ ہوا بہت
عجیب لگ رہی تھی۔ چاند آسمان پر موجود تھا لیکن بھی بھی
کوئی آوارہ بادل کا ٹکڑا اس کے سامنے آتا تو بل بھر کے
لئے اندھیرا چھا جاتا پھر چاند نمودار ہوتے ہی دوبارہ ہر
طرف دودھیا روشنی پھیل جاتی۔

قافلہ اپنی رفتار سے چلتا جنگل میں داخل ہو گیا۔
راستے کے دونوں طرف بڑے بڑے درخت اور جنگلی
جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی جھاڑیوں سے گیدڑوں
کے بولنے کی آوازیں سنائی دیتی تو بل بھر کے لئے
جنگل کی خاموش نفا میں ایک پھل پیدا ہوئی اور پھر یکدم
خاموشی چھا جاتی۔ رات کے تقریباً سات بج چکے تھے اور
جنگل میں یوں لگتا تھا جیسے رات کے بارہ بج چکے ہوں۔
جنگل میں آگے تک پہنچ جانے کی وجہ سے اب چاند
کی روشنی بھی اس کا اندھیرا ختم کرنے میں ناکام ہو چکی تھی
لیکن اس کے اندر بنا کچا راستہ صاف نظر آ رہا تھا جس کی وجہ
سے انہیں اس پر سفر کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی
تھی۔ قافلہ بڑی خاموشی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا
تھا۔ وہ نکل گاڑیاں جن میں جھیز، عورتیں اور بچے سوار تھے وہ
انہوں نے درمیان میں رکھی تھیں۔

قافلے کے آگے رجحیت سنگھ اور لوہن والی بھی تھی
اور آخر میں گاؤں کے بوڑھے اور جوان اپنی اپنی نکل گاڑیوں
کو ہانکتے چلے آ رہے تھے۔ جنگل کے راستے سے سفر کرنے
سے ان کو تقریباً پانچ میل کا سفر قیامتا ہی سوچ کر انہوں
نے یہ راستہ اختیار کیا تھا ورنہ اگر وہ سیدھے راستے پر چلتے تو
شاید رات کے ایک بجے تک ان کو گاؤں پہنچنا نصیب

سورج اپنے دن بھر کا سفر طے کرنا ہوا مغرب کی
جانب رواں دواں تھا اور شام کے سائے پھیلنے لگے
تھے۔ رجحیت سنگھ نکاح وغیرہ سے فارغ ہو کر اور تمام بارہائی
کھانا کھا کر ابھی کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی
لاکھ کوششوں کے باوجود وہ دن کی روشنی میں واپسی اختیار نہ
کر سکے تھے۔ رسومات کی بہتات اور کھانا تیاریوں میں دیر
ہوئی تھی اس لئے وہ بھی مجبور تھے اور جیسے تیسے کر کے اب
واپسی کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ جھیز کا سامان دو نکل
گاڑیوں پر لاد دیا گیا تھا اور تمام عورتیں اور بچے اپنی اپنی نکل
گاڑیوں میں براجمان ہو چکے تھے اور رجحیت سنگھ اپنی واپس
پریت کو روکنے اپنی بھی میں سوار ہو چکا تھا گاؤں کے کچھ
لوگ انہیں گاؤں کی سرحد تک چھوڑنے آئے تھے اور پھر
انہیں الوداع کہہ کر واپس اپنے گھروں کو چل دیئے۔

شام کے سائے گہرے ہونے کی وجہ سے لگایا گیا
اندھیرا چار سو پھلنے لگا تھا اور تمام بارہائیاں کو اپنے گھروں کو
لوٹنے کی جلدی تھی لیکن اس کے ساتھ رات کا خوف بھی
طاری تھا۔ کچھ روز پہلے کچھ گاؤں سے ایک عجیب و غریب
خلوق کے قصے ان کے کانوں تک بھی پہنچ چکے تھے اس لئے
ایک انجانا سا خوف ان پر طاری تھا۔ اتنی بڑی ہارٹ کورات
کو کھرا اندرجحیت سنگھ کے سرالوں کے بس کی بات نہیں تھی
اس لئے مجبور انہیں واپسی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

واپس گاؤں کی طرف جانے والا راستہ چند میل کی
مسافت پر تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک شہادت راستہ بھی
ان کے گاؤں کی طرف جاتا تھا لیکن اس کے لئے انہیں ایک
کھنڈے جنگل میں بنے ایک کچے راستے سے ہو کر جانا پڑتا۔
تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعد قافلہ رک
گیا اور چند بوڑھے اور کچھ دارو لوگوں نے باہمی مشورے سے

ہوتا۔ اکا دکا ہوتے تو شاید مرکز بھی ایسا کرنے کا نہ سوچتے چونکہ وہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے اس لئے انہوں نے یہ خطرناک راستہ اختیار کرنے کا سوچا تھا۔

قافلہ کو چلتے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لئے وہ بھی مطمئن لیکن ہوشیاری سے اپنے سفر پر رواں دواں تھے۔ دلچسپ سنگھ کے برابر میں اس کی دکان پریت کو رکھی کبھی دیکھا دے رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک کچھ ہونے والا ہو لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ ڈری ڈری دلچسپ سنگھ کے بازو سے چٹنی بیٹھی تھی اور خوف سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ دلچسپ سنگھ اس کی اندرونی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا وہ چونکہ خود ایک بہادر شخص تھا اس لئے اس پر کسی قسم کا کوئی خوف طاری نہیں تھا البتہ اسے اس بات کی فکر ضرور تھی کہ رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی اور اس وحشت زدہ ماحول کی وجہ سے عورتوں اور بچوں پر ایک وحشت کی کیفیت طاری تھی۔ اس ہے اسے بھی جلد از جلد اس وحشت زدہ ماحول سے نکل کر اپنے گاؤں پہنچنے کی فکر تھی۔ ابھی انہیں مزید اسی ماحول سفر طے کئے ہوا ہوگا۔

اچانک جنگل کے اندر سے ایک انتہائی خوفناک اور دل دہلا دینے والی چیخ سنائی دی یوں لگا جیسے کوئی بھیڑیا اپنی تمام طاقت کے ساتھ چلایا ہو۔ جنگل کے خاموش ماحول میں اچانک اس چیخ نے پھل پھاری جس کو سنتے ہی درختوں پر بیٹھے پرندے گھبرا کر اپنے اپنے گھونسلوں سے اڑ کر آسمان پر اڑنے لگے اور جھاڑیوں میں دیکے چھوٹے موٹے جانور جو بڑی حیرت سے قافلہ کو جانا دیکھ رہے تھے نکل نکل کر یوں بھاگنے لگے جیسے اگر انہیں ایک لمحے کی بھی دیر ہوئی تو وہ عفریت ان کو ہڑپ کر جائے گی۔

چیخ کے سنتے ہی عورتیں اور بچے خوف سے چیخنے چلانے لگے اور خود دلچسپ سنگھ کے برابر بیٹھی اس کی دکان بھی خوف سے لرہاتی ہوئی اس کی جھولی میں گر گئی۔ دلچسپ سنگھ نے جلدی سے اسے ایک طرف لٹایا اور جلدی سے کبھی رکوا کر عورتوں اور بچوں والی تیل گاڑیوں کی طرف دوڑا اچھاں

کھلبلی مچی ہوئی تھی بچوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی کچھ بچے اور عورتیں خوف سے رو رہی تھیں۔

دلچسپ سنگھ کو دیکھ کر ان میں سے کچھ عورتیں خوف سے چپ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ دلچسپ سنگھ نے انہیں حوصلہ دیا اور خاموش رہنے کا کہہ کر دوسرے نوجوان کے پاس پہنچا جو اس کی طرف ہی بڑھ رہے تھے۔ سب نے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار اور لٹائیاں اٹھائی ہوئی تھیں اور کچھ افراد نے اپنے ہاتھوں میں لٹائیاں اٹھائی ہوئی تھیں جن کی او کی پھڑ پھڑائی روشنی اندھیرے کو کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

نوجوانوں کے نزدیک پہنچتے ہیں دلچسپ سنگھ نے ان کو کوئی ہدایت دی جسے سن کر ان میں سے چند افراد عورتوں اور بچوں کی تیل گاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایک طرح سے انہوں نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ باقی بچ جانے والے چند نوجوانوں کو ساتھ لے کر دلچسپ سنگھ قافلہ کے آگے آگے چلے گئے۔

قافلہ ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک چیخ سنائی دینے کے بعد دوبارہ سنائی نہیں دی تھی لیکن وہ سب چونکا تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے ہتھیاروں کو ہاتھ میں تھا اسے اس عفریت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس عفریت کو زمین کما مٹی ہو یا آسمان نکل گیا ہو۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد بھی دوبارہ وہ خوفناک آواز سنائی نہیں دی تھی۔ ایسا محسوس کرتے ہی ان پر طاری خوف کچھ کم ہوا اور وہ دوبارہ آگے بڑھنے لگے۔ اس بار وہ سب پہلے سے زیادہ جوکھے تھے اور ہر قسم کی مصیبت سے بچنے کے لئے تیار تھے۔

ابھی انہیں چلے چند منٹ ہی ہوئے تھے ایک بار پھر وہی دل دہلا دینے والی چیخ دوبارہ سنائی جو کہ اس بار ان کے قریب سے ہی سنائی گئی تھی اور پھر آنا فنانا ان کے سامنے ایک وحشت ناک اور رگوں میں خون جمادینے والا منظر ایک انسانی بھیڑ بھڑکے کی شکل میں نمودار ہوا۔ چاند کی دوڑھیا چاندنی میں اس کے جسم پر لمبے اور

گہرے سیاہ بال بہت خوفناک منظر پیش کر رہے تھے اور کا چہرہ سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن اس کے اندر سے چمکتی اس کی آنکھیں دور سے ہی صاف نظر آرہی تھیں۔ بچے اور عورتیں تو اسے قریب دیکھتے ہی چیخنے چلانے لگے لیکن نوجوان اس کو دیکھتے ہی اپنے ہتھیاروں کو ہاتھوں میں تھا اسے آگے کھڑے ہو گئے ان سب کا انداز چار حانہ تھا کہ اگر اس عفریت نے ان میں سے کسی پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو وہ ان سے بچ نہیں پائے گی۔

وہ خوفناک بھیڑیہ اہل ملک تھا جسے اس سادھو نے نئی سمجھت ڈھونڈنے کے لئے دوبارہ بھیجا تھا۔ اور اس وہ عفریت اپنے آقا کا حکم بجالانے کے لئے اپنے شکار کی تلاش میں تھا جس کے لئے اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور اس کا شکار اس کے سامنے خود بخود چل کر آ گیا تھا اور وہ سادھو کے عتاب سے بچنے کے لئے یہ اب یہ موقعہ دوبارہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا اس لئے وہ ان کے سامنے نمودار ہو گیا تھا۔

نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر وہ عفریت دھاڑتا ہوا ان کی جانب بڑھا اور لپک کر ایک تیل گاڑی جس پر بچے سوار تھے اور چیخ چلا رہے تھے ان پر حملہ آور ہوا نوجوانوں نے گھبرا کر جواب میں اپنے ہتھیاروں سے اس سے بچاؤ کے لئے حملہ کیا لیکن وہ عفریت ان کے انداز سے بے تکلیف زیادہ تیز اور چالاک تھی اس نے تیزی سے خود کو ان کے وار سے بچاتے ہوئے جھپٹ کر تیل گاڑی سے ایک چھوٹے بچے کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن اسی دوران نوجوان اس کے مزید نزدیک پہنچ گئے تھے انہوں نے جلدی سے اس کی پیٹھ پر ڈنڈوں سے وار کر دیا بہت سے وار ان کے بے کار گئے۔

لیکن ان میں سے چند ایک ڈنڈوں کی ضربیں اس کی پیٹھ پر اپنا کام دکھائی گئیں۔ پیٹھ پر ڈنڈوں کی ضرب کھاتے ہی اس عفریت کے منہ سے تکلیف کی شدت سے بڑی ڈرامائی آوازیں نکلیں اور اس نے جلدی سے ہاتھ میں دیوبچے ہوئے بچے کو دوڑ پھینک کر اپنے بچاؤ کے لئے ان حملہ آور نوجوانوں پر حملہ کر دیا جو نوجوان اس کے زیادہ

نزدیک تھا اس کے جسم پر اس کا زوردار ہاتھ پڑا اور وہ اچھل کر دور جا کر ابید کچھ کر دوسرے نوجوان گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ دلچسپ سنگھ اس دوران خود بھی اپنے ہاتھ میں ایک لمبا ڈنڈا اٹھائے اس عفریت کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور دل ہی دل میں اس کی طاقت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس کے دائیں پہلو کی طرف سے محکم کر اس پر ایک زوردار وار کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران وہ عفریت تسلسل کر خود کو اس کے حملے سے بچاؤ کرتی تھی۔

یہ دیکھ کر دلچسپ نے دوبارہ اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن شاید وہ عفریت اتنے زیادہ افراد سے مقابلہ کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے اس نے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت بھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بھاگتی ہوئی جنگل کے اندر گھس گئی اور کچھ ہی دیر میں ان کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

عشاء کا وقت گزر رہا تھا رشیدی ماں اپنے ناپاک منصوبہ پر عمل درآمد کرنے کے لئے تیار تھی وہ اپنے بیٹے اور بہو کے کمرے میں جانے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی تاکہ ان کے سوتے ہی وہ اپنے مذموم کام کے لئے گھر سے روانہ ہو سکے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی ایک گھنٹہ پہلے وہ بوجھ دے لیکن وہ ایسا کرنے سے مجبور تھی نہ جانے اسے اپنی بہو سے کیا پھر تھا حالانکہ وہ بچاری اس کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھارتی تھی اور اسے کسی قسم کی شکایت کا موقعہ نہیں دیتی تھی لیکن پھر اس کی ساس اس کی دشمن بنی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد ان کے کمرے کی بٹی بجھنے پر وہ خاموشی سے اٹھی اور گھر کا دروازہ کھول کر آہستہ سے اسے باہر سے بند کر کے گلیوں سے ہوتی ہوئی قبرستان جانے والے راستے پر چل پڑی۔ اس کا شوہر بڑیر جو ایک راج گیر تھا اور محنت مزدوری کر کے اپنے بیوی بچے کا پیٹ پالتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ وہ بھی ہر لحاظ پر شخص تھا اور ہر کسی سے ہنس کر اور خوش ہو کر بات کرتا تھا اور اپنی مزدوری اور محنت کے لئے کسی سے بھی بحث نہیں کرتا تھا اور جو بھی اسے جو مزدوری دے دیتا تھا وہ

خاموشی سے لے لیتا تھا جس کی وجہ سے اللہ نے اس کی کمائی میں بہت برکت ڈال دی تھی اور اس کے گھر کا گزر بسر بہت اچھا ہونے لگا تھا۔

لیکن قسمت بھی شاید اس کے خلاف ہو چکی تھی کہ ایک روز اسے ایک بوسیدہ مکان کی حرمت کا کام ملا۔ وہ سب سویرے تازہ وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے کام کی طرف چل نکلا۔ وہ چونکہ خود مہتری تھا اور ایک مزدور کو بھی اس نے اپنے ساتھ لیا اور اس مکان میں پہنچ کر مزدور کو کام سمجھانے لگا۔ مکان کافی عرصے سے بوسیدہ حالت میں دیران پڑا تھا اور اس کو گاؤں کے ایک خوشحال شخص نے اس کے مالک سے خرید لیا تھا اور اس کو حرمت کروا کر خود اس میں رہائش رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔

گاؤں میں بشیر مہتری کی خوش اخلاقی اور کام کی وجہ تھی اس لئے اس نے بھی اس کام کے لئے اسی کا انتخاب کیا تھا حالانکہ شہر میں ایک سے ایک داج کیڑل جاتا تھا لیکن اس نے ان سب پر بشیر کو ذوقیت دینا مناسب سمجھا اور اس کے نتیجے میں آج وہ اس بوسیدہ مکان میں موجود تھے۔

مکان کے مالک نے تمام کام چونکہ اس کو پہلے سے ہی بتا دیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے اس لئے وہ اس وقت ان کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ مکان کی حالت سے یوں لگتا تھا جیسے کافی سالوں سے وہ دیران پڑا ہے اور اس کے اندر کی طرف جنگلی جھاڑیاں اور خورو گھاس اگی ہوئی تھی۔ چاہا جی کی ایشیں ٹھہری پڑی تھیں جن میں سے بہت سی ٹوٹی ہوئی تھیں کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں خالی تھیں اور صرف ان میں لگی چوکھائیں موجود تھیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی ان کے دروازے اور کھڑکیاں چرا کر لے گیا ہو۔ یہ تقریباً چھ کمرے پر مشتمل مکان تھا اور اس کی اوپری منزل نہیں تھی۔ کمرے کے اندر ہر طرف گندگی بکھری ہوئی تھی اور ایک عجیب طرح کا قحط پھیلا ہوا تھا۔ بشیر اور مزدور اس کی حالت دیکھ کر پہلے تو پریشان ہو گئے کہ کیسے اس جگہ کو پھر سے رہنے کی قابل بنایا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اس تباہ حال مکان کے مالک نے انہیں مہتری مزدوری دینے کی حامی بھر لی تھی اس لئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کام کرنے پر آمادہ ہو گئے

تھے۔ ان دونوں نے اپنے اوزاروں کا تھیلا ایک جانب تھوڑی سی جگہ صاف کر کے رکھ دیا اور پھر ایشیں اٹھا اٹھا کر ایک طرف بچھنے لگے۔

ابھی انہوں نے کچھ ایشیں ہی ایک طرف بچھنی تھیں اچانک ایک کالا سیاہ سانپ پھٹکارتا ہوا ایک ایشوں کے گھیر سے نکلا اور بڑی تیزی سے اپنے نزدیک بشیر کو پا کر اس کی پنڈلی پر ڈس لیا اس اچانک افتاد پر بشیر اور مزدور گھبرا کر باہر کی جانب لپکے لیکن اپنے پیچھے رکھی ایشوں کے ڈھیر سے ٹکرا کر پیچھے گر گئے۔

بشیر چونکہ مزدور کے آگے کی جانب گر تھا اور کسی قدر سانپ کے نزدیک بھی تھا اس لئے وہ پلٹ میں آ گیا اور سانپ کے ڈسنے کا شکار ہو گیا۔ مزدور یہ دیکھ کر فوراً دوبارہ اٹھا اور چیتا ہوا باہر کی جانب بھاگا۔ خوف سے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ چیختا چلاتا گاؤں کے مکانوں کی جانب بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

گاؤں پر زیادہ پڑائیں تھیں اس کا دکا دکائیں وہاں تھیں جو صبح سویرے ہی کھل جاتی تھیں جہاں سے گاؤں کے لوگوں کو درود دہی اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں مل جاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ دوکانیں کھلی ہوئی تھیں ان پر کھڑے چند گاہک اور دوکانداروں نے جب اسے حواس باندھ اپنی جانب بھاگتے دیکھا تو وہ بھی دوکانوں سے باہر نکل کر اس کی جانب لپکے مزدور تیزی سے بھاگتا ہوا ان کے نزدیک پہنچا اور لہرا کر ان کے قریب گر گیا اور بیہوش ہو گیا۔

یہ ایک قدرتی عمل ہے کہ معصیت کے وقت جب کسی کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ وہ اب محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گیا تو وہ اپنے ہوش سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

یہی حال اس مزدور کا ہوا وہ بھی ان کے نزدیک گر کر بیہوش ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر گاؤں کے دو جوان بھاگ کر گاؤں کے کھٹوے حکیم کو بلا لائے جس نے اس کی نبض دیکھ کر اور وہاں موجود لوگوں سے باہمی بات چیت کر کے اپنا سر ہلایا اور تجویز میں سے ایک جنگلی دوا لے کر اس مزدور کا منہ کھول کر اس میں انڈیل دی اور اس کے ساتھ ہی ایک روکا عمار سے پانی طلب کر کے اس کا ایک گھٹ اس مزدور کا

منہ کھول کر اس میں ڈال دیا۔ کچھ پانی اس کے منہ سے بہہ نکلا لیکن کچھ مقدار اس کے حلق میں اتر چکی تھی اور غالباً اس پانی کے ساتھ ساتھ پہلے سے موجود دوا بھی اس کے حلق سے اتر چکی تھی اور پھر کچھ ہی دیر میں مزدور نے اپنی آنکھیں کھول دیں پہلے تو وہ کھوٹی کھوٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر جب اس کے شعور نے اسے اصل حقیقت دکھائی تو وہ چیخ مار کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر اس کے ہٹلانے پر گاؤں کے چند جوان اس بوسیدہ مکان کی جانب بھاگے۔

لیکن انہوں نے وہاں پہنچ کر جو مظہر اپنی جاکتی آنکھوں سے دیکھا وہ ان کا دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔ بشیر کا جسم نیلا پڑ گیا تھا اور اس کا چہرہ بھی یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے بڑی اچھے طریقے سے اسے کونوں کی بمٹی میں پکایا ہو۔ اس کے منہ سے سفید رنگ کی جھاگ نکل کر جم چکی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ وہ خوف سے اس کے نزدیک بھی نہیں جا رہے تھے اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظریں اس سانپ کو تلاش کر رہی تھیں جس کے متعلق وہ مزدور کی زبانی سن چکے تھے۔ لیکن وہ دور دور تک انہیں کوئی سانپ یا کوئی اور موذی جانور نظر نہیں آیا غالباً وہ موذی اپنا کام دکھا کر وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔

کچھ دیر تک سکتے کی حالت میں کھڑے رہنے کے بعد انہیں ہوش آیا اور انہوں نے جلدی سے ایک نو جوان کو رشید کے گھر کی جانب دوڑایا اور ساتھ ہی ایک چادر اور چار پائی بھی ساتھ لانے کے لیے کہا یہ سننے ہی وہ نو جوان جلدی سے وہاں سے بھاگ گیا۔ اور کچھ ہی دیر میں رشید کی ماں روٹی دھوتی اپنی بہو اور بیٹے کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ اس نے رو کر آسمان سر ہٹا لیا تھا اور اس کے ساتھ گاؤں کے اور بہت سے لوگ اور عورتیں بچے بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں آ گئے تھے۔

گاؤں میں ایک کہرام مچ گیا تھا ہر شخص اشتکبار تھا کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کل بشیر جوان کے درمیان تھا اب ان سے بہت دور چلا گیا تھا۔

شوہر کے مرنے کے بعد رشید کی ماں رفتہ رفتہ اپنے

شوہر کا غم بھول چکی تھی اور پھر دوبارہ سے اپنے کاموں میں مگن ہو چکی تھی۔ رشید کی بہو اس کی خدمت کر کے اسے اپنے سر کاٹ بھلانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی لیکن بھانے کی بات بھی کہ رشید کی ماں اس کی دشمن بن گئی تھی اور کسی نہ کسی طریقے سے اس سے اپنے بیٹے رشید کا پیچھا چھڑانے کی فکر میں رہتی تھی اس کے لئے اس نے ہر ممکن کوشش کر لی تھی اور اس سلسلے میں اس نے اپنی ایک دو بیٹیوں سے بھی تذکرہ کیا تھا جو خود اسی ڈگر پر چل رہی تھیں جس پر اس وقت وہ خود بھی اس لئے ان میں سے ہی اس کی ایک بیٹی نے اسے شاہ بابا کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا اور اسی کے نتیجے میں آج اس کے پاس شاہ بابا کا دیا ہوا ایک تعویذ تھا جسے دفنانے کے لئے وہ اس وقت رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل پڑی تھی۔

پہلے تو اس نے ٹیکے موچی کو اپنے ساتھ ملانے کا ارادہ کر کے ایک دوبار قبرستان کا پتھر لگایا تھا اور اس میں ناکام رہی تھی لیکن پھر اس نے ہمت کر کے خود ہی اس کام کو سر انجام دینے کا ارادہ کیا اس سے اس کا کوئی راز داری نہیں ہوگا اور اس کے پیسے بھی بچ سکتے تھے۔ کیونکہ پہلے دو دوبار ٹیکے موچی کو پیسے دیے چکی تھی اور اس کے لئے اس نے رشید سے سو بھانے بنائے تھے اس لئے اب کیا کہہ کر تیسری بار رشید سے پیسے مانگتی اس سے وہ اس پر شک کر سکتا تھا اور پوچھ سکتا تھا کہ وہ اتنے پیسوں کا آخر کیا کرتی ہے حالانکہ اس کی ضرورت کی ہر شے رشید اس کو گھر میں ہی لاکر دیتا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے یہ کام خود ہی کرنے کا فیصلہ کیا اور اس وقت اس کی چال میں تیزی تھی اور اسے اپنی منزل کا بھی بخوبی اندازہ تھا کیونکہ وہ دن کی روشنی میں وہاں کی نشانی ذہن میں رکھ آئی تھی اس لئے وہ سید کی اسی راستے پر چل رہی تھی جو سید حامی بوسیدہ قبر کی طرف ہی جاتا تھا۔

قبرستان گاؤں سے باہر تھا زیادہ قبریں نہیں تھیں لیکن اس میں لگے ٹیکڑوں اور بیلو کے درختوں نے ایک جھنڈ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چلتے چلتے وہ قبرستان کے نزدیک پہنچ کر رک گئی اور زمین پر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

راستے میں پڑنے والی چند سی قبروں پر دیئے جل رہے تھے لیکن اسے ان سے کوئی غرض نہیں تھی وہ سیدھی چلتی ہوئی اسی طرف جا رہی تھی جہاں وہ یوسیدہ قبر تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ وہاں پہنچی تھی اور اس کی توقع کے عین مطابق اس پر ایک چراغ روشن تھا جس میں تیل لالباں بھرا ہوا تھا اور اس چراغ کی لو پھڑ پھڑا رہی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ہوا نہیں چل رہی تھی ورنہ شاید آج بھی اسے ناکام لوٹنا پڑتا اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے سے بندھا تعویذ کھولا اور جلدی سے اسے قبر کے سر ہانے پیٹھ کر ایک گلابی کی مدد سے زمین کھودی اور تعویذ اس میں رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی اور اس مٹی پر دو تیشوں رکھ کر کھد کر مٹی والے ہاتھ جھاڑے اور جلدی سے واپس گھر کی طرف چل دی۔ اس کام کو انجام دینے کی خوشی یا جوش کی وجہ سے پہلے تو اسے اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ وہ تنہا رات کے اندھیرے میں قبرستان میں ایک یوسیدہ قبر کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے۔

لیکن جب اس نے یہ کام مکمل کرنے کے بعد دوبارہ اپنے گھر کا رستہ اپنا تو پہلی بار اسے خوف محسوس ہوا۔ اور اب تو اسے قبرستان کے اندر سے کہیں کہیں گیدڑوں اور نکول کے بھونکنے کی آوازیں بھی واضح سنائی دے رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھے جیسے بہت سے لوگ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے ہوں اور اب تو اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ لوگ باتیں کرنے کے دوران اس کا نام بھی لے رہے ہوں پہلے تو اسے نے یہ سب اپنا وہم سمجھا۔

لیکن جب ان آوازوں نے شدت اختیار کر لی تو وہ اندھا دھند اپنے گھر کی طرف جانے والے راستے پر دوڑنے لگی۔ اسے اس بات کا احساس تک نہ تھا کہ وہ دوڑتی ہوئی اپنے راستے میں آنے والی قبروں پر بھی جرحتی جا رہی ہے اس وقت تو بس اس پر ایک ہی بات کی ذمہ داری تھی کہ وہ جلدی سے اپنے گھر پہنچ جائے۔

وہ جتنی تیزی سے دوڑ رہی تھی اتنی ہی تیزی سے وہ آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں اس نے بھاگتے ہوئے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ

آوازیں اس قدر تیز تھیں جیسے اس کے کانوں کے پردے چر کر اس کے دماغ میں بیوست ہو رہی تھیں۔ مسلسل دوڑنے کے بعد وہ قبرستان سے باہر نکل کر گھر کی طرف جانے والی گلی میں داخل ہو چکی تھی اور کچھ ہی دیر میں اپنے گھر کے نزدیک پہنچ گئی اب اسے وہ آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں اس نے جلدی سے گھر کے دروازے کو کھولا اور اندر داخل ہو کر آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔

گھر میں قبرستان کی ہی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اس کے بیٹے اور بہو کے کمرے کی کئی جگہ بھی۔ شاید وہ دونوں اس کی غیر موجودگی سے بے خبر ہی رہے تھے ورنہ اس وقت وہ دونوں اس کے انتظار میں صحن میں ہی موجود ہوتے۔ یہ دیکھ کر اس کی تسلی ہو گئی اور وہ جلدی سے اپنے بستر کی جانب بڑھی اور خاموشی سے چادر اوڑھ کر سو گئی۔

☆.....☆.....☆

عقربت کو قاف ہوتے دیکھ کر برات والوں نے سکھ کا سانس لیا اور پھر سے اپنا سفر شروع کر دیا۔ اس بار انہوں نے عورتوں اور بچوں والی تیل گاڑیوں کو مزید اپنے گھیرے میں لے لیا تھا تاکہ وہ خوفزدہ نہ ہوں اور خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ چاند خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا اور آسمان پر ستارے بڑی حیرت سے رات کے اندھیرے میں اس قافلے کو دیکھ رہے تھے جو سیدھا ایک راستے پر گامزن تھا جو ان سب کے لئے ایک نل گاہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن وہ سب اپنے آنے والے انجام سے بے خبر اپنی منزل کی جانب چل رہے تھے۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے جنگل میں لگے درختوں کا سلسلہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی وہ کچھ دور اور چلے ہوئے کہ ان کے سامنے ایک بہت ہی خستہ حال اور پرانے مندر کی عمارت دکھائی دی۔ اس کی حالت سے یوں لگ رہا تھا جیسے صدیوں کی گردش میل و نہار نے اس کی خوبصورتی کو لٹچ لٹکایا ہو۔

پوری عمارت پر غومیت چھائی ہوئی تھی وہ سب چونکہ پہلے بھی اس طرف نہیں آئے تھے اس لئے اس

عمارت سے ناواقف تھے لیکن اب قسمت انہیں یہاں لے آئی تھی تو انہیں پتہ چلا کہ اس خوفناک جنگل میں ایک پرانا اور ویران مندر بھی موجود ہے۔ مندر کے بڑے گیٹ کے سامنے چابجا جنگلی پودے اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جن میں چوہے بلباں بھاگ رہی تھیں جو چاند کی چاندنی میں صاف نظر آ رہی تھیں۔

عمارت کی دیواروں کا پلستر تقریباً اوڑھ چکا تھا اور اس کے ٹوٹے ہوئے برج بہت ڈراؤنا منظر پیش کر رہے تھے۔ چاند چلنا ہوا میں مندر کے اوپر آگیا تھا۔ جس کی وجہ سے مندر پر چاندنی ٹھہری ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے صحن دروازے کے اندر سے روشنی کی چمکتی نظر آ رہی تھی۔

اس جنگل میں ایسی روشنی کا وہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے لیکن حقیقت ان کے سامنے موجود تھی۔ صحن دروازے کے سامنے ایک سوکھا تالاب بھی موجود تھا جس کے اندر کسی پرانے درخت کی جڑیں پانچ چھ فٹ تک اونچی اٹھی ہوئی تھیں اور درخت کا نام و نشان تک موجود نہیں تھا لیکن جڑیں موجود تھیں بڑا عجیب سا منظر تھا جو ان کی عقلوں پر حاوی تھا۔ وہ وہاں سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے کسی ناپیدہ قوت نے ان سب کو پتھر کا بنا دیا ہو اور وہ سب نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے بھاگنے سے قاصر تھے۔

ابھی انہیں وہاں کمرے کچھ لمبے ہی ہوئے ہوئے کھڑے تھے کہ اچانک مندر کے سامنے والی دیوار ایک دم پھٹی اور اس میں سے ایک عورت کا ادھونگا جسم باہر نکلا جس کا ایک ہاتھ آگے کی جانب بڑھا ہوا تھا اور اس کو دوسرا ہاتھ اس کے پیچھے کی جانب تھا اور اس کی آنکھیں سیاہ جلیوں سے عاری تھیں۔ جنہیں دیکھ کر وحشت طاری ہو رہی تھی۔ اس اچانک افتاد پر وہ بڑھکلا کر اس طرف دیکھنے لگے اور پھر دفعتاً اس کھلتی عورت نے اپنا دایاں ہاتھ ایک تیل گاڑی کی جانب بڑھایا اور ایک عورت کی گود میں موجود بچے کو جھپٹ کر چھینا اور واپس دیوار میں غائب ہو گئی۔ اتنا قافلہ ہونے کے باوجود اس کا ہاتھ اس تیل گاڑی تک یوں پہنچ گیا تھا جیسے وہ کوئی رب کا ہاتھ ہو جو ضرورت کے وقت کھینچ چلا جا رہا ہو۔ یہ سب

کچھ آٹا ٹاٹا ہوا اور جتنی دیر میں وہ سب اس کے بارے میں سوچتے وہ غریب اپنا کام کر چکی تھی۔

کچھ دیر تک وہ بت بنے یہ سوچتے رہے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے اور پھر جب انہیں حقیقت کا پتہ چلا تو وہ سب چیخنے چلانے لگے اور جس عورت کا بچہ وہ غریب لے گئی تھی وہ دھڑائیں مار مار کر کہن کر رہی تھی۔ دلچسپ سنگھ چونکہ سب سے آگے والی تھی میں سوار تھا اور وہ بھی اس دوران اس تیل گاڑی کے نزدیک پہنچ چکا تھا جس میں موجود عورت بین کر رہی تھی اور پھر حقیقت کا پتہ چلتے ہی اس نے چند نوجوانوں کو اپنے ساتھ لیا اور اس مندر کے صحن دروازے کی جانب پیش قدمی کی۔

وہ ہر حالت میں اس بچے کو واپس لانے کا فیصلہ کر چکا تھا چاہے اس کے لئے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے یہ سوچ کر اس نے غصے اور جوش سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس مندر کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کر لیا تھا۔

مندر کے اندر جانے سے پہلے اس نے کچھ اور نوجوانوں کو قافلے کے افراد کی حفاظت کے لئے مامور کیا اور کچھ مزید ہدایات دے کر مندر کے اندر جانے والی بیڑھیوں پر قدم رکھ دیئے۔ وہ سب چوکنے لگے اور ہوشیاری سے اپنے ہاتھوں میں ڈٹے قہارے بیڑھیوں چڑھنے لگے۔ بیڑھیوں پر جا بجا درختوں کے پتے اور مٹی جی جوان کے قدم رکھنے پر چرچاہٹ کی آوازیں نکال رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں بچوں کی یہ آوازیں بہت خوفزدہ کر رہی تھیں۔ بیڑھیوں چڑھ کر اوپر پہنچنے ہی سامنے ایک بڑی سی راہداری تھی جس کے دونوں طرف بہت سے کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے اور ان پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ حجت سے ٹپکتے ہوئے کڑیوں کے جالے زمین تک پہنچے ہوئے تھے اور فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے کافی سارے گڑھے بنے ہوئے تھے کچھ ہی دیر میں وہ سامنے نظر آنے والے ایک بڑے سے دروازے میں داخل ہو گئے جہاں سے ٹپکی ٹپکی ہوئی سی روشنی باہر آ رہی تھی۔

یہ ایک بڑا سال تھا جس کی دیواروں کا رنگ گہرا پیلے رنگ کا تھا جس پر جا بجا ہندوؤں کے دیوتاؤں کی

تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ ہال کے وسط میں ایک بہت بڑا بہت نصب تھا جس کے بہت سے ہاتھوں میں مختلف چیزیں پکڑیں ہوئی تھیں۔

بہت کے قدموں میں خشک پھولوں کا ڈھیر تھا اور بہت سے خشک ناریل کے جھلکے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کسی دور میں یہ ایک پرکشش عبادت گاہ رہی ہوگی لیکن اب اس پر ایک عجیب سی خوشحالی ہوئی تھی۔ نجانے کن حالات کے تحت لوگ اسے خیر باد کہہ گئے ہوں گے۔ ہال کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کافی بڑا ہوگا۔

چاروں طرف ایک پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہال بالکل خالی تھا روشنی کے لئے چھت پر ایک کم واٹ والا بلب روشن تھا نجانے اس غیر آباد اور انسانی آبادی سے دور اس دریاں مندر میں یوں روشنی کا انتظام کیسے کیا گیا ہوگا مگر اس وقت ان باتوں پر سوچنے کی بجائے اس کشیدہ بچے کی جان بچانے کے بارے میں سوچنے کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے اس خیال کو ذہن سے فوراً جھٹکا اور بڑی خاموشی سے سامنے نظر آنے والے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھنے لگے جو ہال کے دائیں طرف ایک کونے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا چھوٹا سا دروازہ ایک طرف کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر اندر دکھائی دے رہا تھا یہ کل پانچ افراد تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں مضبوط ڈھکے اٹھائے ہوئے تھے اور چوکنا تھے۔

دلچسپیت سنگھ نے انہیں ایک لائن میں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دو افراد کو اپنے پیچھے نظر رکھنے کا اشارہ کر کے اس چھوٹے دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے اندر جھانکنے کی کوشش کی کہ شاید اسے کچھ نظر آجائے لیکن بہت کوشش کے باوجود اسے اندر اندر میرا ہی نظر آیا۔ وہ وہیں رک کر اندر سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا مگر اندر خاموشی ہی تھی اور کوئی آواز یا آہٹ تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ابھی انہیں وہاں کھڑے تھوڑی سی ہی ہوئی تھی کہ ہال کی دیواریں یوں ہلنے لگیں جیسے باہر زلزلہ آگیا ہو۔ ہال میں رکھنا سب سامان یوں زور زور سے ہلنے لگا جیسے کوئی اسے اپنے ہاتھ سے پکڑ کر

زوردار پکڑوئے لگا ہو۔ سامان کے ساتھ ساتھ وہ سب لوگ خود کو بھی گھومتا محسوس کرنے لگے انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی کھار کے برتن بنانے والے تخت یعنی آدی پر بیٹھ گئے ہوں انہیں اپنا آپ تیزی سے گھومتا محسوس ہوا یہ دیکھ کر انہوں نے جلدی سے خود کو سنبالا اور جہاں تھے وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ یہ سب کچھ تھوڑی دیر تک ہوا اس کے بعد ہال میں خمیر خاموشی چھا گئی۔

پھر اچانک ہال میں تیز ہنگامہ بجنے کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے ساتھ ساتھ تیز ہوا کے جھکڑوں کا شور بھی سنائی دیا یوں لگا جیسے باہر یکدم بہت زور کا طوفان آگیا ہو لیکن یہ سب کچھ صرف چند لمحوں کے لئے ہوا پھر ایکدم خاموشی چھا گئی۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ان کے ساتھ قسمت کیا کھیل رہی ہے اور وہ کس مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ وہ سب سب ایکدم سرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ کیا یہیں اب کیا ظہور میں آتا ہے۔

صدیوں پرانا مندر رات کا وقت اور کسی انسان کا وہاں موجود ہونا رگوں میں خون جگر کر دینے کے لئے کافی تھا۔ دلچسپیت سنگھ خود ایک بہادر و جوان تھا لیکن جس طرح پے درپے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس سے وہ بھی کچھ خوفزدہ اور پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں اس سے بچنے کا کوئی حل نہیں آ رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ اسے اس معصوم بچے کی بھی فکر ستائے جا رہی تھی جسے وہ عفریت اٹھا کر نجانے کہاں لے گئی تھی۔

اس بچے کی ماں کا روتا اور دھڑلے مانتا چہرہ بار بار اس کے سامنے آ رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ اس مندر میں داخل ہونے کے بعد انہیں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ آخر وہ عفریت اس بچے کو اس مندر کے اندر کہاں لے گئی ہے اور جو واقعات ان کے ساتھ پیش آ رہے تھے وہ بھی اس بات کا ثبوت تھے اس دریاں مندر کے اندر خاموشی طاقیتیں رہائش پذیر تھیں۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے سے پہلے وہ اسے اس عفریت کے چنگل سے چھڑائے لیکن ابھی تک وہ اندر میرے میں ہی ٹانگ ٹوٹیاں مارتے پھر رہے تھے۔ ہال میں خاموشی چھاتے ہی وہ دوبارہ کوئی اور

راستہ ڈھونڈنے لگے اور پھر تھوڑی سی کوشش سے انہیں ہال کے انتہائی بائیں کونے میں چند سیڑھیاں کی تہہ خانے میں اترتی دکھائی دیں۔

سیڑھیوں کے نزدیک رک کر انہوں نے سرگوشی میں کوئی بات کی اور پھر تین افراد آہستہ آہستہ سیڑھیوں کی طرف بڑھے اور نیچے جاتی سیڑھیاں اترنے لگے وہ افراد ان کے پیچھے دوسری طرف منہ کئے احتیاط سے ان کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اترنے لگے اس طرح انہوں نے دوڑوں طرف نظر رکھی ہوئی تھی تاکہ کسی بھی آنے والے خطرے سے بچنا چکے۔ سیڑھیاں زیادہ چوڑی نہیں تھیں اور نیچے اترنے میں انہیں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کیوں کہ سیڑھی پر ان کا مکمل عبور پڑنے کی بجائے آدھا ہی ٹک رہا تھا جس کی وجہ سے انہیں نیچے اترنے میں بہت پریشانی ہو رہی تھی۔ کچھ سے بالا تھا کہ جس کسی نے بھی یہ سیڑھیاں بنائی تھیں کیا سوچ کر بنائی تھیں کہ ایک انسان کو نیچے اترنے اور اوپر چڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔ سیڑھیوں کی تعداد کم بیش تیس بتتیس کے قریب ضرور رہی ہوگی اس کا اندازہ انہیں نیچے اترتے ہوئے ہو رہا تھا جیسے جیسے وہ تہہ خانے میں اترتے جا رہے تھے اس میں ٹھٹھن بڑھتی جا رہی تھی اور ایسا نقص پھیلا ہوا تھا جیسے کسی مذبح خانے سے خون اور لاشوں کی بدبو آتی ہے بدبو اس قدر تیز تھی کہ انہیں اسے ناک پر بے اختیار ہاتھ رکھنے پڑے۔ لیکن سزا مند وہ بدبو انہیں اپنے دماغ میں محسوس ہو رہی تھی۔

تہہ خانے کی جب آخری پانچ سیڑھیاں بچ گئیں تو وہ وہیں رک کر اندر کا جائزہ لینے لگے اندر بالکل اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اس کے فرش پر سیاہی مائل مادہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں پھاڑے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آخر وہ کیا چیز کی جو فرش پر جا بجا پھیلی ہوئی تھی اور پھر ایک جھٹکے سے وہ سب اچھل پڑے خدا کی پناہ وہ سیاہی مائل مادہ کچھ اور نہیں بلکہ خون تھا اور وہ سزا مند اور بدبو بھی اسی میں سے ہی آ رہی تھی نجانے وہ کسی جانور کا خون تھا یا کسی انسان کا وہ سب یہ سمجھنے سے قاصر تھے لیکن اس وقت تو انہیں اپنا آپ بہانا مشکل ہو رہا تھا۔

تہہ خانے میں ایک کونے میں ایک کھجور کے چوں والی پرانی سے چٹائی بھی نظر آ رہی تھی جس پر ایک طرف ایک مٹی کا بڑا سا پیالہ رکھا تھا اور ایک طرف لوہے کا ایک بڑا سا صندوق بھی رکھا تھا جس پر سیاہ رنگ پینٹ ہوا تھا شاید صدیوں کی مٹی کی ایک تہہ جم چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس تہہ خانے میں کوئی دروازہ یا کھڑکی وغیرہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس تہہ خانے میں اترنے کے لئے صرف وہ سیڑھیاں ہی واحد ذریعہ تھیں جن پر اس وقت وہ سب کھڑے حیرت اور خوف سے تہہ خانے کے فرش کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہ کر انہوں نے آپس میں کوئی سرگوشی کی اور پھر دلچسپیت سنگھ ایک نوجوان کے ساتھ اس لوہے کے صندوق کی طرف بڑھا وہ اسے کھول کر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ شاید اس میں رکھے کسی سامان سے اس تہہ خانے کا راز معلوم ہو سکے۔ یہ سوچ کر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس لوہے کے صندوق کی جانب بڑھنے لگے۔

صندوق پر ایک بوسیدہ سا ٹالا لگا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک پہنچ کر دلچسپیت نے آہستہ سے ہاتھ کو ہاتھ میں پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو فوراً کھل گیا غالباً بوسیدہ اور پرانا ہونے کی وجہ سے اس کا میکانزم خراب ہو گیا تھا اس لئے فوراً کھل گیا۔ دلچسپیت نے اسے کھڑکی سے نکال کر ایک طرف اچھال دیا جس سے تہہ خانے کے فرش پر ایک چٹکی سے آہٹ ہوئی پھر یکدم خاموشی چھا گئی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ کوئی اور آہٹ یا آواز سننے کی کوشش کرنے لگے لیکن دوسری طرف خاموشی تھی۔ لگتا تھا اس وقت ان کے علاوہ اس جگہ کوئی اور نفس موجود نہ تھا۔

یہ دیکھ کر دلچسپیت نے آہستہ سے اس صندوق کا ڈھکن اٹھانا شروع کیا۔ اور پھر جیسے ہی اس نے پورا ڈھکن اوپر اٹھا کر اس کے اندر جھانکا ایک زوردار نقصان کا سبب اس سے نکل کر ان کے ناکوں سے ٹکرایا اور خدا کی پناہ اندر کا منظر اچھے اچھوں کا دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔ صدیوں پرانے دریاں مندر کے اندر رات کے اندر میرے میں ایک تہہ خانے کے اندر صندوق میں رکھے مختلف لوگوں کے کئے ہوئے سر رکھے ہوئے تھے یوں لگتا جیسے کسی نے ابھی

ابھی ان کو ان کے جسموں سے علیحدہ کر کے اس صندوق میں بھر دیا ہو یہ سب دیکھ کر وہ چیخنے چلاتے واپس میز جیوں کی طرف بھاگے اور جلدی جلدی اس کی میز حیاں چڑھنے کی کوشش کرنے لگے لیکن یہاں کرنے پر انہیں بہت مشکل پیش آ رہی تھی کیونکہ مندر کے تہ خانے کی میز حیاں چوڑائی میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے انہیں ایسا کرنے نہیں دے رہی تھیں۔ جلدی میں وہ بار بار نیچے گر رہے تھے لیکن پھر جیسے جیسے کر کے وہ آخر تہ خانے سے باہر نکلے میں کامیاب ہوئی گئے لیکن جیسے ہی انہوں نے باہر قدم رکھے وہ ایک دم ایک بھانک شکل سا دھو سے ٹکرائے جو سیدھا ان میز جیوں کی جانب ہی بڑھا چلا آ رہا تھا اور پھر یہ دیکھ کر ان کی رہی تھی ہمت بھی جواب دے گئی کہ اس سا دھو کے ایک ہاتھ میں اس بچے کا کٹا رہا سر لٹک رہا تھا جسے دھو بیڑے ہوئے وہ اس وقت اس خوفناک مندر کے تہ خانے سے نکل رہے تھے۔

بچے کا سر گردن تک کٹا ہوا تھا اور اس کی کٹی گردن سے بہت سی رگیں باہر چھو رہی تھیں جن سے تازہ تازہ خون فرش پر پھیل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی اس سا دھو نے اس بچے کو ذبح کیا ہو۔ تھانے اس بد بخت سا دھو نے اس معصوم کیساتھ کوٹنا بھیانک کھیل کھیلایا ہوگا اور کس قدر اس بچے کو اذیت ہوئی ہوگی۔

پہلے تو سا دھو بھی اچانک ان لوگوں کے ٹکرانے کی وجہ سے ایک دم گھبرا گیا تھا اور اسی گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ ہاتھ میں چھوٹی اس بچے کی گردن ایک جھٹکے سے لگی اور سیدی تہ خانے میں جانے والی میز جیوں کے اندر ایک قطار کی مانند لڑھکتی چلی گئی۔ لیکن اس ساری کارروائی میں وہ سب یہ ضرور دیکھ چکے تھے کہ وہ کٹا ہوا سر اسی بچے کا ہی تھا۔ سا دھو کے خام خیال میں بھی نہیں تھا یوں اچانک کوئی تہ خانے سے نکل کر اس سے ٹکرانے کا اس لئے وہ بھی بے فکری سے چلتا ہوا تہ خانے کی جانب بڑھ رہا تھا لیکن پھر یوں اچانک دھکا لگنے کی وجہ سے وہ بوکھلا گیا اور بچے کی گردن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تہ خانے کی میز جیوں پر گر گئی اور لڑھکتی ہوئی اندر غائب ہو گئی اور وہ خود ز میں یوں ہو گیا۔

دلچسپ نگاہ اور اس کے پیچھے لپکتے والے اس کے دیگر ساتھیوں نے جلدی سے زمین پر گر کر اس سا دھو کو روپتا جیبا لیکن اس عرصے میں وہ سا دھو مسلسل چٹا تھا زمین پر گرتے ہی اس نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑھ کر ان کی طرف پھونک دیا۔ دلچسپ اور اس کی ساتھیوں کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے جسموں کو مفلوج کر دیا ہو ان کے لاکھ لپٹے چلنے کے باوجود ان کے جسموں نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ سا دھو ان کی حالت دیکھ کر زمین سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر ایک منتر پڑھ کر سامنے نظر آنے والی دیوار پر پھونک دیا۔ منتر ختم ہوتے ہی سامنے والی دیوار ایک سرسراہٹ سے یوں سائیں میں گھس گئی جیسے کسی نے اپنے ہاتھ سے اس دیوار کی دوسری طرف دھکیل دیا ہو۔

دیوار سرکتے ہی سامنے ایک جنگ سی راہداری نظر آ رہی تھی جس میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اس کے چھت سے لٹکتے بڑے بڑے جالے جن میں بھنسی ہوئی بڑے سائز کی میزیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ راہداری کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے جگہ جگہ کھدے بنے ہوئے تھے۔ دیوار میں راستہ نمودار ہوتے ہی سا دھو نے ایک ایک کر کے سب کو اپنے کندھے پر اٹھا کر راہداری سے گزرتے ہوئے ایک اور تہ خانے کی میز حیاں اتر کر اس کے فرش پر لٹا دیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اس ویران مندر میں تہ خانوں کا جال بچھا ہو۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ تقریباً ایسے دور دراز مندروں میں ایسے تہ خانے خاص طور پر بنوائے جاتے تھے تاکہ وہاں کے سا دھو یا پجاری اپنے مذہم مقاصد کو دنیا کی نظروں سے چھپا سکیں۔ اور اس طرح مندروں کی آڑ میں ان کی عیاشیاں بھی کھل کر دنیا والوں کے سامنے نہ آسکیں۔ لیکن یہ سب کچھ وہ لوگ کرتے تھے جنہوں نے دنیا والوں کے سامنے جعلی سا دھو اور پجاریوں کا روپ دھار رکھا ہو لیکن حقیقت میں جو اصل سا دھو یا پجاری ہیں وہ ایسا کام کرنے کا بھی سوچ بھی نہیں سکتے کیونکہ وہ لوگ بھی اپنے عقیدے کا احترام کرتے ہیں اور اپنے مذہب کے سچے پیروکار ہوتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے عیاش سا دھوؤں یا

پجاریوں کے ہمیں میں جیسے شیطان کے چیلو نے ان کے عقیدے اور مذہب کو بدنام کیا ہوا تھا۔ ان سب کو تہ خانے کے فرش پر سیٹھ کی بور یوں کے طرح پٹک کر اس نے ایک کونے میں پڑے رسیوں کے ڈھیر میں سے کچھ رسیاں اٹھا کر ان لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے۔

☆.....☆.....☆

رشید نے دوکان بند کی اور اپنا تھملا ہاتھ میں تھامے گھر کی راہ لی۔ راستے سے اس نے اپنی ماں اور بیوی کے لئے تھوڑا پھل خریدا اور اسے تھیلے میں ڈال کر گھر کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ گھر کی دہلیز پر پہنچ گیا پھر جیسے ہی اس نے کڑی کھٹکھٹانے کے لئے ہاتھ اٹھایا کہ یکدم درد وازہ یوں کھل گیا جیسے کسی کو اس کے آنے کا پہلے سے ہی انتظار ہو لیکن یہ سب اچانک اتفاق تھا کیوں کہ جیسے ہی اس نے ہاتھ اٹھایا تھا اسی وقت اس کی ماں نے اچانک درد وازہ کھول دیا تھا۔

رشید کی بیوی کی اچانک طبیعت بگڑ گئی تھی اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا تھا اور کافی دیر سے یوں ہی چیخ چلا رہی تھی لیکن درد تھا کہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ رشید کی ماں کافی دیر تک تو اسے یوں ترپتا دیکھتی رہی اس کی اس حالت سے وہ سمجھ گئی تھی کہ شاہ بابا کے دیئے ہوئے تعویذ نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے یہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔

لیکن جب اس کی تکلیف ناقابل برداشت دیکھنے لگی تو اس نے بھی غمرا کر گھاس کے حکیم کو بلائے کا ارادہ کیا اور یہ وہی تھا جو جب وہ اسے بلائے کے لئے باہر نکلنے لگی تھی اور اسی وقت اسے کے بیٹے نے کھر کا درد وازہ بجانے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا تھا۔ ماں کو درد وازہ میں یوں پریشان دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا پھر اس کے پوچھنے پر اس نے اس کی

بیوی کی تکلیف کے متعلق بتایا۔

رشید یہ سن کر جلدی سے گھر کے اندر داخل ہوا اور ہاتھ میں پکڑا تھملا اپنی ماں کے ہاتھ میں پکڑا کر بیوی کے پاس کمرے میں پہنچا اس کی حالت واضح بہت خراب لگ رہی تھی اس نے اس کو دلہندہ دیتے ہوئے اپنی ماں کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر دوبارہ گھر سے باہر نکل گیا وہ جلد از جلد حکیم کے پاس پہنچنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کی بیوی کو درد وغیرہ دے سکے تاکہ اس کی تکلیف کم ہو سکے۔ اس کا ترپنا اس سے بھی نہیں دیکھا گیا تھا وہ یوں ترپ رہی تھی جیسے کوئی تیز دھار آئے سے اس کے پیٹ کے اندر دھاتی اعضا کو کاٹ رہا ہو۔ بے پناہ تکلیف کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سرخ سے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

حکیم کا مطلب کاؤں کی ٹکڑ پر ہی تھا اور زیادہ آبادی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مطلب میں زیادہ رش نہیں چھٹی ہوتا تھا اس کا دکا افروہی نظر آتے تھے اس لئے رشید کے وہاں پہنچنے ہی اور اس کے بتانے پر حکیم نے جلدی سے مرتبوں سے کچھ سفوف نکال کر ان کی پڑیاں بنائیں اور جلدی سے رشید کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی رشید کی ماں اس وقت اپنی بہو کے کمرے میں ہی تھی جو مسلسل تکلیف کی شدت سے ترپ رہی تھی اور اب تو اس کی تکلیف میں اور اضافہ ہو گیا تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر حکیم نے جلدی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے تھیلے سے ایک پڑیا نکالی اور پانی لانے کا کہہ کر سفوف اس کے منہ میں اٹھیل دیا اتنی دیر میں رشید کی ماں پانی کا گلاس لے آئی تھی حکیم نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس میں سے دو گھونٹ رشید کی بیوی کے منہ میں اٹھیل دیئے۔

دوا منہ میں جاتے ہی اس کی تکلیف میں کچھ فاقہ ہوتا محسوس ہوا اور اس کے چلانے میں بھی کچھ کمی آ گئی۔ یہ دیکھ کر حکیم نے تھیلے سے مزید تین پڑیاں اور نکال کر رشید کے ہاتھ میں تھما دیں اور اسے کچھ ہدایات دیتے ہوئے واپسی کے لئے مڑا۔ رشید اس کا تھملا ہاتھ میں تھامے اس

کے ساتھ ہی کرے سے باہر نکل گیا۔

یہ رات کے تقریباً دس بجے کا وقت ہوگا۔ پورا چاند کی رات تھی جس کی وجہ سے زمین پر چاروں طرف دو دریا روشنی بھیلی ہوئی تھی ہر چیز اس کی سفید روشنی میں یوں نظر آ رہی تھی جیسے قدرت نے کسی بردش سے اس پر سفیدی پھیر دی ہو۔ آسمان صاف و شفاف ہونے کی وجہ سے اس پر چمکتے ستارے بہت بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ ششٹی ششٹی اور دل لہا دینے والی ہوا چل رہی تھی جس کی سربراہی سے درختوں کے پتوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔

جہازوں میں دیکے چھوٹے سونے جانور اپنی منمنی منمنی سرخ آنکھوں سے اس عفریت کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے جو زمین پر چلنے کی بجائے اڑنے کے انداز میں چل رہی تھی۔ یہ وہی انسانی بیڑیا تھا جو اسی طرح کی راتوں میں اپنے آقا کے حکم کے مطابق اس کے لئے ایک انسانی بچے کی سمیٹ کی تلاش میں نکلتا تھا۔ اس کا جسم سیاہ بالوں نے پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا اور اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا۔

جیسے آج کی رات وہ ضرور کوئی ایسی سمیٹ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس کو دیکھ کر اس کا آقا اس سے خوش ہو جائے۔ اس کا رخ اس انسانی آبادی کی طرف تھا جس طرف یہ راستہ جا رہا تھا۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے اسے چلتے ہوئے کوئی انسانی آنکھ دیکھنے سے قاصر تھی۔ کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو رات کے اس پہر چہل قدمی کے لئے گھر سے باہر نکلے کی غلطی کرے گا۔ آبادی لگ بھگ تقریباً نصف میل کے قریب رہی ہوگی جس طرف وہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ آبادی تقریباً سو گھروں پر مشتمل تھی۔ اس وقت وہاں کے رہائشی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے وہاں کے آوارہ کتے زور سے بھونکنے میں مصروف تھے۔

وہ عفریت اس آبادی کے نزدیک پہنچ کر رک گیا وہ ادھر ادھر نظر میں دوڑا کر آبادی میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کر رہا تھا جہاں سے داخل ہو کر وہ اپنے شکار کو تلاش کر سکے۔ رات کے اس پہر اگر کوئی ذی روح اس کو اس

وقت دیکھ لیتا تو شاید وہ ہشت کے مارے مری جاتا۔ کبھی کبھار دور کہیں سے گیدڑوں کی آوازیں بھی سنائی دے جاتیں جو اس وحشت زدہ ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہی تھیں۔ آبادی کے اندر جانے والی تین گلیاں تھیں جو دائیں بائیں اور ناک کی سیدھ میں جاری تھیں۔

وہ عفریت دائیں طرف جانے والی ایک پتلی سی گلی میں داخل ہونے کے لئے مڑا۔ ابھی اس نے دو تین قدم ہی اٹھائے ہوئے گئے کہ کہیں سے تین چار کتے بھونکنے ہوئے اس کے نزدیک پہنچ کر رک گئے اور زور زور سے بھونکنے لگے ایسا صرف چند گھنٹوں کے لئے ہوا پھر اس عفریت کی ایک خوفناک غراہٹ سننے ہی دم دبا کر واپس بھاگ گئے۔ ان کے بھاگنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے اگر انہیں وہاں کھڑے ایک لکڑی اور لگا تو وہ اس خوفناک عفریت کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ خوفناک بلا ان کو واپس بھاگتے دیکھ کر دوبارہ گلی کے اندر گھس گئی۔

گلی میں تقریباً اندھیرا چھایا ہوا تھا اور دور دور تک کوئی انسان تو کیا کوئی کتا تک نظر نہیں آ رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ کتے اس کے خوف سے کہیں بہت دور بھاگ گئے تھے گلی میں موجود ایک بجلی کے سمبے پر لگا کم پاور کا بلب بے شکل اندھیرا کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ عفریت اپنے بھاری قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی چلنے کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ کسی چرخی کی مانند چاروں طرف گھوم رہا تھا جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔ بڑی حیرت کی بات تھی کہ اس کا سر چاروں طرف یوں گھوم رہا تھا جیسے وہ پلاسٹک کا بنا ہوا۔ اس میں کوئی بڑی نام کی چیز نہ ہو۔ اس آبادی کا نام فتح پور تھا جس میں تقریباً سو گھر تھے جن کے زیادہ تر مرد حضرات روزگار کے سلسلے میں شہر میں جا کر اپنی محنت مزدوری سے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔

بچنے میں ایک بار اپنے گھروں کا پتھر لگاتے اور اس کے ساتھ ہی اپنے گھر کے افراد کو ان کی ضرورت کی چیزیں جو وہ شہر سے اپنے ساتھ لائے دے جاتے اور اس کے ساتھ ہی ان کو ہفتہ بھر کا خرچ بھی دے جاتے۔ اس طرح انہی خوشی یہ سب اپنا وقت گزار رہے تھے۔ آبادی میں ایک

گورنمنٹ کا ایک چھوٹا سا اسکول بھی تھا جہاں بہت سے چھوٹے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اسکول کا ماسٹر ایک بی اے پاس بوڑھا شخص تھا جس کا نام تھریڈن تھا وہ ایک پرائمری اسکول میں تھے جو اپنی مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہو چکا تھا اور اب گورنمنٹ سے پینشن لے کر اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ پالتا تھا۔

قدرت نے اسے کوئی اولاد نہیں دی تھی اس لئے جو پینشن اسے ملتی تھی وہ ان دونوں کی ضرورت کے لئے بہت تھی اس لئے اس نے بغیر تنخواہ کے اس اسکول میں کچھ وقت کے لیے اپنی خدمات مہیا کر دی تھیں جس کا وہ حکومت سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا۔ اس کے اس جذبے کو دیکھتے ہوئے حکومت کے کچھ کارندوں نے اسے اس کی اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنا کچھ وقت اس اسکول کو دے سکے۔

فتح پور کے رہائشی ماسٹر تھریڈن کی بہت عزت کرتے تھے جو ان کے بچوں کو بڑے پیار سے تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ بہت سے گھروں کے افراد اپنے گھروں سے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی اشیاء بھی کبھی کبھار ماسٹر تھریڈن کے گھر بھیج دیا کرتے تھے اور اس طرح ان دونوں میاں بیوی کو اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں شریک کیا کرتے تھے۔ ماسٹر تھریڈن ان کی اس مہربانیوں کا دل سے اعتراف کرتا تھا اور ان کے بچوں کو بڑے پیار سے اور شفقت سے پڑھاتا تھا۔ بچے بھی اسے بہت چاہتے تھے اور اس کا کہنا سناتے تھے۔ فتح پور کا ریلوے اسٹیشن وہاں سے تقریباً دو میل کی مسافت پر تھا لیکن جب بھی کوئی ٹرین اپنی پوری رفتار سے وہاں سے گزرتی تو فتح پور میں اس کی گونج ضرور سنائی دیتی۔ مسافر ٹرین بہت کم رکتی تھیں صرف تین بویگن پر مشتمل ایک پانچ ٹرین دن میں دو بار وہاں سے گزرتی تھی اور وہی فتح پور کے باسیوں کا واحد سہارا تھی جو اس پر سفر کر کے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شہر جاتے تھے اور پھر اپنی پرواہیں آتے تھے۔

ٹرین صبح سویرے شہر کی طرف روانہ ہوتی اور پھر شام کو مغرب کے وقت دوبارہ فتح پور کے اسٹیشن پر پہنچتی اور مسافروں کو وہاں اتار کر آگے بڑھ جاتی پھر دوسرے روز اپنی

منزل سے روانہ ہو کر یہاں سے مسافروں کو لے کر شہر چلی جاتی۔ فتح پور کے زیادہ تر رہائشی اسی ٹرین پر سفر کرتا پسند کرتے کیوں کہ اس کا کرایہ بہت کم ہوتا تھا۔ شہر کی طرف دو بیس بیس چلتی تھیں لیکن ان کا کرایہ بھی بہت تھا اور اس میں رش بھی بہت زیادہ ہوتا تھا کیونکہ وہ بیس آبادی کے اندر سے روانہ ہوتی تھیں لیکن ٹرین میں سفر کرنے کے لئے لوگوں کو ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہوتا تھا اور اس کے لئے دو میل کی مسافت الگ ملے کر پڑنی تھی۔

لیکن اتنی تکلیف اٹھانے کا ان کو یہ فائدہ ضرور ہوتا تھا کہ ان کے پیسے بچ جاتے تھے اور خوشی خوشی ٹرین میں کم کرایہ دے کر شہر جا کر اپنی شاہنگ کرتے تھے۔

قیوم صبح سویرے اٹھا اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور اپنے چھوٹے بیٹے زاہد کو تیار کرنے کا کہہ کر خود گھر سے باہر نکل گیا۔ آج اس نے اپنے بیٹے زاہد کو شہر لے جا کر اس کے لئے اسکول کی نئی یونیفارم خریدی تھی اور ٹاپ وغیرہ کے لئے اس کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ خود گھر سے باہر اس لئے نکل گیا تھا کہ رات کو اس کے ایک دوست نے اسے تاکہ کی تھی کہ جب وہ شہر جائے تو واپسی میں اس کا بھی ایک کام کرتا آئے ورنہ اس کام کے لئے اسے خود شہر جانا پڑتا۔ گاؤں کے لوگوں میں چونکہ آپس میں محبت اور پیار بہت ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے کام کو اپنا کام ہی سمجھتے ہیں اس لئے انہیں ایک دوسرے کے کام آ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے قیوم شہر جانے سے پہلے اس دوست سے مل کر اس کے کام کی نوعیت کا پوچھنے گھر سے نکلا تھا اور ساتھ ہی اپنی بیوی کو تاکہ کر گیا کہ اس کی واپسی تک وہ زاہد کو اچھی طرح ناشتہ وغیرہ کروا کر اور نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنا کر تیار کر دے۔

جس دوست کے پاس وہ گیا تھا وہ گاؤں میں ایک درزی خیر تھا جس کی اچھی اور صاف ستھری سلائی وہاں کے لوگ بہت پسند کرتے تھے۔ رات دیر تک اپنی چھوٹی سی دوکان میں لوگوں سے لئے گئے کپڑے سلائی کرتا رہتا تھا۔ سادہ سلائی تو وہ خود ہی کر لیتا تھا لیکن جب کوئی ایسا

سوٹ آجاتا جس پر کوئی کڑھائی کا کام ہوتا تو اس کے لئے اسے شہر جانا پڑتا اور اس کے لئے وہ مالک سے کم از کم ایک ہفتہ ضرور لیتا تھا تا کہ اس دوران وہ سلائی کے کیڑے کھائے تاکہ کڑھائی کا کام بھی مکمل کروا سکے ایسے کام کی اسے حدودی بھی بہت اچھی مل جاتی تھی اور مالک بھی کام کو دیکھ کر اسے داد دینے بنا نہیں رہ سکتے تھے۔

گزشتہ چار پانچ دنوں سے اس کی طبیعت ناساز تھی جس کی وجہ سے وہ سلائی بھی بہت کم کر رہا تھا لیکن جو کام اس نے پہلے لے رکھا تھا اس کو واپس کرنے میں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اگر صرف سادہ سلائی ہی ہوتی تو شاید وہ جیسے ہیے کر کے کام مکمل کر کے واپس کر چکا ہوتا لیکن کچھ سوٹ ایسے بھی تھے جن پر کچھ ڈیزائننگ اور کڑھائی وغیرہ کا بھی کام تھا اس لئے طبیعت کی ناسازگی کی وجہ سے اسے شہر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

رات اتفاق سے قیوم سے باتوں میں جب اسے پتہ چلا کہ وہ صبح اپنے بیٹے زاہد کو اسکول کی یونیفارم دلانے کے لئے شہر جا رہا ہے تو اسے یکدم یہ خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اپنے وہ سوٹ جو صرف کڑھائی وغیرہ کے لیے بڑے ہوئے ہیں وہ قیوم کے ہاتھ شہر کے اس دوکاندار کے پاس بھیج دے جہاں سے وہ کڑھائی وغیرہ کرواتا تھا۔ اسی لئے اس نے قیوم سے درخواست کی تھی کہ جب وہ صبح شہر کے لئے نکلے تو اس سے ملتا ہوا جائے تاکہ وہ اسے کام سمجھانے کے ساتھ ساتھ سوٹ بھی دے سکے۔ قیوم اسی سلسلے میں اس وقت اس کے پاس بیٹھا کہ بھڑ ہاتھ تھا۔ خیر درزی اسے تمام سوٹ دے کر کہنے لگا۔ "قیوم بھائی یہ چار سوٹ ہیں ان میں سے تین سوٹ تو آپ وہاں ہی چھوڑ آئیے گا کیونکہ ان میں کڑھائی اور ڈیزائننگ کا زیادہ کام ہے لیکن یہ کالا سوٹ اس پر صرف تھوڑی سی کڑھائی کا کام ہے اگر آپ ساتھ ہی لے آئیں گے تو بہت اچھا ہو جائے گا اس کے لئے میری طرف سے اس دوکاندار کو بہت تاکید کروں گا تاکہ اس سوٹ کو میں اس کے مالک کو دے سکوں یہ سوٹ لئے مجھے بہت دن ہو گئے ہیں اس لئے اس سے پہلے کہ اس کا مالک مجھ پر ناراض ہو میں اس کی ناراضگی سے پہلے ہی اس کا یہ کام مکمل

کر کے اسے دے دینا چاہتا ہوں۔" خیر نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر قیوم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سوٹ والا اشارہ پکڑا اور پھر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہاں سے واپس گھر کی طرف چل دیا۔ گھر میں زاہد تیار ہوا اس کا ہی انتظار کر رہا تھا اس سارے کام میں چونکہ دیر ہو چکی تھی اور زین کا وقت بھی گزر گیا تھا اس لئے اب شہر جانے کے لئے ان کے پاس صرف بس سے سفر کرنے لازمی ہو گیا تھا اس نے زاہد کا ہاتھ پکڑا اور بیوی کو خدا حافظ کہتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ بس اسٹاپ وہاں سے تھوڑی ہی دور ایک برگلہ کے ایک بڑے سے درخت کے نیچے بنا ہوا تھا جس کے آس پاس چند ٹھیلے بھی موجود تھے جن پر برسی فروٹ اور گنے کا جوس بیچنے والوں نے اپنا دھندا شروع کیا ہوا تھا۔

گاؤں کے نمبر وار نے بس کے مسافروں کے بیٹھنے کے لئے وہاں چند بیچ کر کھول دیے تھے جن پر عورتیں اور بچے بس کا انتظار کرنے کے لئے بیٹھ جاتے تھے۔ گاؤں کی دو ٹیمیں اپنے مقررہ وقت پر نمودار ہوتی تھیں اور پھر مسافروں کو کچھ بیچ کر شہر کی جانب فرار لے جاتی یہ جاہد جا ہوجاتیں۔

عورتوں اور بچوں کو کوشش کی جاتی کہ بس میں سیٹ دی جائے اس کے لئے وہاں کے نوجوان اور دیگر مسافر بہت تعاون کرتے تھے اور خود ہی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر انہیں جگہ دے دیتے۔ اس کی نسبت شہروں میں یہ خاص بہت کم ہوتا ہے کہ لوگ ایسے موقعوں پر عورتوں اور بچوں کو اپنی جگہ دیں لیکن ترقی یافتہ ملکوں میں ایسے موقعوں پر عورتوں، بچوں اور بزرگوں کو بہت عزت دی جاتی ہے اور ممکن طریقے سے ان کے آرام و احترام کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ملک بہت جلدی سے ترقی کرتے ہیں کیونکہ ایسے لوگوں کو دعا نہیں بھی تو پھر ڈیروں ملتی ہیں جس کی وجہ سے اس کا پھل بھی کھاتے ہیں۔

تقریباً بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد دور سے ایک کٹھارسی بس آتی نظر آئی اس کے پیچھے دھوئیں کا ایک

طوفان تھا جس رنگ سیاہ تھا دھوئیں کا رنگ ہنار ہا تھا کہ تجا نے کب سے اس میں کھلیا معیار کا بڑیل اور ٹیل استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہاں تو لوگوں کو ایسے مسائل سے آگاہی کم ہی ہوتی ہے اس لئے وہ اس پر غور کرنے کی بجائے صرف اس بات پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں کہ بس میں زیادہ رش تو نہیں ہے کیا انہیں سیٹ مل جائے گی یا بس میں کھڑے ہو کر شہر تک کا سفر کرنا پڑے گا۔ بس پر نظر پڑتے ہی بس اسٹاپ پر کھلی سی ٹی گئی اس وقت وہاں تقریباً دس بارہ مسافر ہی تھے جن میں چھ عورتیں اور تین بچے، ایک نوجوان اور دو بوڑھے شامل تھے ہر کسی کی کوشش تھی کہ بس میں پہلے سوار ہو کر اپنے لئے جگہ لے سکے۔ بس کی دیوکی مانتہ چٹھاڑتی ہوئی بس اسٹاپ کی طرف ہی فرار لے بھرتی آ رہی تھی اور پھر چند منٹوں میں ان کے نزدیک آ کر رک گئی۔

بس میں پہلے سے بہت سے افراد سوار تھے اور تقریباً تمام سیٹوں پر لوگ براجوان تھے۔ بس کے رکتے ہی وہ سب اس کی طرف لپکے اور قیوم نے بھی جلدی سے زاہد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پہلے اسے بس میں سوار کروانے کے لئے آگے بڑھا جس کا دروازہ لوگوں سے تقریباً بند ہی ہو گیا تھا لیکن پھر اس کے پیچھے سے دیکھتے سے کچھ لوگ بس کے اندر چلے گئے جس سے دروازے میں داخل ہونے کے لئے کچھ جگہ بن گئی۔

قیوم نے جلدی سے زاہد کو اٹھا کر بس کے اندر وکیل دیا اور پھر خود بھی اچھل کر اس کے دروازے سے ہوتا ہوا بس کے اندر گھس گیا۔ بس میں کافی لوگ کھڑے تھے اور کافی شور بھی ہو رہا تھا۔ بس کا کنڈیکٹر لوگوں کو خاموش رہنے اور بس کے پچھلے حصے کی طرف جانے کا کہہ رہا تھا لیکن کوئی مسافر بھی اس کی بات پر کان نہیں دھ رہا تھا۔

لیکن پھر قیوم کے کہنے پر کچھ لوگ ذرا پیچھے کی طرف ہوئے تو بس میں کچھ جگہ بن گئی۔ یہ دیکھ کر بس میں کھڑے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا اور قیوم کا شکریہ بھی ادا کیا تمام مسافروں کے بس میں سوار ہوتے ہی بس ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور شہر جانے والے راستے پر دوڑتی چلی گئی۔ کرائے وغیرہ سے فارغ ہو کر قیوم نے زاہد کو اپنے

ساتھ ہی کھڑا کیا ہوا تھا۔ زاہد کی عمر تقریباً سات آٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور وہ گاؤں کے اسکول میں دوسری کلاس کا طالب علم تھا۔ نیا سال شروع ہونے کی وجہ سے اسکول کی نئی یونیفارم خریدنے کے لئے وہ اس وقت شہر جانے کے لئے بس میں سوار تھا۔ شہر کا فاصلہ گاؤں سے لگ بھگ سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لئے چالیس منٹ لگ جاتے تھے کیونکہ بس کٹھارہ ہونے کیساتھ کچھ جگہ جگہ رکتی بھی تھی اس لئے زیادہ دیر لگتی تھی۔

بس اپنا مقررہ فاصلہ طے کر کے شہر کی حدود میں داخل ہو گئی اور پھر شہر کے ایک چوراہے میں بس کے رکتے ہیں قیوم زاہد کا ہاتھ تھامے اور کپڑوں والا اشارہ ہاتھ میں پکڑے۔ بس سے اتر گیا۔ قیوم دین کے سمجھانے کے مطابق اس دوکاندار کی دوکان چوراہے سے زیادہ دور نہیں تھی اس لئے وہ لوگوں سے پوچھا ہوا اس دوکان پر پہنچ گیا۔

دوکان کے مالک کو قیوم دین کا نام بتانے پر اس نے کپڑوں والا اشارہ اس کے حوالے کر دیا اور ساتھ اس کا لے سوٹ کے متعلق جو کچھ قیوم دین نے اسے تاکید کی تھی اس کا بھی کھدیا۔ دوکاندار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے کہا کہ اگر اسے شہر میں کوئی اور کام ہے تو وہ کر کے آجائے آتی دیر میں وہ اس سوٹ والے کام کو مکمل کر لے گا۔

قیوم یہ سنتے ہی زاہد کو لے کر اس دوکان کی طرف چل دیا جہاں اسکول کی یونیفارم دستیاب تھیں۔ اس دوکان کا پتہ اسے کے ایک دوست نے ہی اسے بتایا تھا جو خود اپنے بیٹے کے لئے اسی دوکان سے اس کے لئے یونیفارم لے کر گیا تھا۔

دوکان ڈھونڈنے میں اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی اور کچھ ہی دیر میں وہ اس دوکان کے اندر موجود تھا۔ دوکان میں مختلف قسم کی یونیفارم لگی ہوئی تھیں اس نے زاہد کے ٹاپ کی ایک یونیفارم جو قدرے زیادہ ہنگامی بھی نہیں پسندی۔ دوکاندار کو اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد اس نے یونیفارم والا اشارہ ہاتھ میں پکڑا اور زاہد کو لے کر دوکان سے باہر نکل آیا۔ زاہد کو وہ چونکہ بہت عرصہ بدشہر لایا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ بیشی دیر میں وہ کڑھائی والا سوٹ تیار ہوگا اتنی

دیر میں وہ اسے تھوڑا شہری گھملا لے۔ یہ سوچ کر وہ اسے لئے ایک پارک میں چلا گیا جہاں بچوں کی تفریح کے لئے بہت سے جھولے اور سٹال لگے ہوئے تھے اس نے زہد کو اس کی پسند کے جھولوں میں بیٹھا اور اس کو خوش ہوتا دیکھ کر خود بھی خوشی کا اظہار کرتا رہا۔ چند ایک سٹال سے اس نے اسے کھانے پینے کی چیزیں بھی دلا لیں۔ اور کچھ چیزیں اپنی بیوی کے لئے بھی خریدیں تاکہ وہ اپنی بیوی سے اسے دے سکے۔ زہد اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ ان دونوں کی آنکھ کا تارا تھا وہ دونوں اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

کافی دیر تک گھومنے پھرنے کے بعد وہ دونوں واپس اس دوکان پر آئے جہاں سے وہ سوٹ لیتا تھا لیکن دوکان پر پہنچ کر انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کے دوکان سے نکلنے ہی بجلی جانے کی وجہ سے سوٹ جوں کا توں رکھا رہا ہے اور اب چونکہ بجلی کے آنے میں مزید چند روز کا وقفہ ہے تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ سہ پہر کے ساڑھے تین بج چکے تھے اور شہر سے گاؤں جانے کے لئے آخری بس شام پانچ بجے چلی جاتی تھی اور ٹرین شام چوبیس بجے نکلتی تھی اس وقت بھی ان کے پاس صرف دو یا تین ٹکٹے ہی تھے جس میں وہ یا تو بس پکڑ سکتے تھے یا ٹرین کے ڈر لے اپنے گاؤں جاسکتے تھے ورنہ دوسری صورت میں ان کو رات شہر میں ہی کرنا پڑتا اور یہ بات ان کو گوارا نہیں تھی کیونکہ زہد نے سچ اسکل جاتا تھا اور اس کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا کہ اپنے گھر اطلاع کر سکیں یہ سوچ کر وہ پریشان بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے کانوں میں دوکاندار کی آواز پڑی جو اسے بتا رہا تھا کہ اگر بجلی کے آگے ہی وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کو کڑھائی والا کام مکمل کر کے دے گا اس لئے زیادہ مگرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سن کر قیوم کو کچھ حوصلہ ہوا اور پھر بے چینی سے بجلی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

شہروں میں چونکہ بجلی کے آنے جانے کا ٹائم ٹیبل مقرر ہوتا ہے اس لئے بجلی اپنے مقررہ وقت کے مطابق آگئی اور اس کے ساتھ ہی دوکاندار نے اپنا کام شروع کر دیا۔ دوکان میں رش نہ ہونے کی وجہ سے اس نے جلدی سے اس کام کی ہی شروع کر دیا تھا تاکہ وہ جلد از جلد اپنے

گاؤں جانے والی بس یا ٹرین کو پکڑ سکے۔ بڑی کوشش کے باوجود اسے کڑھائی والا کام مکمل کرنے میں ہونے دو گھنٹے لگ ہی گئے۔ لیکن اس سارے کام کی وجہ سے بس گاؤں کے لئے روانہ ہو چکی تھی اس لئے اب ان کے پاس سوائے ٹرین سے سفر کرنے کے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ یہ سوچ کر اس نے سوٹ والا شاپر اٹھایا اور پیسوں کی رسید جیب میں ڈالتے ہوئے زہد کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ریلوے اسٹیشن جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھا دیئے جو زیادہ دور نہ تھا۔ اسٹیشن پر آکا دکا مسافر ہی بیٹھے ہوئے تھے جو شام چھ بجے والی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔

خوش سے دیکھنے میں قیوم کو ان میں کوئی بھی اپنے گاؤں کا مسافر نظر نہیں آیا جو اس کی جان پہچان کا ہو۔ غالباً وہاں جو مسافر نظر آ رہے تھے یا تو وہ خود کی کوئی آئے تھے یا کسی اور شہر کے تھے۔ قیوم زہد کا ہاتھ تھامے ایک کونے میں رکھے بیچ کی طرف بڑھا اور زہد کو وہاں بٹھا کر خود ایک سٹال والے سے پوچھنے لگا کہ فتح پور والی ٹرین کس وقت پہنچ رہی ہے پھر اس سٹال والے کے کہنے کے مطابق کہ ٹرین چوبیس بجے ہی روانہ ہوگی وہ مطمئن ہو کر زہد کے ساتھ ہی بیچ پر بیٹھ گیا۔ شام کا اندھیرا بھیلنے لگا تھا اور سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف ڈوبتا جا رہا تھا۔

اندھیرا بھیلنے کی وجہ سے قیوم کو بھی فکر ہو رہی تھی کیونکہ اسٹیشن سے گاؤں کا فاصلہ دو کلومیٹر ہونے کی وجہ سے اسے باقی کا راستہ پیدل ہی طے کرنا تھا اور وہ بھی سوچ سوچ کر اسے فکر کھائے جاری تھی کہ وہ یہ فیصلہ رات کے اندھیرے میں کیسے طے کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کی تسلی تھی کہ اس کے گاؤں کی طرف جانے والا یہ راستہ محفوظ راستہ ہے سوائے وہاں کے توں کے علاوہ کبھی بھی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لئے وہ اس بات سے تقریباً مطمئن تھا۔

زہد کو اس نے مونک پھلی کا ایک ٹکٹ لے دیا تھا جسے وہ خاموشی سے کھانے میں مصروف تھا۔ خود اس نے چائے کی طلب ہونے پر ایک کپ چائے وہاں موجود ایک ٹی سٹال سے لے لیا تھا اور اس وقت اسے پینے میں مصروف

تھا۔ ٹھیک شام کے چھ بجے ٹرین کی وصل سنائی دی اور دور سے ٹرین آتی دکھائی دی۔ قیوم نے جلدی سے چائے کا کپ واپس کیا اور زہد کا ہاتھ تھامے ٹرین کے پلیٹ فارم پر پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین آہستہ آہستہ پلٹ کر پلیٹ فارم پر برگشتی ٹرین میں زیادہ رش نہیں تھا قیوم کٹ پھلے ہی خرید چکا تھا جو اس وقت اس کی جیب میں محفوظ تھے۔ قیوم زہد کا ہاتھ پکڑے جلدی سے اپنے سامنے رکے والی ٹرین کے ڈبے میں سوار ہو گیا ڈبے میں چند روزہ مسافر سوار تھے اور انہیں بیٹھنے میں کوئی دقت نہیں آئی۔ ٹرین دس منٹ تک رک کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔

ٹرین کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی یوں لگتا تھا جیسے کوئی زبردستی اسے آگے دھکیل رہا ہو۔ پھر ٹرینوں کی رفتار تقریباً ایسی ہی ہوتی ہے اس لئے وہ بے بسی سے اسے آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ شہر اور فتح پور گاؤں کے درمیان تقریباً تین دیہات اور بھی تھے جن کے چھوٹے اسٹیشنوں پر بھی ٹرین نے رکتا تھا اس لئے اس کی رفتار نہ ہونے کی برابری تھی۔ دو اسٹیشنوں کو کراس کرنے کے بعد ٹرین تیسرے اسٹیشن کی جانب بڑھ رہی تھی۔

اچانک بربیک لگنے سے ایک جھٹکے سے قیوم بے خیالی میں سیٹ سے پیچھے گرتے گرتے بھا اور اس اچانک جھٹکا لگنے سے اس نے ساتھ ہی زہد کو بھی سنبھالا جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرین رک چکی تھی اور سب مسافر اپنی سیٹوں پر بیٹھے کھڑکیوں سے باہر رات کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے لیکن باہر گھپ اندھیرا ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

غالباً ٹرین کسی جنگل یا ویرانے میں کھڑی ہوئی تھی اور کیوں کھڑی ہوئی تھی اس کے جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ قیوم کچھ بربیک بیٹھا انتظار کرتا رہا پھر کھڑکی کا شیشہ اوپر اٹھا کر باہر جھانکے لگا۔ اس نے جیسے ہی سر باہر نکالا اس کی کھڑکی کے نیچے سے گاڑی کا گارڈ گزرتا نظر آیا اس نے جلدی سے سلام کر کے اس گاڑی سے کھڑکی کے کٹنے کا سبب

پوچھا تو گارڈ نے بتایا کہ سامنے سے ایک بڑی ٹرین آرہی ہے جسے کراس دینے کے لئے گاڑی رکی ہے۔ اور اس کے گزرنے کے بعد ہی ٹرین دوبارہ روانہ ہوگی۔ یہ سن کر اس نے اپنا سر اندر کر لیا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد دور سے کسی ٹرین کی وصل سنائی دی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ایک ٹرین طوفان کی طرح نمودار ہوئی اور فرارے بھرتی ان کی ٹرین کے نزدیک سے گزری۔

ٹرین کی تقریباً اٹھارہ کے لگ بھگ یوگیاں ہوئیں جو شور مچاتی ان کے نزدیک سے گزرتی جا رہی تھیں۔ اس ٹرین گزرنے کے دس منٹ بعد ان کی ٹرین نے وصل دی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی اس سارے کام میں رات کے آٹھ بج چکے تھے اور چار سو رات کا گھپ اندھیرا بھیل گیا تھا۔ قیوم رو کر یہ فکر متانے جا رہی تھی کہ جتنی دیر اسے گاؤں کے اسٹیشن پر پہنچنے لگے گی اتنی ہی پریشانی اپنے گھر تک پہنچنے میں اٹھانی پڑے گی۔ لیکن وہ بے بس تھا کیا کر سکتا تھا اس لئے بے بسی سے گاڑی کے منزل پر پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر آخری اسٹیشن پر پہنچ کر ٹرین اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی اور رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔

جب قیوم زہد کا ہاتھ پکڑے ریلوے اسٹیشن پر اترا۔ ریلوے اسٹیشن پر چونکہ روشنی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا صرف کہیں کہیں پلیٹ فارم پر موجود چند اسٹینڈ برائلیٹس لٹکا کر ان میں روشنی کی کئی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے آفس میں گھسائی کرسی پر اٹھ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر یہ دیکھنے کی بھی تکلیف نہیں کی تھی کہ کوئی گاڑی آن کر رہی ہے اور کوئی روانہ ہوئی ہے۔ عجیب طرح کا رویہ تھا اس اسٹیشن ماسٹر کا۔ اس وقت وہ دونوں مسافر ہی وہاں اتراے تھے۔ کوئی اور بندہ بشر وہاں موجود نہیں تھا۔ قیوم نے زہد کا ہاتھ پکڑا اور اسے لئے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔

پورے چاند کی رات تھی چاند کی دودھیا روشنی چاروں طرف بھیلی ہوئی تھی ہر چیز قدرت کی اس اسمول نعمت سے گھر کر سامنے آگئی تھی۔ چاند کی روشنی میں گاؤں کی طرف جانے والا راستہ صاف نظر آ رہا تھا راستے کے دونوں طرف

کھیت تھے جن میں کئی فصلیں ہوا سے لہلاقی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

قیوم نے راستے سے ایک درخت کی موٹی سی شاخ توڑ کر ہاتھ میں لے لی تھی تاکہ بوقت ضرورت کسی جنگلی جانور سے بچا جاسکے آسمان پر چمکتے ستارے بہت بھلے لگ رہے تھے۔

وہ دوڑوں چلتے ہوئے اور باتیں کرتے گاؤں کے راستے پر بڑے جارہے تھے۔ دور کہیں سے گیدڑوں اور گلو بھگلوں کا شور بھی سنائی دے رہا تھا لیکن ابھی تک کوئی جنگلی جانور ان کے سامنے نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے انہیں کوئی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو اس لئے وہ اطمینان سے اوپر اُپر دیکھتے اپنی راستے پر چل رہے تھے۔ دسبل کا قاصد انہوں نے فقر یا سوا کھٹے میں ملے کر لیا اور آخر کار گاؤں کے داخلی راستے پر پہنچ کر سکھ کا سانس لیا۔

قیوم کا گاؤں پہنچ کر کئی گھنٹوں کے درمیان میں واقع تھا اس لئے وہ ہاتھ میں تھامی لکڑی کو دور پیچک کر اس گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں چلتے ہوئے ابھی اسے تھوڑی سی دیر ہوئی ہوئی کہ اس نے ایک بھیا تک اور انتہائی دھیمے سے گھبراہٹ بھرا ایک انسانی ہیمیر یا اس سے چندہ میں فٹ کے فاصلے پر کھڑا ان کی جانب ہی دیکھ رہا تھا اس کے جسم پر سیاہ بالوں نے اس کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔

قیوم اور زاہد کے مطلق میں جیسے ان کی چھین پھنس کر رہ گئی تھیں اور ان کے پاؤں نے جیسے زمین کو مٹی سے قابو کر لیا تھا اور وہ بھاگنے کے باوجود بھی بھاگ نہیں پارہے تھے۔ وہ غریب کچھ دیر تک کھڑی ان کو کھوڑتی رہی اس کی سرخ چندرا آکھیں بہت خوفناک لگ رہی تھیں اور پھر اپنے قدم اٹھاتے ان کی جانب بڑی قیوم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا سارا جسم مفلوج ہو گیا ہو اور زاہد نے اپنی منہج آکھوں سے اس خوفناک بلا کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ رہا تھا۔

قیوم کے ہاتھ سے سوٹ والا شاہر زمین پر گر گیا تھا اور بے خیالی میں اس کے ہاتھ سے زاہد کا ہاتھ بھی چھٹ گیا تھا۔ وہ بلا قدموں سے قدم و دم کی آواز نکالتی ان کی جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی اور پھر اتنی قریب آگئی کہ ان دونوں کو اس

کے گرم گرم سانس لینے کی آواز صاف سنائی دینے لگی اور پھر ایک جھٹکے سے اس بلانے اپنا بڑے بڑے ناخنوں والا ہاتھ آگے بڑھا لیا اور ایک مچھپے سے زاہد کو دیوبچ کر وہاں سے جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔

قیوم بت بنا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جب اسے ہوش آیا تو وہ غریب زاہد کو کھاکھا کر بہت دور جا چکی تھی۔ اور تھوڑی سی دیر میں کھٹے جنگل میں گم ہو چکی تھی۔

قیوم کو ہوش آتے ہی ایک جھٹکا لگا اور پھر جب اس کے شعور نے اسے اصل حقیقت کا احساس دلایا تو وہ چیخا چلاتا اپنے گھر کی طرف بھاگا۔

رات کے اندھیرے میں اس کے چہنچہ چلانے سے گاؤں میں ایک شور مچ گیا اور بہت سے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے اور پھر اس کے بتانے پر کہ کس طرح وہ غریب اس کے بیٹے کو اٹھا کر کھٹے جنگل میں بھاگ گئی ہے۔

گاؤں کے لوگ آپس میں چہ گوئیاں کر رہے تھے لیکن کسی میں بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ کوئی اس غریب کے پاس جا کر اس کے بیٹے کو واپس لا سکے اس لئے وہ صرف اُسوں ہی کر رہے تھے۔ قیوم کی بیوی کا رورور براہل تھا اور اس پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ قیوم کی اپنی حالت بہت خراب ہو رہی تھی شور سے گاؤں کا حکیم بھی وہاں پہنچ گیا تھا اور اس نے بھی اپنی کوشش سے زاہد کی مال کو ہوش دلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بار بار بیہوش ہو رہی تھی ظاہر ہے اس کا اکلوتا بیٹا اس سے جدا ہو گیا تھا اور نجانے وہ غریب اس کے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھی یہ سوچ سوچ کر بھی اسے بیہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

کچھ لوگ نمبر دار کو بلانے اس کے ڈیرے کی طرف دوڑ گئے تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گیا لیکن جب اس نے یہ سنا کہ یہ سب کارستانی کسی خوفناک غریب کی ہے تو وہ بھی کچھ پریشان ہو گیا۔ وہ قیوم کو دلاسا دینے لگا کہ اس وقت رات کے اندھیرے میں جنگل میں جانا اور اس غریب سے مقابلہ کرنا کسی طور پر مناسب نہیں ہے ہاں البتہ صبح کے وقت جنگل میں جا کر اسے ڈھونڈا جاسکتا ہے لیکن اس وقت تک وہ

غریب اس بچے کے ساتھ کیا کرتی ہے اس بات کی کوئی گمانی نہیں ہے۔

مسجد کے مولوی نے اسے اللہ کی مرضی سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی اور ممبر کرنے والوں کو کھانا اجرا اور ڈاب لکھا گیا ہے اس کے متعلق بتانے لگا۔ قیوم اپنے ہوش سے بیگانہ ہو گیا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ لوگ اسے کیا کہہ رہے ہیں اور کیا سمجھا رہے ہیں۔ اسے تو صرف اپنے پیارے لخت جگر کی فکر ہی ستائے جا رہی تھی جو وہ غریب اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھا کر لے گئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ لوگوں کا جھوم کم ہونے لگا اور لوگ اُسوں کرتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

نمبر دار نے بھی قیوم سے اجازت لی اور اپنے کارندوں کے ساتھ اپنے ڈیرے کی جانب چل دیا۔ اس نے دل ہی دل میں مع شہر جا کر پولیس سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ دوبارہ کسی قسم کا واقعہ رونما نہ ہو سکے۔ اس واقعہ سے گاؤں کے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ گاؤں کے لوگوں میں یہ خوف پختہ ہو جائے اور وہ ٹھیکوں میں جانے سے بھی گھبرانے لگیں۔ یہی سوچتا ہوا وہ اپنی حوصلی کے اندر داخل ہو گیا۔

دو تین روز تو بخیر خوشی گزر گئے اور اس دوران رشید کی بیوی کی طبیعت بحال رہی لیکن اس کے بعد ایک روز اچانک جب وہ گھر کے آگن میں بیٹھی سبزی بھاری تھی کہ ایک گوشت کا بڑا سا ٹکڑا اس کے سامنے آن گرا۔ گوشت سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے ابھی ابھی اسے کسی جانور کے جسم سے علیحدہ کیا ہو اور لا کر اس کے سامنے پھینک دیا ہو عجیب بات یہ تھی اس کے ساتھ اس جانور کے جسم کے بال تک کھال سمیت موجود تھے جن کی رنگت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی سرخ بالوں والے جانور کے جسم سے کاٹا گیا ہو۔ یوں اچانک اتنا بڑا گوشت کا ٹکڑا اپنے سامنے گرے کہ دیکھ کر پھر اس کے ہاتھ پر لگ گئی جس سے خون کی دھار نکل کر فرش پر گرنے لگی۔ اس وقت گھر میں اس کی ساس موجود نہیں تھی وہ اکیلی ہی گھر میں موجود تھی اس نے جلدی سے چھری ایک طرف پھینکی اور بھاگتی ہوئی ایک

طرف کو نئے میں رکھی رہائی سی جاوڑ کا کچھ حصہ بھاڑ کر اسے اپنے ہاتھ پر باندھ لیا لیکن خون مسلسل بہہ رہا تھا اور اب تو اسے ہاتھ میں تکلیف بھی ہونے لگی تھی یہ دیکھ کر اس نے گھر کے باہر کی جانب قدم بڑھائے تاکہ گلی میں پھیلنے کسی بچے کو حکیم کو بلانے کا کہہ سکے۔

وہ رشید کو بلا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے اس نے سوچا کہ پہلے حکیم کو بلا کر کوئی دوا یہ مرہم وغیرہ کروالے پھر شام کو رشید کو بتادے گی۔ یہ سوچ کر اس نے پہلے حکیم کو بلانے کا ہی ارادہ کیا۔ گلی میں جھانک کر دیکھا تو ایک بچہ کوئی سو دا سلف لینے گھر سے نکلا تھا کہ جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا اس نے اسے آواز دے کر جلدی سے حکیم کے مطب کی طرف دوڑا دیا اور تھوڑی سی دیر میں حکیم اپنا ہتھیلیا اٹھائے گھر کے دروازے پر موجود تھا۔

حکیم کی دستک سن کر اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور حکیم کو اندر آنے کا کہہ کر محسن میں رکھی چار پائی پر بیٹھ گئی حکیم بھی محسن سے ہوتا ہوا اس کے نزدیک پہنچا اور پھر اس کے بتانے پر اس نے ہاتھ پر بندھے کپڑے کو اتارنا چاہا خون جھنے کی وجہ سے کپڑا بھی کھال کے ساتھ چپک گیا تھا یہ دیکھ کر حکیم نے تھوڑا سا پانی ہاتھ میں لیکر پہلے کپڑے کو گیلیا کیا پھر آہستہ آہستہ کپڑے کو اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ سے جدا کرنے لگا۔ گیلیا ہونے کی وجہ سے کپڑا اب آسانی سے اتر گیا تھا خرم زیادہ گہرا نہیں تھا پھر نجانے کیوں اتنا خون نکلا۔

حکیم نے پہلے ایک صاف کپڑے سے اس کے زخم کو اچھی طرح صاف کیا پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک مرہم کی ڈبی نکالی جس میں سبزی مال رنگ کی کوئی مرہم نظر آ رہی تھی اس نے اس مرہم کو اپنی انگلی کی مدد سے اس کے زخم پر لپ کرنا شروع کر دیا۔ جب زخم اچھی طرح ڈھک گیا تو اس نے اسے یوں ہی کھلا چھوڑ کر رشید کی بیوی کو کچھ بتایا اور ایک دو بڑا پانی کے ساتھ کھانے کا کہہ کر واپس مطب کے لئے گھر سے نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی فیس یا دوا کے پیسے رشید سے ضرور دے دے گا اس لئے اس نے رشید کی بیوی سے پیسوں کا تقاضہ بھی نہیں کیا تھا۔

رشید کی بیوی اس دوران وہ گوشت کا ٹکڑا گھر کے

کوڑے دان کی نظر کر چکی تھی اور بے چینی سے رشید کے گھر آنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کی ساس پرڈوس میں کسی کیلی کے ہاں گئی ہوئی تھی اور شام کو در سے لوٹنے کا کہہ کر صبح ہی گھر سے نکل گئی تھی۔ اس لئے اب اسے رشید کے گھر آنے کا شدت سے انتظار تھا تا کہ اسے وہ گوشت کا ٹکڑا بھی دکھا سکے اور اپنے ہاتھ کا زخم بھی۔

شام کے سامنے پھیلنے ہی رشید حسب معمول گھر میں داخل ہوا اور دوڑ کر اس کی جانب لپکی۔ رشید اس کو اس طرح اپنی طرف بڑھنے دیکھ کر چونک گیا اور ہاتھ میں تمام فروٹ کا شاہر ایک طرف رکھ کر اپنی بیوی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور جیسے ہی اس کی نظر اس کے ذہنی ہاتھ پر پڑی تو اس نے فوراً اس سے اس کا سب پوچھا اور پھر اس کے بتلانے پر پہلے تو اسے یقین نہیں آیا لیکن جب اس نے کوڑے دان میں پڑا وہ گوشت کا ٹکڑا اسے دکھایا تب جا کے اسے یقین کرنا ہی پڑا۔

رشید اب کچھ سوچے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی کے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کا بار بار شک اپنی ماں کی طرف ہی جاتا تھا جسے وہ کئی بار گھر سے غائب پا چکا تھا لیکن چونکہ وہ اس کی ماں تھی اس لئے وہ ایسا سوچنا اور سر جھٹک دینا لیکن اب جس طرح کے یہ واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے اس سے وہ کچھ سوچنے لگا تھا کہ ہونہ ہو اس سارے واقعات کے پیچھے اس کی ماں کا ہاتھ ضرور ہے۔ وقت گزرتا گیا اور اب وہ غلط ہو گیا تھا خاص طور پر رات کو اکثر صبح کا چکر ضرور لگتا تھا کہ دیکھ سکے کہ اس کی ماں وہاں موجود ہے یا نہیں لیکن ایسا کرنے پر ہر بار وہ اسے صحن میں سویا ہوا پاتا اس لئے اب اس کا شک ختم ہو گیا تھا اور وہ اسے اتفاق سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

یہ رات کے تقریباً ایک بجے کا وقت ہوگا رشید اور اس کی بیوی اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ رشید کی ماں صحن میں مٹی ہوئی تھی۔ کمرے کا اکلوتا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ جب سے رشید کی بیوی کے ساتھ اس قسم کے واقعات ہونے لگے تھے اس وقت سے رشید نے اس کے کہنے پر کمرے میں بلب جتا

رہنے دیا تھا تا کہ رات کے وقت اگر وہ کسی حاجت سے اٹھتی ہے تو اندھیرے میں خوف محسوس نہ کرے۔

کمرے میں ان دونوں کے خزانے گونج رہے تھے اور اس وقت وہ دونوں گہری نیند کے حوالے لوٹ رہے تھے۔ کہ اچانک کمرے کا بلب ایک جھٹکے سے بجھ گیا اور کمرے میں گھب اندھیرا چھیل گیا۔ اس کے ساتھ ہی رشید کی بیوی کی چار پائی کے پاس ایک سایہ سا نمودار ہوا جس کی جسامت چھ سات فٹ کے قریب ضرور ہوگی اس کا ہلکا سا ہولنا اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہا تھا وہ پہلا آہستہ سے رشید کی بیوی کے جسم پر جھکا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلبہ بوجھ لیا اس کے ہاتھوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

اس اچانک افتاد پر رشید کی بیوی نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن لگتا تھا جیسے کسی شکنجے میں اس کی گردن جکھن گئی ہو اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اپنا دفاع نہیں کر پائی اور اس کے گلے سے یوں خراہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کسی بکرے کو زخم کرتے وقت نکلتی ہیں۔ اس نے تھوڑی دیر تک ہاتھ پاؤں چلائے پھر ایک دم اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔

یکام ہوتے ہی وہ ہولنا چانک کمرے سے غائب ہو گیا اور بلب بھی دوبارہ جل اٹھا۔ اس ساری کارروائی میں رشید بدستور سویا ہوا تھا اور اسے اس بات کا احساس تک نہیں ہوا کہ اس کی دنیا لٹ چکی ہے اور اس کی پیاری بیوی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

صبح حسب معمول اٹھنے ہی جیسے رشید نے اپنی بیوی کو اٹھنے کے لئے آواز دی تو اس کے بار بار بلانے پر بھی جب اس کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا تو اسے تشویش ہونے لگی اور وہ فوراً اٹھ کر جیسے ہی اس کی چار پائی کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ اس کی بیوی کی اکثری ہوئی لاش بستر پر موجود تھی اور اس کا جسم اکڑا ہوا تھا بجانے کس وقت وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ چیخا ہوا صحن میں سوئی اپنی ماں کے پاس پہنچا اور جلدی سے اسے سمجھوڑنے لگا پہلے تو اس کی ماں کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔

لیکن جب حقیقت کا اسے پتہ چلا تو وہ بھی دوڑتی

ہوئی اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور پھر ساری بات اس کی سمجھ میں خود بخود آ گئی وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور شاہد پایا کا شکر یہ ادا کر رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے مریکوں نے اس کی بہو سے اس کا بیچا چھڑوا دیا تھا۔ وہ بیوی کی حالت دیکھ کر مین کرنے لگی اور ان لوگوں کے شور اور رونے کی وجہ سے آس پرڈوس سے بھی لوگ گھر میں آ گئے اور پھر حقیقت جان کر کشت بدندان رہ گئے کہ رشید کی بیوی بظاہر کسی تکلیف میں بھی نہیں تھی اور اس کی ہلکی بھی وہ پتلی تھی لیکن اس کی اس طرح اچانک موت نے سب کو پریشان کر دیا تھا اس کی لاش اکثر ضرور گئی تھی۔

لیکن سب سے حیرت والی یہ بات تھی کہ اس کی گردن پر کسی قسم کے نشان نہیں تھے لگتا ہی نہیں تھا کہ کسی نے بڑے زور سے اس کا گلبہ دبوچا ہو اس لئے سب اس کی موت کو دل کا دورہ ہی سمجھ رہے تھے۔ رشید اپنی بیوی کے غم میں غر حال ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی موت کا ذمہ دار ان واقعات کو قرار دے رہا تھا جو کچھ روز پہلے اس کے ساتھ رونما ہو رہے تھے۔ دیگر رسومات سے فارغ ہو کر اس کی بیوی کو دفنایا گیا۔ اور دوسری طرف رشید کی ماں اپنی بہو سے بیچھا چھٹ جانے پر بہت خوش تھی لیکن اپنی اس خوشی کا اظہار کر کے وہ کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے خاموشی سے ادھر ادھر کام کرتی پھر رہی تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ بھی کسی بے گناہ کا خون رائیگاں نہیں جانے دیتا ایک روز گھر سے باہر کسی کام کے سلسلے میں وہ کئی تو شام کا اندھیرا ہونے کی وجہ سے گلی میں موجود کسی زہریلے سانپ نے اسے ڈس لیا اور وہ ایک منٹ میں وہیں تڑپ تڑپ کر موت کا شکار ہو گئی۔ قدرت نے اس سے اس کی بہو کے دل کا بدلہ لے لیا تھا۔

دلچسپ ستم اور اس کے ساتھیوں کا کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد قافلے میں کچھ بوڑھے لوگوں نے مشورہ کر کے دیگر افراد کو جلد از جلد گاؤں کی جانب بڑھنے کی تاکید کی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ لوگ مزید وہاں رک کر کسی اور مصیبت کا شکار ہوں جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں دلچسپ ستم اور اس کے ساتھ گئے چند نوجوانوں کی طاقت پر

بھی مجبور تھا کہ وہ اس بچے کو ضرور واپس لے کر آئیں گے۔ لیکن اس بچے کی ماں اپنے بچے کو لئے بغیر گاؤں جانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی لیکن بھڑکوں کے سمجھانے کے باوجود کہ صرف بچے کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں کی زندگی داؤ پر نہ لگائے اس لئے وہ جمع خاطر رکھ کر بحیثیت ضرور اس کے بچے کو اس خوفناک بلا کے بچے سے چھڑا لائے گا۔ یہ سن کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ سفر کرنے پر مجبور ہو گئی۔

یہ فیصلہ کرتے ہی قافلہ ایک بار پھر اپنی منزل پر چل پڑا اس دوران پریت کو کئی جگہیں میں کچھ نوجوان آکر بیٹھ گئے تھے تا کہ اس کو قحط دے سکیں۔ پریت کو بھی دلچسپ ستم کے لئے پریشان تھی کہ وہ انہوں نے اتنی دیر بجائے کیوں لگا دی تھی۔ لیکن اسے دلچسپ ستم کی صلاحیتوں پر مکمل مجبور تھا اس لئے وہ مطمئن تھی۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ سب اپنے گاؤں پہنچ گئے اور وہاں پہنچ کر سب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گاؤں کے لوگوں کو جب ان کی زبانی سب حقیقت کا پتہ چلا تو وہ سب بھی بہت پریشان ہو گئے۔ بچے کی ماں کی حالت کچھ سنبھل گئی تھی لیکن وہ پریشان ضرور تھی۔

گاؤں کے دیگر افراد اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے اور پریت کو کس کے سوال والوں نے لے جا کر حوٹلی کے ایک کمرے میں بیٹھا دیا۔ جلد عروسی والے کمرے کو بڑی نفاست اور خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ جس سے اس گھر کے کینوں کے ذوق کا اظہار ہوتا تھا۔ گھر کی عورتیں اس کے گرد گھیر اڑائے بیٹھی تھیں۔ پریت کو رات میں مٹی بیٹھی تھی۔

عورتیں وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ کسی قسم کا مذاق وغیرہ نہیں کر رہی تھیں کیونکہ انہیں تمام واقعات کا علم ہو چکا تھا اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس وقت پریت کو کاشوہر چند نوجوانوں کے ساتھ اس خوفناک دیران مندر میں موجود تھا اور اب تک ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ سب کس حال میں ہیں۔

☆.....☆.....☆

ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں دھونی بجائے ایک ساہوکار لپٹی پالتی مارے بیٹھا تھا اس کے سامنے زمرس

کے پھولوں کا ایک ڈھیر دکھائی دے رہا تھا جس میں رکھے دو ناریل اور کالے بکرے کا کٹا ہوا سر رکھا تھا سر سے لگتا جیسے کسی نے تازہ تازہ اسے کسی بکرے کے ہڑ سے علیحدہ کیا ہو۔ سادھو وقفے وقفے سے اپنے سامنے رکے مٹی رنگ کے ایک پاؤڑ کو چٹکی سے اٹھاتا اور اپنے سامنے چلنے والے لالہ میں پھینک دیتا جس سے آگ ایک دم بھڑکتی اور پھر معمول پر آجاتی یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی پاؤڑ نہ بلکہ کوئی بیڑوں ہو گونے کے بائیں جانب چٹائی پر ایک بچہ جس کے ہاتھ اور دونوں پاؤں کو مضبوطی کے ساتھ ایک بان کی رسی سے باندھ دیا گیا تھا لیکن ہوا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں یہ زاہد جسے اس عفریت نے جینٹ کی غرض سے اس خوفناک سادھو کے حوالے کر دیا تھا۔

اس عفریت کے اس کام کے عوض اس سادھو نے اسے ویران مندر کے تہ خانے میں رکھے ہوئے صندوق میں موجود کئے ہوئے انسانی سروں میں سے دوسرے وقفے میں دیئے تھے جسے وہ عفریت اس کے سامنے ہی کھڑے کھڑے چٹ کر گیا تھا اس طرح کے کئے ہوئے سر اس کے مرغوب غذا تھے۔

سادھو اس سے جب بھی اپنی مرضی کا کام لینا تو اس کام کو ٹھیک طرح سے سر انجام دینے پر وہ خوش ہو کر اس کو انسانی سر دیتا تھا۔ سادھو اپنے ایک جاپ کے لئے انسانی جسموں کا استعمال کر رہا تھا جن کے ہڑ وہ ایک مخصوص جگہ دفن دیتا تھا اور ان کے ہڑ سے الگ کئے ہوئے سر تہ خانے کے اندر رکھے لوہے کے صندوق میں رکھ دیتا جو اس نے اس انسانی بھیڑیے سے کام لے کر اسے معاوضے کے طور پر دیئے ہوتے تھے۔

گزشتہ کچھ دنوں سے سادھو ایک خاص قسم کا جاپ "لونچہ جاری" کے نام کا کر رہا تھا جس میں اسے منتر کے دوران ایک چھوٹے انسانی بچے کی جینٹ دینے کے لئے کہا گیا تھا اور اس کام کے لئے اس نے اپنے ایک بیرونی کام سونا جو انسانی بھیڑیے کے روپ میں اس کے سامنے تھا۔

سادھو نے اسے یہ ذمہ داری سونپی اور خود جاپ مکمل

کرنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ ایک دوبارہ ناکامیوں کے بعد وہ عفریت اپنے مقصد میں کام ہو گیا اور ایک انسانی بچہ لا کر گذشتہ روز اس کے حوالے کر دیا اور اسی سلسلے میں وہ آج اس ویران مندر کے ایک ہال میں موجود تھا۔ وہ مندر میں کوئی منتر پڑھ رہا تھا اور پھر اچانک اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن بند آنکھوں کے باوجود وہ مٹی والا سفوف برابر اپنے سامنے رکھی آگ میں پھینکتا جا رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے اسے سب دکھائی دے رہا ہو۔

ابھی اسے جاپ کرتے توڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اس کے سامنے والی دیوار میں درمیان سے بھٹی اور اس کے اندر سے ایک چندر کی شکل کا جانور اچھل کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اس کا انداز ایسے تھا جیسے کوئی کینگر وائی بچھلی دو ہاتھوں پر کھڑا ہو لیکن اس کے ہاتھ سرے سے ہی نہیں تھے بلکہ اس کی صرف دو ٹانگیں ہی تھیں اور اس کا پتلہ تھوڑی جیسا منہ کچھ زیادہ ہی بیزارت تھا اس کے جسم پر بھورے رنگ کے بال تھے جو بیل بیل سے لٹے پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے کبھی نہ پایا تک نہ ہو غرض اس کو ایک نظر دیکھنے سے گھن آتی تھی۔

وہ سادھو کے سامنے کھڑا یوں جھول رہا تھا جیسے کسی بھی وقت زمین پر گر جائے گا۔ سادھو اس دوران اپنی آنکھیں کھول چکا تھا اور اس وقت اسے عجیب و غریب جانور کو ہی مغمور رہا تھا جو نشہ پئے شخص کی طرح کھڑا ڈانواں ڈول رہا تھا۔

سادھو نے اپنے سامنے زمین پر رکھا ایک ترشول اٹھایا اور چلنا ہوا سیدھا اس عجیب الخفقت جانور کے پاس پہنچ کر ترشول اس کے بھولتے پچکتے پیٹ میں کھسکا دیا۔ ترشول اس کے پیٹ میں گھس گیا اور خون کا ایک فوارہ اس کے پیٹ سے اٹل پڑا یہ دیکھ کر سادھو نے جلدی سے اس کے اٹلتے خون کو ایک بڑے سے پیالے میں اکٹھا کیا اور لے جا کر اس چٹائی پر سونے ہوئے بچے کے قریب لا کر رکھ دیا۔ وہ عجیب الخفقت جانور زمین پر ٹیڑھے میٹر سے انداز میں گرا ہوا تھا یا وہ خون ہونہ جانے سے اس کی موت واقع ہو گئی تھی لیکن سادھو نے اس کی طرف

دھیان دینا بھی گوارہ نہ کیا اور دوبارہ اپنی پھلی والی جگہ پر آ کر دوبارہ جاپ شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک کچھ پڑھنے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر دوبارہ اس بچے کے پاس گیا اور اس کے نزدیک رکے خون کے پیالے میں اپنا ہاتھ ڈال کر خون سے تر کرنا اور اس بچے کی پیشانی پر لٹے لگتا اور پھر توڑی دیر میں اس بچے کا تمام جسم اس خون سے تر ہو گیا یہ دیکھ کر سادھو نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ پیالے میں ابھی بھی کچھ خون بچ گیا تھا لیکن اس کی رگت سیاہی مائل ہونا شروع ہو گئی تھی اور پر ایک پتلی سے تہہ جتنی جاری تھی اس کام سے فارغ ہو کر سادھو نے دوبارہ آگ کے قریب جا کر اسے بچھایا اور پھر بچے کو اپنے کندھے پر اٹھا کر اس ہال سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

دلچیت سنگھ اور اس کے ساتھی زمین پر بیہوشی کی کیفیت میں پڑے تھے۔ جب سے سادھو نے انہیں یہاں لا کر چٹا تھا اس وقت سے وہ سب بیہوش ہی تھے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ بہت دیر ہو گئی یوں لگتا تھا جیسے سادھو انہیں وہاں پھینک کر بھول گیا ہو۔ جس جگہ انہیں پھینکا گیا تھا یہ وہ تہہ خانہ نہیں تھا جہاں یہ پہلی بار گئے تھے۔ بلکہ یہ اس ویران مندر کا کوئی دوسرا تہہ خانہ تھا جہاں اس وقت یہ سب اپنے انجام سے خبر بیہوشی کی کیفیت میں لینے تھے۔

کافی وقت گزر گیا اور پھر دلچیت سنگھ کو آہستہ آہستہ ہوش آنے لگا۔ اپنی ادھ مٹلی آنکھوں سے اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا تو قریب ہی اپنے دوسرے چار ساتھیوں کو بھی موجود پایا۔ اور پھر آہستہ آہستہ اسے پوری طرح ہوش آ گیا اور اس کے لاشور نے اسے تمام واقعات یاد دلادیے کہ کس طرح وہ ایک بچے کو ڈھونڈتے ہوئے اس ویران مندر میں داخل ہوئے تھے اور کس طرح ایک تہہ خانے سے نکلے ہوئے وہ ایک سادھو سے ٹکرائے تھے جس نے اپنے ہاتھ میں اسی بچے کی گردن پکڑ رکھی تھی۔

یہ سوچتے ہی اس نے یکدم اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا کیونکہ اس کے ہاتھ اور دونوں پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ پوری طرح اٹھ نہیں سکا اس کے

دیکھا بھی تک بیہوش ہی پڑے ہوئے تھے وہ خود چونکہ ایک مضبوط اعصاب کا مالک تھا اس لئے اپنے ساتھیوں کی نسبت جلد ہوش میں آ گیا۔ اس کی طرح اس کے دوسرے ساتھیوں کے بھی ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر اس نے سرگوشی کے انداز میں اپنے ساتھیوں کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ پھر اس کی توڑی سے کوشش سے اس کے چاروں ساتھی بھی ہوش میں آ گئے اور اندر کے ماحول کو دیکھ کر کاپٹنے لگے لیکن دلچیت کو دیکھ کر انہیں کچھ حوصلہ ہوا۔

دلچیت کچھ دیر تک سوچنے کے بعد اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوا اور اسے کچھ سمجھا کر اپنی پیٹھ کو اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف کر دیا۔ دوسری طرف کے ساتھی نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ اس کی پیٹھ کے ساتھ ملا دیئے اس طرح دونوں کے ہاتھ آپس میں کھڑے گئے اور پھر دلچیت کے سمجھانے پر اس کے ساتھی نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کی مدد سے دلچیت سنگھ کے بندھے ہاتھوں پر گلی گرہ کھولنے کی کوشش کی۔ گرہ بہت مضبوطی سے باندھی گئی تھی۔ توڑی ہی کوشش سے دلچیت سنگھ کے بندھے ہاتھ آزاد ہو گئے اس نے جلدی سے رسیاں ایک طرف پھینک کر اپنے دیگر ساتھیوں کو بھی جلدی جلدی آزاد کرانا شروع کر دیا۔

کچھ دیر میں وہ سب اس معیشت سے پیچھا چھڑا چکے تھے اور اب کالا کٹر عمل سوچنے لگے۔ اس کارروائی میں کوئی بھی بندہ اس طرف نہیں آیا تھا غالباً کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں ہوا ہوگا کہ اس طرح بندھے ہونے کے باوجود وہ خود کو آزاد کر والیں گے۔ دلچیت اپنے ساتھیوں کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر تہہ خانے کی اوپر جانے والی میڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

وہ اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے بات کی بہت فکر تھی کہ وہ اس بچے کی ماں کو کیا جواب دے گا جس کا کٹا ہوا سر اب بھی اس کے خیالوں میں گھوم رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی دلہن پریت کو اور ان لوگوں کی بھی فکر تھی جنہیں وہ مندر کے باہر چھوڑ آیا تھا اور شاید وہ کب سے مندر کے باہر کھڑے ان

جسم کی زنجیریں توڑ کر دوڑتا ہوا جائے اور سامنے بچ کر
لپٹے اس معصوم بچے کو کچا چبا جائے لیکن اسے ساتھ
ساتھ اس بات کا بھی ڈر تھا کہ اس کا آقا چاہے تو اس کی
ڈراسی غلطی سے اسے جلا کر بھسم کر سکتا تھا وہ اس کی
حکایتوں سے بخوبی واقف تھا اس لئے سوائے بچے و تاب
کھانے کے وہ بے بس تھا۔

تہہ خانے کے نزدیک پہنچ کر دلچسپ نگہ نے اپنے
بچے آنے والے ساتھیوں کی طرف رکنے کا اشارہ کیا اور
خاموشی سے کان لگا کر نیچے تہہ خانے سے کچھ سننے کی کوشش
کرنے لگا اس کے اس انداز سے اس کے ساتھی بھی چونک
کر تہہ خانے سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگے اور پھر جلدی
انہیں یوں لگا جیسے کوئی انسان کچھ مانوس زبان میں کچھ
پڑھنے میں مصروف ہو اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے
پڑھنے کی بازگشت لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی وہ کیا پڑھ رہا تھا
ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر وہاں رک کر انہوں نے آپس میں کوئی
بات چیت کی ابھی وہ اس بات کا تہیہ کر رہے تھے کہ آیا
نیچے تہہ خانے میں جا کر دیکھا جائے کہ وہ کون شخص ہے اور
اس وقت وہاں کیا کر رہا ہے کہ بچے سے ایک بچے کے
چپنے کی آواز سنائی دی یوں لگا جیسے کوئی بے درو انسان کسی
معصوم بچے کے جسم کے اعضاء کو کسی کند چھری سے کاٹنے
کی کوشش کر رہا ہو۔

بچے کے چپنے کی آواز سننے ہی وہ یکدم واپس ہلنے
کیونکہ انہوں نے آپس میں مشورہ کرتے ہوئے یہی فیصلہ
کیا تھا کہ انہیں تہہ خانے میں جا کر دیکھنے کی بجائے یہاں
سے باہر نکلنے کی بارے میں سوچنا چاہئے کیونکہ وہ اپنی جانوں
کو کسی اور مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

لیکن پھر اچانک تہہ خانے سے آئی کسی معصوم بچے
کی دردناک چیخ نے ان کے قدم روک لئے اور انہوں نے
رک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے نیچے تہہ خانے
میں جانے کا ارادہ کر لیا لیکن اس کے پرمٹل کرنے سے پہلے
انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کوئی ایسی چیز ساتھ لے
جانے کے لئے اس کی تلاش کرنا چاہی جسے وہ اپنے بچاؤ کے

لئے استعمال کر سکیں اور جلد ہی انہیں قریب ہی ایک لوہے
کی تقریباً دو انچ موٹی سلاح کوٹنے میں پڑی دکھائی دی۔
سلاح کا ایک سرا جھنجی کی مانند چپٹا تھا جیسے اس
سے کوئی مٹی وغیرہ نکودنے کے لئے کام میں لاتے ہوں اس
وقت انہیں یہی قیمت لگا اور دلچسپ نگہ نے اسے جلدی
سے اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور پھر ایک دوسرے کے پیچھے چلنے
ہوئے نیچے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیئے۔

تقریباً سات آٹھ سیڑھیاں اترنے کے بعد ان کی
آنکھوں نے جو منظر دکھا وہ ان کے ہوش اڑا دینے کے لئے
کافی تھا ان کے سامنے ایک بچہ جس کا ایک بازو ایک ایسے
انسان کے ہاتھ میں قاصر کی پیٹھ ان کی طرف تھی اور اس
کے ہاتھ میں ایک تیز رفتار دالی چھری تھی جس سے تازہ تازہ
لہو پیک رہا تھا۔

سامنے بچہ لیٹا ہوا ایک بچہ تڑپ رہا تھا اور اس کے
منہ سے تکلیف کی شدت سے جھپٹیں نکل رہی تھیں جو تہہ
خانے کے اندر گون رہی تھیں اس دہشت ناک منظر کو دیکھ
کر انہوں نے واپس ہٹا گئے یہی حالت تھی لیکن پھر اس
کو بزدلی سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے دلچسپ
انہیں روہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ
سیڑھیاں اترتا ہوا تیزی سے آخری سیڑھی اترتا ہوا تیر کی
طرح گیا اور سامنے کھڑے شخص کی چپٹے میں اپنی پوری
طاقت سے ہاتھ میں پکڑی لوہے کی سلاح مھسیو دی۔

سادھو جو بے خیالی میں کھڑا اپنے کے دوسرے بازو
پر چھری سے وار کرنے ہی والا تھا کہ ایک دم جھٹکا کھاکر زمین
پر گر اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ویران مندر
میں کوئی یوں اچانک آکر اس کی پیٹھ میں کوئی چیز مھسیو دے
گا لیکن اب ایسا ہوا چکا تھا اور وہ زمین پر گرا تڑپ رہا تھا۔

اور زمین پر گرے ہی دلچسپ نے اسے شیطانی کا
موقع ہی نہیں دیا اور پے درپے وار کر کے اس کا قصہ تمام
کر دیا۔

اس ساری کارروائی میں تہہ خانے میں بندھا انسانی
بھیش یا برابر شور مچاتا رہا وہ شاید اسے تہہ خانے کی سیڑھیاں
اترے دیکھ چکا تھا لیکن سادھو جو پہلے ہی اس کے شور مچانے

کو نظر انداز کر چکا تھا اس لئے وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ اتنا شور
کیوں مچا رہا ہے۔ شاید وہ انسانی بھیش یا سادھو کو یہ بتانا چاہ رہا
تھا کہ اس وقت تہہ خانے میں ان کے علاوہ کوئی اور بھی آچکا
ہے لیکن سادھو اپنی طاقت کے نشے میں پاگل ہو چکا تھا اور
یہی پاگل پن اس کی موت کی وجہ بن گیا۔

سادھو کے مرتے ہی دلچسپ کے دیگر ساتھی بھی
جلدی سے سیڑھیاں اترتے نیچے کھینچ گئے۔ سادھو کو دو بارہ
چھری لہراتے دیکھ کر کچھ خوف سے بے ہوش ہو چکا تھا لیکن اس
کے کہنے ہوئے بازو سے ابھی بھی خون برس رہا تھا۔ خون زیادہ
بہہ جا۔ لے کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور
نیچے زمین پر ملوث یوں پھیلا ہوا تھا جیسے کسی نے وہاں ابھی
تازہ تازہ رونا کوئی کھرا کاٹا ہو۔

ٹھوٹاک اور ویران مندر کے تہہ خانے میں ایک
انسان کے لٹن کا تالاب بہت زراعتنا منظر پیش کر رہا تھا جو
انہیں انہوں کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا لیکن اس
ویران مندر میں داخل ہونے اور مختلف قسم کے عجیب و غریب
واقعات سے نمبر آنا کامیابی کی وجہ سے اس وقت وہ لوگ
بے خوف ہو گئے تھے انہوں نے نیچے کی سائیں چپک
لیں تو وہ چل رہی تھیں اور اس کی حالت سے یوں لگ رہا
تھا کہ جیسے وہ کسی بھی سمت سے موت کو گلے لگا لگا۔

لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہلدی سے اسے
اٹھا کر تہہ خانے سے باہر لا کر لیٹا اور پھر ایک کمرے میں
جا کر ایک کھڑکی پر لگے پردے کو کھینچ کر اٹھا اور ہلدی سے
اسے اس بچے کے کٹے ہوئے بازو والے حصے پر ابھی طرح
لیٹ دیا۔ ان کے تہہ خانے سے لگنے تک وہ انسانی بھیش یا
چپٹا چلاتا رہا لیکن انہوں نے اس قسم کرنے کی بجائے اس
بچے کو بجائے کو زیادہ تر تیز دی اس لئے انہوں نے اس انسانی
بھیش پرے کو اسے کے حال پر چھوڑا اور اس بچے کو لے کر تہہ
خانے سے نکل آئے تھے۔

بچے کو ایک نوجوان نے اپنے کندھے پر اٹھالیا ہوا تھا
اور پھر وہ جلدی سے کمرے سے نکل کر باہر جانے کا راستہ
ڈھونڈنے لگے۔ دو تین کمرے اور برآمدوں سے ہو کر انہیں
وہی دالان دکھائی دیا جہاں وہ پہلی بار مندر کی سیڑھیاں چڑھ کر

آئے تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے سکھ کا سانس لیا اور تیزی سے
بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے اس وقت شام کے سائے پھیل
چکے تھے۔ مندر میں وہ جس قسم کے حالات سے دوچار رہے
ان حالات نے انہیں اس بات تک سے عاری کر دیا تھا کہ
انہیں یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ دن کے کونے حصے میں اس وقت
موجود ہیں اور اس بات کا اندازہ انہیں مندر سے باہر نکلنے کے
بعد ہی ہوا کہ چاروں طرف اندھیرا پھیلنے لگا تھا انہوں نے
مندر سے باہر نکلنے ہی سب سے پہلے بچے کو زمین پر لٹا کر
دوبارہ اس کی سائیں چپک کیں تو یہ دیکھ کر انہیں تشویش
ہونے لگی کہ اس کی سائیں پہلے سے بھی کہیں زیادہ کم ہونے
لگ گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر ان پر مایوسی طاری ہوئی اور وہ بے بسی
سے ہاتھ ملنے لگے کیونکہ انہیں نہیں لگ رہا تھا کہ وہ رات کے
اس اندھیرے میں کس طرح اس معصوم بچے کو کسی حکیم وغیرہ
کے پاس لے جا کر اس کا علاج کروا سکیں گے ابھی وہ لوگ
بے بسی سے کھڑے کچھ سوچ رہے تھے کہ بچے نے زور زور
سے جھٹکے لینے شروع کر دیے اور پھر دو تین منٹ اسی کیفیت
رہنے کے بعد ایک زوردار جھٹکے سے اس کا جسم زمین سے تھوڑا
لوہر اٹھا اور پھر ایک جھٹکے سے دوبارہ زمین پر گرے ہی اس کی
گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

دلچسپ نگہ اور اس کی ساتھی اس کی اس دردناک
موت کو اپنی جانتی آنکھوں سے دیکھتے رہے اور بے بسی سے
اپنے ہونٹ چباتے رہے لیکن قسمت نے ان کا ساتھ
نہیں دیا اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس معصوم بچے نے
موت کو گلے لگا لیا۔ انہوں نے رات کا اندھیرا پھیلنے کی وجہ
سے بچے کو وہیں دفن کرنے کی بجائے اپنے ساتھ ہی لے
جانے میں بہتری بھی اور بچھے دل کے ساتھ اسے ایک
نوجوان نے دوبارہ اپنے کندھے پر اٹھالیا اور اندازے سے
ایک طرف چلنے لگے۔

آہستہ آہستہ اس خوفناک اور منحوس مندر کی عمارت
ان سے دور ہوتی گئی اور وہ کافی دیر تک چلتے رہے اس دوران
انہوں نے تھوڑا سا جنگل کے اندر سے بھی فاصلہ طے کیا اور
یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اس دوران ان کے ساتھ کوئی غیر
معمولی واقعہ پیش نہیں آیا اور راستے میں کوئی جنگلی جانور نظر

اب گرمی بھی ہوگئی ٹھنڈی...

تبت

پریکٹ بیسٹ

پاؤڈر



تبت پریکٹ بیسٹ پاؤڈر

اس سے نجات اور ٹھنڈک کا خوشگوار احساس

تقریباً دو میل تک پیدل چلنے کے بعد آخر کار اپنے گاؤں کی سرحد پر پہنچ گئے۔ دن نکل آیا تھا اور گاؤں لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگئی تھی جیسے ہی انہوں نے گاؤں میں قدم رکھا وہاں کھینٹے بچوں نے انہیں دیکھتے ہی شور مچا شروع کر دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں لوگ اکٹھے ہو گئے اور اڑتے اڑتے یہ خبر کہ دلچسپیت اور اس کے ساتھی گاؤں پہنچ گئے ہیں یہ سن کر دلچسپیت سنگھ کے گھر والے بھی دوڑتے گھروں سے نکلے اور راستے میں انہیں گھیر لیا۔ وہ لوگ ایک جہوم میں اپنے اپنے گھروں میں پہنچ گئے۔ گھر والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پریت کو خوشی دیکھنے والی تھی وہ دلچسپیت سنگھ کی خبریت کے لئے رات دن دعائیں مانگ رہی تھی اور آج اس کی دعائیں اٹلے آئی تھیں اور اس کا دلچسپیت آج زندہ سلامت اس کے سامنے موجود تھا۔

تھکان اتارنے کے بعد شام کے وقت دلچسپیت سنگھ کی حویلی میں گاؤں کے لوگوں کو ان لوگوں کے زندہ سلامت واپس آ جانے کی وجہ سے ایک شاندار دعوت پر مدعو کیا گیا تھا جس میں تقریباً گاؤں کے تمام افراد شامل تھے۔ پر تکلف دعوت کے بعد دلچسپیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے انہیں ویران مندر میں پہنچے اور اس بچے کی دردناک موت کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو ہر شخص خوف سے کانپنے لگا۔ بچے کی ماں اپنے بچے کی دردناک موت کا سن کر برداشت نہ کر سکی اور بیہوش ہو گئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اور بچے کی موت کا سن کر وہاں موجود شخص اٹھ بار تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کے زندہ سلامت بچ کر آ جانے پر کسی قدر خوش بھی تھے اور برہمان کی بہاری کی تعریف بھی کر رہے تھے۔

دلچسپیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے گاؤں کے افراد کو اس انسانی بھیڑے کے متعلق اس لئے نہیں بتایا کہ کہیں وہ لوگ خوفزدہ ہو کر اپنے کھیتوں میں جانا نہ چھوڑ دیں لیکن ان سب کو سختی سے یہ تاکید ضرور کر دی تھی کہ بھول کر بھی کسی کوئی اس ویران مندر کی طرف جانے کی کوشش نہ کریں۔



آیا جس سے انہیں کوئی خطرہ محسوس ہوا وہ نہ جانے وہ کتنی دیر تک پونہ پیدل چلتے رہے اور پھر کافی دیر تک پیدل چلنے کے بعد جس کا سپیدہ نمودار ہوا تو ہر چیز واضح ہو گئی۔ جنگل بہت پیچھے رہ گیا تھا اور دور دور بہت دور ایک راستہ جاتا دکھائی دیا اور غور سے دیکھنے پر ان کے چہروں پر اطمینان پھیل گیا کہ یہ وہی راستہ تھا جس پر وہ پریت کو رکھنے گاؤں سے واپس لوٹتے ہوئے سفر کر کے آئے تھے اور اس ویران مندر کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے تھے۔

پھر ایک جگہ جمناڑیوں کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے آہستہ سے اس بچے کی لاش کو زمین پر رکھا اور اپنے ہاتھوں سے ہی ایک گڑھا نمودار کی کوشش کرنے لگے زمین نرم ہونے کی وجہ سے انہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی پھر بچے کی لاش کو اسی کپڑے میں لپیٹ کر اس گڑھے میں لٹا دیا اور پھر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ گڑھا زیادہ گہرا نہ کھودنے کی وجہ سے انہیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔

تقریباً ڈیڑھ میل تک چلنے کے بعد اب انہیں دور آبادی کے آثار نظر آنے لگے یہ دیکھ کر انہوں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور کچھ ہی دیر میں وہ وہاں پہنچ گئے جہاں بہت سے مکان بنے ہوئے تھے ایک راگبیر سے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ بچہ پور گاؤں ہے۔ اسی راگبیر سے رام گڑھ گاؤں جانے کے لئے سیدھا راستہ معلوم کرنے کے بعد وہ اسی طرف روانہ ہو گئے۔

مندر سے نکلنے کے بعد انہیں اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ باراتیوں نے ان کا انتظار کرنے کے بعد وہاں سے بڑا ڈاکھایا ہوگا اور سیدھے گاؤں ہی گئے ہوں گے۔ اس لئے انہیں ان کی طرف سے کوئی ٹکرائیسی۔

مسلسل پیدل چلنے اور دیر تا بھر آرام نہ کرنے کی وجہ سے اب ان پر فاقہ طاری ہونے لگی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے گھروں کو پہنچنے اور دلچسپیت سنگھ کو اپنی دہان پریت کو رکھنے کی خوشی بھی جو نہ جانے اس وقت کس حال میں ہوگی۔ اپنے ایک ساتھی کی موت کا بھی انہیں بے انتہا افسوس تھا جو اس کا لے لے کا شکار ہو گیا تھا۔